ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک انقلاب انگیز کتاب، جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔

قیمت صہ، مجلد ہجے

اسلام کا نظامِ مساجد

نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ہجے مجلد للعہ

اسلام کا نظامِ عفّت و عِصمت

عفت و عصمت اور اُن کے لوازم پر بصیرت افروز بحث اور نظامِ عفت کی اسلامی خصوصیتوں کی دل پذیر تشریح، لائق مطالعہ کتاب، قیمت للعہ، مجلد صہ۔

اسلام کا زرعی نظام

اسلام کے نظامِ زراعت پر ایک جامع کتاب، زمین کی تقسیم کے اصول اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ان کی تفصیل

قیمت للعہ، مجلد صہ

اِسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

(قیمت تے، مجلد للعہ)

قرآن اور تعمیرِ سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

قیمت صہ مجلد تے،

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں اصول اخلاق، فلسفہ اخلاق اور انواع اخلاق کی دل پذیر تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے اسلام کے مجموعہ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں پر ثابت ہوتا ہے۔ نظرثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن۔

قیمت تے، مجلد ہعہ

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:- ہماری زبان میں ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی، اس میں حدیثوں کا عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی تشریحی اور تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا۔ اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک بصیرت افروز مقدمہ۔

جلد اوّل قیمت عنے، مجلد عـ۱۲ـہ، جلد دوم قیمت لعہ، مجلد لعـ۹ـہ

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں، کلام ربانی کا قطعی منشار معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اس موضوع پر ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔

قیمت عہ، مجلد ہے،

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں کی دل پذیر تشریح وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب، نہایت نفیس۔ جدید ایڈیشن۔

قیمت تے، مجلد للعہ

مینجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۳۸ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۷ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

دار العلوم دیوبند ایشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے۔ اسی درس گاہ کی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ آج ہند و پاک کے مسلمانوں میں شعائر دینی کا جو احترام اور رسوم شریعت کے ساتھ جو گہرا لگاؤ اور تعلق ہے وہ خود عرب ممالک کے مسلمانوں تک میں نہیں ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اس درس گاہ کا سالانہ بجٹ دو لاکھ روپیہ سالانہ ہوتا تھا اور اُس وقت غیر منقسم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی امداد اُس کو حاصل تھی۔ ملک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی زمینداریاں قائم تھیں۔ حیدر آباد اور بھوپال ایسی بڑی ریاستیں تھیں جو دار العلوم کی برابر مستقل طور پر مدد کرتی رہتی تھیں لیکن تقسیم کے بعد زمین آسمان ہی بدل گئے۔ ایک طرف تو یہ ہوا کہ مختلف شعبہ جات میں غیر معمولی ترقیات اور اُن کے کاموں میں پھیلاؤ اور پھر گرانی کے باعث دار العلوم کا سالانہ بجٹ دو لاکھ سے ترقی کر کے پانچ لاکھ تک پہنچ گیا اور دوسری جانب ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے جس کے نتیجہ میں ہند کے مسلمانوں کے عام اقتصادی حالات ابتر ہو گئے۔ زمینداری کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح ہزاروں کی خیر خیرات کرنے والوں کو خود روٹیوں کے لالے پڑ گئے ریاستیں قایم ہی نہیں۔ حکومت کی امداد قبول کرنا دار العلوم کی وضع کے ہمیشہ خلاف رہا ہے اس لئے گورنمنٹ گرانٹ یا ایڈ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ ان صبر آزما حالات میں ہمارے قومی اور ملی کاموں کے بقا کی شکل اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ عام مسلمان ان اداروں کے وجود کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کریں اور اُن کی مالی امداد کے لئے جو کچھ وہ کر سکتے ہوں کریں۔ آج کل مسلمانوں کے تمام ہی اداروں کا حال نہایت زبوں ہے جس کا اندازہ اُن اپیلوں سے ہو سکتا ہے جو اخبارات میں مختلف اداروں اور جماعتوں کی طرف سے شائع ہوتی رہتی ہیں اور جن کے سفراء اور نمائندے کلکتہ اور بمبئی اور دوسرے شہروں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اس سلسلہ میں دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کی طرف سے بھی ایک پرزور اپیل گذشتہ دنوں اخبارات میں چھپی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی یہ دیرینہ عظیم الشان دینی درس گاہ بھی آج کل سخت قسم کی مالی دشواریوں سے دوچار ہے۔ اسلامیانِ ہند کا فرض ہے کہ وہ وقت کی اس نزاکت کو محسوس کریں اور دار العلوم کو اُس کی مالی مشکلات سے نجات دلانے کے لئے

صرف ہنگامی اور وقتی طور پر نہیں بلکہ اُس کی مستقل امداد کا کوئی ایسا انتظام کردیں کہ دارالعلوم کو پھر آئے دن کے یہ خطرات پیش نہ آئیں۔

اس سلسلہ میں ہماری تجویز یہ ہے کہ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی باقاعدہ تنظیم کر کے ان کو بھی اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مستقل ماہانہ امداد کے طور پر دارالعلوم کو بھیجیں۔ اس طرح اگر دس ہزار ابنائے قدیم بھی ایک ایک روپیہ ماہوار دینے پر رضامند ہو گئے تو دس ہزار روپیہ ماہانہ کی مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ ہمارا یہ اندازہ کم سے کم ہے۔ کیوں کہ عام اندازہ کے مطابق ابنائے قدیم کی تعداد دس ہزار سے کہیں زیادہ ہوگی۔

مدارسِ عربیہ کے نصاب میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جارہی ہے لیکن افسوس ہے کہ شدید ضرورت اور وقت کے اہم مطالبہ کے باوجود اس طرف کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بیدار مغز ذمہ دار اصحاب کو بھی اس کا احساس تھا لیکن دلوں میں اطمینان نہ ہونے کے باعث اس احساس نے عملی جامہ نہ پہنا لیکن خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم کی موجودہ مجلس شوریٰ کو اس طرف توجہ ہوئی اور اس نے متعدد حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی ہے جو جدید علمی اور دینی تقاضوں کے پیش نظر ایک نیا نصاب مرتب کر کے پیش کرے گی اور مجلس شوریٰ غور کر کے اس کی نسبت کوئی آخری فیصلہ کرے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجلس شوریٰ نے یہ کمیٹی مقرر کر کے بڑی بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے جس پر وہ ہر انصاف پسند کی طرف سے مبارک باد کی مستحق ہے لیکن اس معاملہ میں سب سے بڑا اہم اور کٹھن فرض نصاب کمیٹی کا ہے۔ اس کو بڑی وسعت نظر کے ساتھ یہ طے کرنا ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند کی کل مدت تعلیم کتنی ہونی چاہیئے؟ اس مدت کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر حصہ میں کن کن مضامین کی تعلیم دی جائے۔ پھر اُس کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ کون کون سے مضامین لازمی ہوں گے اور کون سے اختیاری؟ اور اُن مضامین کی تعلیم کا طریقہ کیا ہوگا۔

آج یورپ اور امریکہ کے محققین نے اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو کاوشیں کی ہیں انھوں نے اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، اسلامی فقہ اور اسلامی علم الکلام ان میں سے ہر چیز کے متعلق بحث و استدلال اور غور و فکر کے طریقہ کو بدل دیا ہے اور اُس میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ جب تک کوئی عالم اس

طرز سے آشنا نہیں ہوگا وہ علمی طور پر اسلام کی خدمت ہرگز نہیں کر سکتا، تاریخ جس کی حقیقت پہلے
نیم فسانہ کی تھی آج ایک نہایت مربوط اور منضبط سائنس ہے۔ جغرافیہ پھیل کر اب اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ
متعدد علوم و فنون کی تعلیم کے بغیر اُس کا عالم بننا مشکل ہے۔ ادب کا دائرہ پہلے بھی اس قدر وسیع تھا کہ اٹھارہ
بیس علوم و فنون کے بغیر کوئی شخص ادیب نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن آج کل تو اُس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ
سائنس کے سوا ہر چیز اُس کے اندر شامل ہے۔ پھر تحقیق کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ کل تک جو باتیں فلاسفہ
کے نزدیک مسلمات میں سے تھیں آج اُن کی بے حقیقتی اظہر من الشمس ہے" غرض کہ علوم و فنون کی اس نئی دنیا
میں ہمارے علما اُس وقت تک اسلام کو ایک زندہ۔ متحرک جامع اور کامل دین کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتے
جب تک کہ وہ خود عہدِ جدید کی علمی زبان میں گفتگو کرنے کے اہل نہیں ہوں گے۔ عیسائیت اس زبان میں
گفتگو کرنے سے عاجز رہی تو آج اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کا رشتہ زندگی سے منقطع ہو گیا اور وہ محض ایک
رسمی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو امام رازی۔ امام غزالی۔ ابن رشد اور شاہ ولی اللہ
جیسے ترجمان نہ ملتے تو اُس کی حیثیت بھی وہی ہو جاتی جو عیسائیت کی ہے۔ اسی بنا پر ہم جب کبھی اصلاحِ
نصاب کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تو اُس سے مقصد ہرگز مولانا کو مسٹر بنانا نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ ہوتا
ہے کہ علماء اُسی شرابِ کہنہ کو جامِ نو میں پیش کرنے کے اہل ہوں اور وہ آج کل کی علمی مجلسوں میں شریک
ہو کر اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔

ندوۃ المصنفین نے حسبِ معمول و روایت ۵۶ء میں بھی متعدد اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سب سے
اہم اور نہایت جہتم بالشان کتاب ترجمان السنہ جلد سوئم ہے جن حضرات کو اس کتاب کی پہلی دونوں
جلدوں کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر ادارہ صرف یہی ایک کتاب شائع کرتا تب بھی وہ کہہ
سکتا تھا "شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم"

اُس کتاب کے مقدس و متبرک اور مفید و معتبر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جس میں عہدِ حاضر کے
بلند پایہ عالم اور محدث مولانا بدر عالم نے صحیح احادیثِ نبوی کو جمع کیا ہو اور اُن سے متعلق مبسوط و مفصل فقہی
اور کلامی بحثیں کی ہوں۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ اس اہم کام کی ترتیب بھی خاص آستانۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ
والسلام پر سرانجام پائی ہو۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

حضرت عمر کے سرکاری خطوط

۳۔ محاذِ مصر

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی۔ دہلی یونیورسٹی)

(۱۶)

۱۸۱۔ عمرو بن عاص کے نام

عراق و شام کی فتوحات کے بعد جب مرکزی خزانہ میں علاوہ خمس کے خراج اور جزیہ کی لگی بندھی رقمیں جمع ہونے لگیں تو حضرت عمر نے ۲۰ھ میں سالانہ وظائف کا ادارہ قائم کیا جس میں تمام مسلم مردوں، عورتوں حتیٰ کہ شیرخوار بچوں تک کے نام لکھے جاتے تھے اور سب کے لئے مختلف شرحوں سے وظیفے مقرر ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ وظیفہ رسول اللہ کی بیگمات کو دیا گیا، ان کے بعد اہلِ بیت کو اور پھر بدر کے مجاہدوں کو۔ وظیفہ مقرر کرنے میں حضرت عمر نے رسول اللہ سے قربت اور اسلامی خدمات کو ملحوظ رکھا تھا۔ ذیل کا مراسلہ عمرو بن عاص اور کچھ دیگر صحابہ کے وظائف سے متعلق ہے:۔

"تمھارے ساتھ جو صحابہ ایسے ہوں جنھوں نے "درخت کے نیچے" رسول اللہ سے بیعت کی تھی ان کا وظیفہ ۲۰۰ دینار (تقریباً ہزار روپئے) سالانہ مقرر کرو۔ خود تمھارے لئے بھی یہی رقم مقرر کی جاتی ہے چوں کہ تم گورنر ہو اور یہی رقم خارجہ بن حذافہ کے لئے ان کی ممتاز شجاعت اور عثمان بن ابی العاص کے

کے لئے ان کی مہمان نوازی کے صلہ میں " تجویز کرتا ہوں " (یزید بن ابی حبیب فتوح مصر ص۱۶۵)

خط کا دوسرا نسخہ :- (اسناد دونوں کی ایک ہے)

۱۸۲- " جن صحابہ نے درخت کے نیچے بیعت کی ہو ان کا وظیفہ دو سو دینار سالانہ مقرر کرو اور اپنے لئے بھی اسی قدر چوں کہ تم گورنر ہو، اور خارجہ بن حذافہ کو ان کی غیر معمولی شجاعت کے لئے " ممتاز وظیفہ " دو، یعنی دو سو سے زیادہ۔ (فتوح البلدان مصر ص۲۱۴)

۱۸۳- دریائے نیل کے نام

مصر میں دستور تھا کہ ہر سال ایک کنواری لڑکی کو عمدہ کپڑے اور زیور پہنا کر نیل میں ڈالا جاتا تھا، مصریوں کے عقیدہ کے مطابق ایسا کرنے سے نیل کا پانی اونچا ہو کر کھیتوں میں پہنچنے لگتا تھا۔ بابلیون کی فتح کے بعد جب وسطی اور زیریں مصر اسلامی قلمرو میں آیا اور خراج کا انتظام مسلمانوں نے سنبھالا تو زمینداروں نے عمرو بن عاص سے عرض کیا کہ دریائے نیل کی ایک ریت ہے جس کے زیر اثر اس کا پانی ہر سال بڑھتا ہے۔ جب ماہ جون کی بارہ تاریخ ہوتی ہے تو ہم ایک کنواری لڑکی کو بہترین لباس اور زیور پہنا کر اُس میں ڈال دیتے ہیں، ایسا کرنے سے دریا کا پانی اونچا ہو جاتا ہے اور ہماری اراضی سیراب ہونے لگتی ہے۔ گورنر نے کہا کہ اسلامی حکومت میں ایسی باطل رسموں کو زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ زمینداروں نے تین ماہ انتظار کیا لیکن نیل کا پانی نہ بڑھا اور کاشتکار جلاوطنی کی تیاری کرنے لگے۔ اب گورنر مصر گھبرائے اور حضرت عمر کو مطلع کیا تو انھوں نے مذکورہ رسم بند کرنے کو سراہا اور نیل کے نام ایک رقعہ بھیجا جس میں لکھا تھا:-

" واضح ہو کہ اگر تو اپنے اختیار سے بہتا ہے تو رُک جا، اور اگر اللہ واحد و قہار تجھے رواں کئے ہے تو ہم اس سے ملتجی ہیں کہ تجھے رواں کردے "

رقعہ نیل میں ڈال دیا گیا، دوسرے دن پانی سولہ ہاتھ اُٹھ گیا اور زمینیں سیراب ہونے لگیں۔ (ابن لہیعہ۔ فتوح مصر صفحہ ۱۵۰-۱۵۱ وکنز العمال ۲۳۰/۶۔

خط کا دوسرا نسخہ:۔

۱۸۴۔"اگر تجھے کسی نے پیدا کیا ہے تو تیرے بس میں نہ فائدہ پہنچانا ہے نہ نقصان، اور اگر تو اپنے ارادہ اور اختیار سے رواں ہے تو رُک جا ہمیں تیری ضرورت نہیں، اور اگر تو خدا کی دی ہوئی قوت سے بہ رہا ہے تو پہلے کی طرح فراوانی سے بہہ" (فتوح الشام واقدی، (ذکر فتوح مصر) ۴۰/۲)

۱۸۵۔ واقدی کی فتوح مصر میں ہے کہ مذکورہ بالا خط کے ساتھ حضرت عمر نے عمرو بن عاص کو یہ ہدایت نامہ بھیجا:۔

السلام علیک، میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اُس کے نبی پر درود بھیجتا ہوں۔ میرا یہ خط پڑھ کر خدا کے دشمنوں کو جہاں جہاں وہ ہوں ٹھکانے لگا دو، اُن کے ساتھ کوئی رعایت یا نرمی نہ برتو۔

(۲) رعیت کے معاملات سے ذاتی دلچسپی لو اور جہاں تک ہو سکے ان کے ساتھ انصاف اور رواداری سے پیش آؤ۔

(۳) لوگوں کی خطائیں معاف کرو، خدا تمھاری خطائیں معاف کرے گا۔

(۴) جو قوانین اور معمولات ملک میں رائج ہوں اُنھیں بحال رکھو۔

(۵) رعایا کے ٹیکس کی شرح اور تفصیل خراج کے رجسٹروں میں درج کرو۔

(۶) انصاف کے ذریعہ امن و عافیت کو فروغ دو۔

(۷) حکومت و اقتدار آنی جانی ہے، جو چیز باقی رہے گی وہ اچھی شہرت

ہے یا ان مٹ رسوائی " (واقدی مصر ۲/۴۰)

۱۸۶۔ عمرو بن عاص کے نام

قدیم ترین مورخوں میں ابن عبد الحکم مصری، متوسطین میں مقریزی اور متاخرین میں سیوطی نے اس خط کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کا سیاق و سباق کسی نے نہیں بتایا، بس اس قدر کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ جب خراج مصر کی وصولیابی میں دیر ہوئی تو حضرت عمر نے یہ خط لکھا۔ خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ شکایت تاخیر خراج کی نہیں بلکہ تقلیلِ خراج کی ہے، نیز یہ کہ اس موضوع پر خلیفہ اور گورنر میں اس خط سے پہلے بھی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ خط میں مصر کے قدیم بادشاہوں یعنی فراعنہ کی زراعت اور نظام آبپاشی سے بڑھی ہوئی دلچسپی کی طرف بھی اشارہ ہے اور یہ تصریح بھی موجود ہے کہ عمرو بن عاص نے جو خراج وصول کیا وہ اس خراج کے آدھے سے بھی کم ہے جو ان سے پہلے مقوقس نے وصول کیا تھا۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ فراعنہ بڑے زراعت دوست بادشاہ تھے اور انھوں نے آب پاشی کا بڑا وسیع اور باضابطہ نظام قائم کیا تھا۔ سارے ملک کی اراضی تک نہریں اور بہے نکال کر نیل کا پانی پہنچا دیا تھا، نہروں، پلوں، پانی کے دروازوں اور نہروں کی صفائی اور کھدائی کے لئے ہر وقت ایک بڑا عملہ تیار رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی خاندان کے بعض بادشاہوں نے ظلم و ستم کے بغیر دس کروڑ دینار سے زیادہ خراج وصول کیا اور اکثر نے نو ساڑھے نو کروڑ۔ (خطط مقریزی، مصر ۱۹۱۱ء، ۱/۳۱۶ - ۳۲۰) مقوقس رومی کے زمانہ میں خراج کی رقم کم ہوتے ہوتے دو کروڑ رہ گئی تھی اور مصر جب اسلامی حکومت میں آیا تو پہلے سال خراج صرف ایک کروڑ وصول ہوا۔ اس غیر معمولی کمی کے حضرت عمر شاکی ہیں۔ مقوقس نے عمرو بن عاص سے مصر کے سارے قبطیوں کی طرف سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی رو سے ہر قبطی پر دو دینار سالانہ جزیہ لگایا گیا تھا اور جن لوگوں کے پاس زمین تھی اور زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہی تھے، ان کے لئے لگان کی کوئی مقررہ شرح نہیں رکھی گئی بلکہ یہ طے ہوا کہ ان کی کھیتی کی حیثیت کے مطابق لگان لیا جائے گا، تیسری شرط یہ تھی کہ جب مسلمان فوجیں کسی علاقہ

میں اُتریں گی تو اُن کے کھانے کا بندوبست وہاں کے قبطیوں کو کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک یا زیادہ مسلمان مسافر کسی بستی سے گذریں گے تو تین دن تک ان کا کھانا پینا بستی والوں کے ذمہ ہوگا (فتوح مصر ص۱۵۳)

مصر کی فتح کے ساتھ سیاسی حکومت تو ضرور مسلمانوں کے ہاتھ آئی پر ملک کا سارا انتظام قبطی افسروں اور اہل کاروں کے ہاتھ میں رہا، عربوں کو نہ تو سول سروس کی فرصت تھی اور نہ اس کا تجربہ۔ میرا خیال ہے کہ جزیہ کی رقم اور ضیافت کی شرط سے قبطیوں کو زیر باری کا احساس تھا، اور وہ ناخوش تھے، اس لئے ان کے ہم مذہب اہل کار لگان کا اندازہ کرنے میں نرمی سے کام لیتے تھے، اور خود اہل کار بھی رموز لگان سے عربوں کی ناواقفیت دیکھ کر ناجائز فائدے اٹھاتے ہوں گے۔ بہرحال لگان کی رقم کم ہوگئی اور کوشش کے باوجود عمرو بن عاص کے عہد میں ایک کروڑ بیس لاکھ اور ان کے جانشین عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے عہد میں ایک کروڑ چالیس لاکھ سے زیادہ نہ ہو سکی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے عمرو بن عاص کو سلام علیک۔ میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میں نے مصر اور اس کے خراج کے بارے میں غور کیا، تمہارا ملک خوب لمبا چوڑا اور زرخیز ہے۔ خدا نے اس کے باشندوں کو کیا خشکی اور کیا سمندر میں ہر قسم کے سامان، شجاعت اور قوت سے نوازا ہے۔ یہاں فرعون بادشاہوں نے حکومت کی اور تعجب ہے کہ مغرور و حق فراموش ہونے کے باوصف انھوں نے زراعت کی ترقی کے لئے بہت عمدہ کام کئے، لیکن مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اب مصر سے اس خراج کا آدھا بھی وصول نہیں ہو رہا ہے جو پہلے ہوتا تھا، حالاں کہ ملک میں کسی قسم کا قحط نہیں ہے۔ خراج کے بارے میں میں نے تم سے کافی خط و کتابت کی اور سمجھا تھا کہ میرے پاس پورا پورا بھیجا جائے گا کیوں کہ مجھے امید تھی کہ تم عقل کے ناخن لوگے اور صحیح روش اختیار کروگے لیکن تم ایسے بہانے ہی تراشتے رہے

جو کسی طرح سمجھ میں آنے والے نہیں۔ میں اس خراج سے کم قبول نہیں کرسکتا جو اسلامی فتح سے پہلے ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ میرے خط میں ایسی کون سی بات تھی جس نے تم کو بھڑکایا اور دُکھ پہنچایا۔ اگر تم کارگذار ہو اور دیانت سے اپنا فرض انجام دو اور پھر اپنی برارت اور بے گناہی کی کوشش کرو تو بلاشبہ ایسا کرنا مفید ہے، لیکن اگر تم نالائق اور خائن ہو تو تمھاری برارت اور پاکبازی کی کوشش بے سود ہے۔ پچھلے سال میں نے خراج کے موضوع پر تم سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اس امید میں طرح دیتا رہا کہ تم خود سنبھل جاؤ گے اور پورا پورا خراج بھیجو گے، پر ایسا نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنے سے جو چیز مانع ہے وہ تمھارے (بے ایمان) اہل کار اور تمھاری ان کے ساتھ ملی بھگت اور تمھارے بہانے ہیں۔ تم ان لوگوں کے ملجا اور ماویٰ بنے ہوئے ہو۔ لیکن یاد رہے، خدا کے حکم سے میرے پاس تمھارے مرض کی دوا موجود ہے۔ بس ابو عبداللہ، اگر تم سے صحیح رقم وصول کرلی جائے تو کبیدہ خاطر نہ ہونا۔ مصر کی گائے خشک نہیں خوب دودھ دینے والی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اس کے سامنے تمھارے بار بار کے بہانے درخورِ اعتنا نہیں ہو سکتے۔ والسلام۔

(فتوح مصر صفحہ ۱۵۸-۱۵۹ و مقریزی مصر ۱۹۱۱ء ۱/۳۲۷)

اس سخت مراسلہ سے عمرو بن عاص کو دکھ ہوا، ان کی دیانت اور خودداری کو ایسی چوٹ لگی کہ وہ بلبلا گئے۔ انھوں نے جواب میں لکھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیر المؤمنین کو عمرو بن عاص کی طرف سے، سلام علیک۔ میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ اس میں آپ نے تاخیرِ خراج کی شکایت کی ہے (خط کے الفاظ میں تاخیر کی نہیں کمی کی شکایت ہے) اور فرعون

بادشاہوں کے عمدہ آثار کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو خراج وہ وصول کرسکے
میں نہ کرسکا اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ میری جان کی قسم، یہ بالکل صحیح
ہے کہ اُن کے زمانہ میں خراج زیادہ وصول ہوتا تھا اور زیرِ کاشت زمین اور
پیداوار زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مغرور اور حق فراموش ہونے کے
باوجود وہ ہماری نسبت زمین کی آبادکاری سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ آپ نے
لکھا ہے کہ میں نے گائے کا دودھ چوس لیا ہے جس سے وہ خشک ہوگئی ہے
(خط کے الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا) آپ میرے اوپر خوب برسے ہیں
اور دل کھول کر لعن طعن کیا ہے، اس کی وجہ بدگمانی اور حقائق سے لاعلمی ہے
(یا چھپی کدورت ہے۔ کنز العمال ۳/۱۵۰) آپ کے لئے مناسب تھا کہ آپ
قلم کو ملوث نہ کرتے اور اپنی تحریر دلیل اور قاعدہ کی حد میں رکھتے۔ میں رسول اللہ
اور ابوبکر کے عہدوں پر فائز رہا اور خدا کا شکر ہے ہمیشہ دیانت سے کام لیا،
اپنے ائمہ کا احترام کیا اور ان کے سامنے اپنی مسئولیت کا پورا لحاظ رکھا۔
اُس وقت ہر شخص میری ایمانداری کا معترف تھا اور میری بات سنی جاتی تھی۔
خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ ناجائز آمدنی، خیانت یا رشوت سے آلودہ ہوں،
آپ یہ عہدہ واپس لے لیجئے، خدا نے مجھے ہر قسم کی ناجائز آمدنی حتی کہ اس
کی خواہش تک سے محفوظ رکھا ہے۔ آپ کا خط پاکر جس میں آپ نے مجھے
خوب بے آبرو کیا ہے، مجھے اس عہدہ سے کوئی رغبت نہیں رہی اور میں
چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سبکدوش کردیں۔ ابن خطاب! میری توہین کی جائے
تو میری خود داری کو جوش آجاتا ہے۔ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر
گرفت ہوسکے، جتنی آپ نے میری سرزنش کی یثرب کے کسی یہودی کی بھی نہ کرتے۔
خدا آپ کو اور مجھے معاف کرے، مجھے آپ کی بہت سی باتیں معلوم ہیں جن

جو کسی طرح سمجھ میں آنے والے نہیں۔ میں اس خراج سے کم قبول نہیں کرسکتا جو اسلامی فتح سے پہلے ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ میرے خط میں ایسی کون سی بات تھی جس نے تم کو بھڑکایا اور دکھ پہنچایا۔ اگر تم کارگزار ہو اور دیانت سے اپنا فرض انجام دو اور پھر اپنی برارت اور بے گناہی کی کوشش کرو تو بلاشبہ ایسا کرنا مفید ہے، لیکن اگر تم نالائق اور خائن ہو تو تمھاری برارت اور پاکبازی کی کوشش بے سود ہے۔ پچھلے سال میں نے خراج کے موضوع پر تم سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اس امید میں طرح دیتا رہا کہ تم خود سنبھل جاؤگے اور پورا پورا خراج بھیجوگے، پر ایسا نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنے سے جو چیز مانع ہے وہ تمھارے (بے ایمان) اہل کار اور تمھاری ان کے ساتھ ملی بھگت اور تمھارے بہانے ہیں۔ تم ان لوگوں کے ملجا اور ماویٰ بنے ہوئے ہو۔ لیکن یاد رہے، خدا کے حکم سے میرے پاس تمھارے مرض کی دوا موجود ہے، بس ابوعبداللہ، اگر تم سے صحیح رقم وصول کرلی جائے تو کبیدہ خاطر نہ ہونا۔ مصر کی گائے خشک نہیں خوب دودھ دینے والی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اس کے سامنے تمھارے بار بار کے بہانے درخورِ اعتبار نہیں ہوسکتے۔ والسلام۔

(فتوح مصر ص ۱۵۸-۱۵۹ و مقریزی مصر ۱۹۱۱ء ۱/۳۲۷)

اس سخت مراسلہ سے عمرو بن عاص کو دکھ ہوا، ان کی دیانت اور خودداری کو ایسی چوٹ لگی کہ وہ بلبلا گئے۔ انھوں نے جواب میں لکھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیر المؤمنین کو عمرو بن عاص کی طرف سے، سلام علیک۔ میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ اس میں آپ نے تاخیرِ خراج کی شکایت کی ہے (خط کے الفاظ میں تاخیر کی نہیں کمی کی شکایت ہے) اور فرعون

بادشاہوں کے عمدہ آثار کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو خراج وہ وصول کرسکے میں نہ کرسکا اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ میری جان کی قسم، یہ بالکل صحیح ہے کہ اُن کے زمانہ میں خراج زیادہ وصول ہوتا تھا اور زیرِ کاشت زمین اور پیداوار زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مغرور اور حق فراموش ہونے کے باوجود وہ ہماری نسبت زمین کی آبادکاری سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں نے گائے کا دودھ چوس لیا ہے جس سے وہ خشک ہوگئی ہے (خط کے الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا) آپ میرے اوپر خوب برسے ہیں اور دل کھول کر لعن طعن کیا ہے، اس کی وجہ بدگمانی اور حقائق سے لاعلمی ہے (یا چھپی کدورت ہے۔ کنز العمال ۳/۱۵۰) آپ کے لئے مناسب تھا کہ آپ قلم کو ملوّث نہ کرتے اور اپنی تحریر دلیل اور قاعدہ کی حد میں رکھتے۔ میں رسول اللہ اور ابوبکر کے عہدوں پر فائز رہا اور خدا کا شکر ہے ہمیشہ دیانت سے کام لیا، اپنے ائمہ کا احترام کیا اور ان کے سامنے اپنی مسئولیت کا پورا لحاظ رکھا۔ اُس وقت ہر شخص میری ایمانداری کا معترف تھا اور میری بات سنی جاتی تھی۔ خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ ناجائز آمدنی، خیانت یا رشوت سے آلودہ ہوں، آپ یہ عہدہ واپس لے لیجئے، خدا نے مجھے ہر قسم کی ناجائز آمدنی حتیٰ کہ اس کی خواہش تک سے محفوظ رکھا ہے۔ آپ کا خط پاکر جس میں آپ نے مجھے خوب بے آبرو کیا ہے، مجھے اس عہدہ سے کوئی رغبت نہیں رہی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سبکدوش کردیں۔ ابن خطاب! میری توہین کی جائے تو میری خود داری کو جوش آجاتا ہے۔ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر گرفت ہوسکے، جتنی آپ نے میری سرزنش کی یثرب کے کسی یہودی کی بھی نہ کرتے۔ خدا آپ کو اور مجھے معاف کرے، مجھے آپ کی بہت سی باتیں معلوم ہیں جن

کا ذکر کر کے آپ کو آزردہ کر سکتا ہوں، پر ایسا نہیں کروں گا، کیوں کہ خدا نے آپ کو بہت اونچا رتبہ عطا کیا ہے۔" (فتوح مصر صفحہ ۱۵۹-۱۶۰ ومقریزی ۱/۱۳۶)

۱۸۷- عمرِو بن عاص کے نام

عمرو بن عاص کے اس جواب کو بلحاظ مضمون تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

(الف) خراج کی کمی کی توجیہ۔

(ب) اپنی دیانت و براءت کی دلیلیں۔

(ج) خلیفہ کی ترش باتوں کا شکوہ اور گورنری سے سبکدوش ہونے کی خواہش۔ تاخیر خراج کے موضوع پر خط میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ فتوح مصر میں ہے کہ گورنر کا مذکورہ بالا جواب پا کر حضرت عمر نے لکھا:-

"عمر بن خطاب کی طرف سے عمرِو بن عاص کو سلام علیک۔ اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لایق نہیں۔ حیرت ہے کہ میں نے تمھیں تاخیرِ خراج کے سلسلہ میں اتنے خط لکھے اور تم ہر خط کے جواب میں بے تکی باتیں ہی کرتے رہے، تم کو خوب معلوم ہے کہ میں وہی خراج قبول کر سکتا ہوں جو پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک ہو۔ میں نے تمھیں مصر اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم اور تمھارا خاندان اس کو جائداد سمجھ کر کھاؤ اڑاؤ، بلکہ اس امید پر بھیجا تھا کہ تم خراج بڑھاؤ گے اور اپنی لیاقت کے جوہر دکھاؤ گے۔ میرا خط پاتے ہی خراج بھیج دو، یہ مسلمانوں کی آمدنی ہے اور جیسا کہ تم جانتے ہو یہاں کے لوگ سخت تنگ حال ہیں، والسلام۔ (فتوح مصر صفحہ ۱۶۰ ومقریزی صفحہ ۱۲۶)

اس میں شک نہیں، کہ اس خط کا لہجہ پہلے خط کی طرح تیز و ترش نہیں، پھر بھی الزام اس میں وہی ہے جو پہلے میں تھا، اور یہ تعریض بھی ہے کہ عمرو بن عاص نے خراج کے روپئے میں غبن کیا ہے۔

پہلا خط جیسا کہ ہم نے پڑھا گورنر کو بہت شاق گزرا تھا اور انھوں نے تردیدِ الزام میں دلیل اور ترشی دونوں سے کام لیا تھا اور عہدہ سے الگ ہونے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی، لیکن اس خط میں اُسی الزام کو مکرر پا کر نہ تو ان کے خون میں جوش آیا، نہ اُن کی خودداری مشتعل ہوئی، اور نہ انھوں نے استعفا دیا، بلکہ توہین پی لی اور الزام ہضم کر گئے۔ دونوں خطوں کا یہ فرق ہمارے راوی اور مورخ بتانے سے قاصر ہیں۔

جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، عمر بن خطاب کو عمرو بن عاص کی طرف سے سلام علیک، میں اُس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ امیر المومنین آپ کا خط موصول ہوا جس میں آپ نے تاخیرِ خراج کی شکایت کی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ میں سیدھے راستہ سے ہٹ گیا ہوں اور راستبازی کی طرف سے میں نے مُنہ موڑ لیا ہے۔ بخدا میں نے کوئی بدعنوانی نہیں کی ہے۔ تاخیرِ خراج کی وجہ یہ ہے کہ زمینداروں نے کھیت پکنے تک مجھ سے مہلت مانگی تھی، میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مہلت دے دوں، زمینداروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ اُس سخت اور بھونڈی کارروائی سے بہتر ہے جس کا انجام یہ ہو کہ وہ اپنا سامان جس کے بغیر گذارہ نہیں کر سکتے بیچنے پر مجبور ہوں، والسلام (فتوح مصر صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۱)

۱۸۸- عمرو بن عاص کے نام

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پاس اونٹ، بکریاں، نوکر اور غلام ہو گئے ہیں جو گورنری سے پہلے نہ تھے اور نہ تم کو تنخواہ میں دئے گئے ہیں، پھر یہ دولت تمھارے پاس کہاں سے آئی؟ میرے پاس ایسے مہاجر تھے جو تم سے کہیں بہتر

تھے اور جن کو گورنری کا عہدہ دے سکتا تھا، لیکن میں نے تمہاری کارکردگی کے بھروسہ پر تم کو یہ عہدہ دیا۔ جب یہ عہدہ تمہارے اپنے فائدہ کے لئے اور ہمارے مفاد کے خلاف ہو تو پھر تم کو مہاجرین پر کیوں ترجیح دی جائے؟ بہت جلد لکھو کہ یہ دولت تمہارے پاس کس طرح آئی"۔ (شرح نہج البلاغۃ مصر ۳/ ۱۰۴ و ازالۃ الخفاء ۲/ ۱۸۲)

عمرو بن عاص کا جواب

امیر المؤمنین آپ نے میرے تمول کے بارے میں جو لکھا ہے۔ صحیح ہے۔ یہاں آئے دن لڑائیاں ہوتی ہیں جس سے غنیمت کے حصے برابر ملتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں چیزیں بھی ارزاں ہیں جس سے میرا خرچ کم ہے۔ بچے ہوئے روپیہ سے میں نے یہ مال جمع کر لیا ہے۔ اگر آپ کی خیانت درست ہوتی تب بھی میں ایسا نہ کرتا، کیوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ امیر المؤمنین بدگمانی نہ کیجئے، ہماری خاندانی شرافت و حیثیت ایسی ہے کہ ہم آپ کے عہدہ کے اعزاز سے بے نیاز ہیں۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ میرے پاس ایسے تم سے بہتر مہاجرین اولین تھے تو امیر المؤمنین آپ نے اُن کو عہدہ کیوں نہیں دیا، میں نے اس کے لئے کب آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا؟ والسلام" (شرح نہج البلاغۃ مصر ۳/ ۱۰۴)

۱۸۹۔ عمرو بن عاص کے نام

"گورنر کی صفائی، صاف بیانی اور کھری باتوں سے خلیفہ کو تشفی نہیں ہوئی بلکہ کچھ غبارِ خاطر بڑھ گیا، اپنے مخبروں سے گورنر کی ثروت کی رپورٹ سن کر اور اس سے پہلے خراج کی کمی دیکھ کر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ عمرو نامناسب ذرائع سے روپیہ کماتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک معتمد مصر

بھیجا اور عمرو کی آدھی دولت ضبط کرالی:-

"تمھاری صفائی اور بنی سنوری باتوں نے میرے اوپر مطلق اثر نہیں کیا، جماعتِ امرار سے تم سرکاری روپیہ کھاتے ہو اور بہانے تراشتے ہو، سرکاری روپیہ کھانا اور آگ کھانا برابر ہے، رسوائی کا داغ کبھی تمھارے نام سے نہیں چھوٹے گا۔ میں محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں تاکہ تمھاری آدھی دولت بحقِ بیت المال ضبط کرے۔ والسلام" (شرح نہج البلاغۃ ۳/۴/۱۰۴ و ازالۃ الخفار ۲/۱۸۲)

خط کا دوسرا نسخہ :-

۱۹۰- بد دیانت حاکموں کی حرکتوں کا حال مجھے خوب معلوم ہے۔ تمھارا خط اُس شخص کا ساخط ہے جس کو مواخذۂ حق نے بوکھلا دیا ہو، تمھاری دیانت میری نظر میں مجروح ہے محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں تاکہ تمھاری آدھی دولت بحقِ بیت المال ضبط کرلے، اپنی سارے مال و متاع اس کو نوٹ کرادو اور وہ جو مانگے دے دو، اِس مواخذہ میں اگر اس سے سختی ہو تو درگذر کرنا، یہ بات بالکل کھل چکی ہے کہ تم نے سرکاری روپیہ میں ناجائز تصرف کیا ہے"۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۲۲۶، فتوح مصر ابن عبد الحکم میں بھی اس موضوع پر ایک مختصر خط بیان ہوا ہے، ص ۱۴۶)

۱۹۱- عمرو بن عاص کے نام

۲۱ھ میں (بقول واقدی۔ طبری ۴/۹۴/۲) حضرت عمر کے دو لڑکے عبد اللہ اور عبد الرحمٰن جہاد کے لئے مصر گئے۔ حضرت عمر نے عمرو کو لکھا: "اگر میرے کنبہ کا کوئی فرد تمھارے پاس آئے تو تم ہرگز ہرگز اس کو کوئی تحفہ یا پیش کش نہ دینا، نہ

اس کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ کرنا، تم نے اگر اس ہدایت کی مخالفت کی تو مناسب سزا دوں گا۔" عمرو بن عاص کہتے ہیں :۔ "اسی حکمِ امتناعی کی وجہ سے میں دونوں بھائیوں کی نہ تو آؤ بھگت کر سکا نہ کوئی سوغات بھیج سکا نہ ملنے ان کے گھر گیا۔ چند دن گذرے تھے کہ کسی نے آکر مجھ سے کہا کہ عبدالرحمٰن اور ابو سروعہ (بدری صحابی) آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اُن کو اندر بلا لیا، وہ بہت اُداس تھے۔ انھوں نے کہا: ہم کو حدِ شراب لگائیں، رات ہم نے شراب پی اور مدہوش ہو گئے۔" میں نے دونوں کو پھٹکارا اور کہا: امیر المومنین کے لڑکے اور ایک بدری صحابی کے حد لگاؤں! عبدالرحمٰن نے کہا اگر آپ حد نہیں لگائیں گے تو میں مدینہ لوٹ کر امیر المومنین کو اس کی خبر دوں گا۔" اس اثناء میں عبداللہ بن عمر بھی آگئے، میں ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھا خوش آمدید کہا اور صدرِ مجلس میں بٹھانا چاہا لیکن انھوں نے انکار کیا اور بولے: والد نے مجھے تم سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے الا یہ کہ ملاقات کے بغیر چارہ نہ ہو اور اس وقت ایک ایسی ضرورت آن پڑی ہے کہ ملاقات ناگزیر ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرے بھائی (عبدالرحمٰن) کا منظرِ عام پر سر نہ منڈوایا جائے، حدِ شراب جہاں چاہو لگا سکتے ہو۔" عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ حد کے ساتھ تضحیک و تشہیر کے لئے سر بھی منڈوایا جاتا تھا۔ میں دونوں کو گھر کے صحن میں لایا اور حد لگائی۔ اس کے بعد عبداللہ بھائی کو لے کر محل کے ایک کمرہ میں گئے اور ان کا اور ابو سروعہ کا سر مونڈا سنجدا میں نے اس موضوع پر عمر کو ایک حرف بھی نہ لکھا لیکن چند دن ہی گذرے تھے کہ یہ توبیخ آمیز خط موصول ہوا :۔

"عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے عاصی بن عاصی کو سلام علیک

ابن عاص، مجھے حیرت ہے تم پر اور تمھاری جرأت پر کہ تم نے میری ہدایات
کی خلاف ورزی کی، میں نے اصحاب بدر اور تم سے بہتر لوگوں کو نظر انداز
کرکے تم کو منتخب کیا حالانکہ تم گمنام تھے اور تم کو پچھلی صف سے نکال کر اگلی
صف میں کھڑا کیا لوگوں نے مجھ سے کہا تھا تم جرأت اور مخالفت سے کام
لوگے اور میں دیکھ رہا ہوں ویسا ہی ہوا جیسا انھوں نے کہا تھا، ایسا معلوم
ہوتا ہے تم کو بری طرح معزول کرنا پڑے گا۔ تمھارا برا ہو، عبدالرحمن کو اپنے
گھر میں حد لگاتے ہو، اور اس کا سر بھی گھر کے اندر مونڈتے ہو حالاں کہ تم کو
معلوم تھا کہ یہ بات میری مرضی کے خلاف ہوگی۔ عبدالرحمن تمھاری رعیت کا
ایک فرد تھا اور تم کو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے تھا جیسا کسی
دوسرے مسلمان کے ساتھ، لیکن تم نے کہا: امیرالمومنین کا لڑکا ہے، اس کے
ساتھ رعایت کریں، حالانکہ تم جانتے ہو کہ حقوق اللہ میں کسی کے ساتھ میں
رو رعایت نہیں کرتا "یہ خط پاتے ہی عبدالرحمن کو عبا ر (بالوں کا لمبا کوٹ) پہنا کر
اور بغیر کجاوہ کے اونٹ پر سوار کرکے روانہ کردو تاکہ اپنی بدکرداری کا مزہ چکھے"

میں نے حسب ہدایت عبداللہ کو ان کے والد کا خط دکھا کر عبدالرحمن کو مدینہ روانہ کردیا اور عمر کو
ایک معذرت نامہ میں لکھا کہ میں نے عبدالرحمن کو گھر کے صحن میں حد لگائی ہے اور بخدا یہ وہی جگہ ہے
جہاں مسلم اور غیر مسلم کو سزا دیتا ہوں۔ یہ خط عبداللہ کے ہاتھ بھیج دیا۔ عبداللہ بھائی کے ساتھ مدینہ
وارد ہوئے، عبدالرحمن موٹے بالوں کے کوٹ میں باپ کے سامنے حاضر ہوئے۔ بے گدے کی
سواری نے ان کا جسم ایسا چور کیا تھا کہ وہ چل نہ سکتے تھے۔ حضرت عمر نے عبدالرحمن کو برا بھلا
کہتے ہوئے کوڑا منگوایا۔ عبدالرحمن بن عوف نے شفاعت کی اور کہا کہ ان کو شراب نوشی کی سزا مل
چکی ہے مگر حضرت عمر پر اس کا اثر تو کجا انھوں نے الٹا ابن عوف کو ڈانٹا، عبدالرحمن پر کوڑے پڑنے
لگے، وہ چیختے اور کہتے: "میں بیمار ہوں، بخدا تم مجھے مارے ڈالتے ہو" مگر بے سود، حضرت عمر

کو رحم نہ آیا، حد لگانے کے بعد عبدالرحمٰن کو قید کر دیا گیا جہاں ایک ماہ مریض رہ کر ان کا انتقال ہوا۔

(شرح نہج البلاغہ، مصر ۳/ ۱۲۳ - ۱۲۴ و تاریخ عمر بن خطاب - ابن جوزی مصر -

۱۹۲- عمرو بن عاص کے نام

یہ خط بے سیاق و سباق ہے، اس کو موسیٰ بن جبیر نے شیوخ مدینہ سے روایت کیا ہے۔

خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نگارش "دیوان عطاء" قائم ہونے کے بعد ہوئی تھی "دیوان عطاء" کے قیام کی مورخین نے مختلف تاریخیں پیش کی ہیں، جن میں زیادہ قرین قیاس ۲۰ھ ہے۔ خط میں ایک نیا انکشاف ہے اور وہ یہ کہ جنگ بدر میں شریک ہونے والوں کا وظیفہ ۲۰۰ دینار تھا، ایک دینار کی شرح تبادلہ اس وقت دس درہم تھی اور دو سو دینار ہزار درہم کے برابر تھے - مجاہدین بدر کے وظیفہ کی مقدار کے بارے میں تین قول ہیں :- چار ہزار، پانچ ہزار اور چھ ہزار سالانہ، چار ہزار سے کم کسی مورخ یا راوی نے وظیفہ کی مقدار نہیں بتائی ہے، اس خط میں جیسا کہ آپ ابھی پڑھیں گے مجاہدین بدر کا وظیفہ ایک ہزار درہم بتایا گیا ہے۔

"واضح ہو کہ میں نے مدینہ کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا وظیفہ "دیوان عطاء" میں مقرر کر دیا ہے، اِن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو جہاد کے لئے مصر یا دوسرے محاذوں پر چلے گئے تھے اور پھر لوٹ آئے - وہ لوگ جو یہاں وظیفہ مقرر ہونے کے بعد مصر جا کر بس گئے ان کا اور ان کے بیوی بچوں کا وظیفہ میری مقرر کردہ شرح کے مطابق جاری رکھو، اور جن لوگوں کا وظیفہ یہاں مقرر نہیں ہوا ہے اور وہ مصر میں آباد ہو گئے ہیں، ان کا وظیفہ مقرر کردو، اور اس کی شرح وہ ہو جو ان کے جیسی خدمت والے دوسرے مسلمانوں کے لئے مقرر کی گئی ہو - خود اپنا وظیفہ دو سو دینار مقرر کرو یہ وہ رقم ہے جو جنگ بدر میں شریک ہونے والے مہاجر اور انصار کو دی گئی ہے میں نے اتنا وظیفہ تمھارے کسی

ہم مرتبہ کو نہیں دیا ہے، تم کو زیادہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ تم حاکم ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ سرکاری مدوں کے لئے تمھیں روپئے کی ضرورت ہوگی، ان مصارف کے لئے خراج بڑھاؤ، تحصیلِ خراج انصاف اور حق کے اصول پر ہو۔ جب خراج جمع ہو جائے تو بلا کسی تصرف کے اس سے مسلمانوں کے وظائف اور ضروری مصارف نکال لو اور باقی مجھے بھیج دو۔ تم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ مصر سے خُمس نہیں لیا جائے گا، کیوں کہ اس کو معاہدہ کے ذریعہ فتح کیا گیا ہے۔ مصر اور مصر میں جو کچھ ہے مسلمانوں کی دولت ہے، اس دولت سے پہلے ان لوگوں کو دو جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور سرکاری فرائض انجام دیتے ہیں، ثم نقص ما فضل بعد ذلک علی من سمی اللہ؟ عمرو یاد رکھنا اللہ تم کو اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے، وہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا، وہ چاہتا ہے کہ قرآن کی بتائی ہوئی راہ پر چلا جائے، تم کو یہ بھی یاد رہے کہ تمھاری عملداری میں ذمی اور معاہد لوگ ہیں۔ رسول اللہ نے ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کی ہے، اور قبطیوں کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی فہمائش کی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا ہے: قبطیوں سے حسنِ سلوک کرو، وہ تمھاری حفاظت میں داخل ہوں گے، وہ تمھارے ہم نسب بھی ہیں، ان سے رشتہ یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی ماں قبطی تھی۔ رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ خراج یا جزیہ لے گا تو قیامت کے دن میں اس کا گریبان پکڑوں گا۔ خبردار عمرو، کہیں رسول اللہ تمھارا گریبان نہ پکڑیں، رسول اللہ جس کے گریبان گیر ہوئے خدا بھی اس کا گریبان گیر ہوگا۔ اس قوم کا حاکم بن کر ایک بڑی آزمائش میں ڈالا گیا ہوں مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہونے لگا ہے، میری رعایا ہر طرف پھیل گئی ہے، میری ہڈیاں گھس گئی

ہیں، خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اُٹھالے، نہ میری تعریف کرنے والا کوئی ہو نہ برائی کرنے والا، بخدا مجھے ڈر رہتا ہے کہ اگر کوئی اونٹ تمہاری عملداری کے دور ترین حصہ میں لاپرواہی سے ضائع ہو جائے تو قیامت کے دن مجھ سے جواب طلب ہوگا۔" (ابن سعد - کنز العمال ۳/۱۶۲)

ذیل میں حضرت عمرؓ کے وہ خطوط پیش کیے جاتے ہیں جن کا سیاق و سباق یا سنِ نگارش معلوم نہیں ہے:-

۱۹۳- گورنروں کے نام

حق و انصاف کے معاملہ میں سب لوگ - یگانہ و بیگانہ تمہاری نظر میں برابر ہونا چاہئیں - رشوت خوری اور من مانے فیصلوں سے بچو، اور غیظ و غضب میں آکر لوگوں کو سزا نہ دو، انصاف کرنے بیٹھو چاہے یہ عمل دن میں ایک گھنٹہ کے لئے ہو" (کنز العمال ۵/۱۶۹)

۱۹۴- اہلِ نجران کے نام

خط کے ناقل ابن سیرین ہیں:-

"میں نے علی کو تاکید کر دی ہے کہ جو نجرانی عیسائی مسلمان ہو جائیں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں - علی کو حکم ہے کہ آپ سے پیداوار کا آدھا حصہ لیں - اہلِ نجران! میں آپ کو جلا وطن کرنا نہیں چاہتا بشرطیکہ آپ ٹھیک رہیں اور کوئی قابلِ اعتراض کام نہ کریں۔" (کنز العمال ۲/۳۰۵)

۱۹۵- صوبائی گورنروں کے نام

جو آزاد کردہ فارسی نسل لوگ مسلمان ہو جائیں - ان کو آزاد کنندگان سے

وابستہ کر دیا جائے، ان کو آزاد کنندگان کے برابر حق حاصل ہوں گے اور ان ہی جیسی پابندیاں اُن پر عائد ہوں گی۔ لیکن اگر وہ اپنی الگ جمعیت یا قبیلہ بنا کر رہنا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کا سالانہ وظیفہ مساوی مقرر کیا جائے۔" (کتاب الاموال ابوعبید قاسم بن سلام۔ کنز العمال ۲/۳۱۹)

۱۹۶۔ مرکزی شہروں کے مسلمانوں کے نام

"اپنے بچوں کو تیراکی اور گھوڑا سواری کی تعلیم دو، اور مشہور کہاوتیں اور عمدہ اشعار ان کو سنایا کرو۔" (ازالۃ الخفار ۲/۱۹۳)

۱۹۷۔ محصّلینِ خراج کے نام

سواد کی ایک مالدار عورت جس کی اراضی نہر ملک سے سیراب ہوتی تھی مسلمان ہوئی۔ چوں کہ قانوناً مسلمانوں پر زمین کا لگان عشر یعنی دسواں حصہ ہے، اُس نے غالباً مطالبہ کیا کہ میرا لگان کم کر دیا جائے۔ سواد کے محصّلوں نے اس باب میں مرکز سے رجوع کیا تو یہ جواب آیا:۔

"مالکہ زمین اگر زمین پر قبضہ رکھ کر حسب سابق لگان ادا کرتی رہے تو زمین اس کے پاس رہنے دی جائے اور اگر وہ لگان ادا نہ کرے یا کم کرے (اس بنا پر کہ مسلمان ہوگئی ہے) تو زمین بحقِ حکومت ضبط کر لی جائے۔"

۱۹۸۔ گورنروں کے نام

"میری نظر میں تمھارا سب سے اہم معاملہ نماز ہے۔ جو شخص پابندی سے نماز ادا کرتا ہے وہ اپنا دین بچا لیتا ہے۔ اور جو نماز سے غافل رہا وہ دوسرے فرائض سے اور زیادہ غافل رہے گا۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد خط میں تھا: جب

سورج کا سایہ ایک ذراع (دو فٹ کے قریب) ہو اس وقت نماز ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب انسان کا سایہ اس کے قد کے برابر ہوجائے۔ جب سورج، بلند، صاف اور چمکدار ہو اس وقت عصر کا وقت شروع ہوتا ہے، اور اتنی دیر رہتا ہے جتنی دیر میں مسافر چھ یا نو میل مسافت طے کرلیں۔ مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد ہوتا ہے، عشاء کا وقت شفق چھپنے کے بعد تہائی رات تک رہتا ہے۔ جو شخص نماز عشاء ادا کرنے سے پہلے سو جائے خدا کرے ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھیں نیند سے محروم رہیں، ہمیشہ کے لئے، ہمیشہ کے لئے! نماز فجر اس وقت پڑھی جائے جب ستارے روشن اور گھنے ہوں۔" (ازالۃ الخفاء ۳/۸۹)

۱۹۹۔ مکّہ کے گورنر نافع بن حارث خزاعی کے نام

نافع نے لکھا کہ چار آدمیوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو مشغولِ زناء دیکھا اور ان میں سے تین نے شہادت دی کہ مرد، عورت کے ساتھ سرمہ دانی میں سلائی کا سا عمل کر رہا تھا۔ لیکن چوتھے نے کہا میں نے یہ عمل نہیں دیکھا۔ گورنر نے خلیفہ سے رجوع کیا تو جواب آیا:۔

"اگر چوتھا گواہ اس عمل کی شہادت دے جس کی باقی تین نے دی ہے اور مرد و عورت شادی شدہ ہوں تو ان کو سنگسار کردو، اور اگر کنوارے ہوں تو حد لگاؤ، اور اگر چوتھا گواہ سرمہ دانی میں سلائی کے سے عمل کی گواہی نہ دے تو باقی تینوں کے حد قذف (جھوٹے الزام کی سزا) لگاؤ اور عورت کو چھوڑ دو۔" (نصب الرایہ ۳/۳۴۴)

یہاں یہ بتا دینا برمحل ہوگا کہ خود رسول اللہ نے سنگینیٔ سزا کو نظر میں رکھ کر یہ ضروری قرار دیا تھا کہ چاروں گواہ صاف صاف سرمہ دانی اور سلائی کے عمل کی شہادت دیں۔

۲۰۰- سُفیان بن وہب کے نام

طائف کے حاکم (؟) سُفیان بن وہب نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ طائف کی وادی سَلبہ میں ایک شخص نے شہد کے بہت سے چھتے لگائے ہیں، وہ رسول اللہ کو ان کا دسواں حصہ بطور محصول دیتا تھا جس کے عوض آنحضرتؐ نے اس وادی کو سرکاری حفاظت میں لے لیا تھا، آیا آپ کے عہد میں بھی اس کو سرکاری حفاظت میں رکھا جائے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا:-

"اگر وہ شخص دسواں حصہ جو رسول اللہ کو دیتا تھا ادا کرتا رہے تو اس کی وادی کی حفاظت حکومت کی طرف سے کی جائے اور اگر وہ دسواں حصہ ادا کرنے کو تیار نہ ہو تو وادی کی حفاظت نہ کی جائے۔ شہد مکھیوں کی محنت کا ثمرہ ہے کسی انسان کی محنت کا نہیں، جو چاہے اس کو کھا سکتا ہے۔"

(ازالۃ الخفاء ۲/۱۰۱)

مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب
اُستاذ عربی مدرسہ عالیہ رام پور (یوپی)

دلائل کی تنقیح

(۵)

پانچویں دلیل کی تنقیح تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی پانچویں دلیل آیہ کریمہ "انما الصدقات للفقراء والمساکین" الآیہ کا "اِنّما" کے ساتھ افتتاح ہے جو کلمہ حصر و قصر ہے مگر اصلاحی صاحب نے جس خصوصیت کے ساتھ "للفقراء" کے لام کو اپنی تدقیقات کا تختۂ مشق بنایا ہے غالباً اُس سے زیادہ، کلمہ اِنما کے ساتھ تجاہلِ عارفانہ برتنے میں اہتمام کیا ہے لیکن اگر وہ اس کے مقتضیٰ کے ساتھ کماحقہ اعتنا روا رکھتے تو شاید انھیں اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوتی کہ ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک متصدق علیہم واجب ہے۔ مگر معنی متبادر اور مسوق لہ کے مقابلے میں معنی غیر مسوق لہ کے ساقط الاعتبار ثابت کرنے میں وہ اس درجہ منہمک رہے کہ کشاف کے مطالعہ کے بعد بھی وہ اس نکتے تک نہ پہنچے۔ اپنے انہماک میں وہ کشاف کی اس عبارت سے بھی کہ

"قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودة وانها مختصة بها لا تتجاوزها الی غیرها کانہ قیل

انما ھی لھم لا لغیرھم

ونحوہ قولک انما الخلافة لقریش ترید لا تتعداھم ولا تکون لغیرھم"

وہ صرف اتنا ہی نتیجہ نکال سکے کہ

"پس لام یہاں جس چیز کو ظاہر کر رہا ہے وہ صرف خیرات و صدقات کا مذکورہ اصناف کے لئے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے۔ نہ تملیک سے اس کو تعلق ہے اور ......" (ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶)

اس استنتاج کی توقع کم از کم اصلاحی صاحب جیسے ادیب سے نہیں کی جا سکتی تھی لام کے کم و بیش بائیس[۲۲] معانی ہیں لیکن "قصر" سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح قصر کی حقیقت محض کسی چیز کا کسی چیز کے لئے خاص ہونا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک معمولی طالب علم بھی جس نے معانی و بیان کی کتب متداولہ کو پڑھا ہے ان چیزوں کو جانتا ہے۔ تعجب ہے اصلاحی صاحب کے قلم سے

"قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودۃ ......" الخ

کی وضاحت میں یہ جملہ کس طرح نکلا کہ لام صدقات کا مذکورہ اصناف کے لئے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے اور یہ کہ تملیک کے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اتمام الدرایۃ للسیوطی اور مختصر المعانی (شرح تلخیص المفتاح) للتفتازانی میں قصر کی حقیقت بدیں طور مرقوم ہے

"القصر تخصیص شیئ بشیئ بطریق مخصوص"

اس تعریف سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ محض تخصیص الشیئ بالشیئ (کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے لئے مخصوص کرنا) ہی قصر نہیں ہے بلکہ جب یہ تخصیص ایک مخصوص طریقہ پر ہوتی ہے تب جا کر کہیں قصر کی حقیقت مکمل ہوا کرتی ہے مثلاً "المنبر للخطیب" میں خطیب کے واسطے منبر کی تخصیص ہے مگر یہ "قصر" نہیں ہے۔ اسی طرح قصر کا مصداق صرف اسی تخصیص تک محدود نہیں ہے جو مثلاً "ان الحکم الا للّٰہ" سے مستفاد ہوتی ہے بلکہ وہ لام اختصاص والی تخصیص کے علاوہ اور تخصیصات کو بھی شامل ہے چنانچہ السکاکی نے مفتاح العلوم میں لکھا ہے

"اعلم ان القصر کما یجری بین المبتداء والخبر فیقصر المبتداء تارۃ علی الخبر، والخبر علی المبتداء اخری، یجری بین الفعل والفاعل۔ وبین الفاعل والمفعول وبین

المفعولين وبين الحال وذی الحال وبین کل طرفین" (مفتاح العلوم للسکاکی ص ۱۲۵)۔
غرض قصر میں اور اس تخصیص میں جو "المنبر للخطیب" نیز "ان الحکم الا للہ" اور "انما الصدقات للفقراء" سے مستفاد ہوتی ہے زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے چنانچہ کبھی قصر اور اس قسم کی تخصیص کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے جیسے "ان الحکم الا للہ" اور "انما الصدقات للفقراء" کبھی تخصیص ہوتی ہے مگر قصر نہیں ہوتا جیسے "المنبر للخطیب" اور "الفرس للراکب" میں تخصیص ہے مگر قصر نہیں ہے۔ اور کبھی قصر ہوتا ہے مگر اس قسم کی تخصیص نہیں ہوتی مثلاً "انما انا بشر مثلکم" اور "وما علینا الا البلاغ المبین" میں قصر ہے مگر لام اختصاص والی تخصیص نہیں ہے۔

بہر حال طرق اربعہ معروفہ کے بغیر قصر نہیں ہوا کرتا۔ تعجب ہے پھر کس طرح اصلاحی صاحب نے زمخشری کے قول "قصر لجنس الصدقات" کا مطلب محض "صدقات" کا مذکورہ اصناف کے لئے خاص ہونا بتایا۔ اور اس سے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ غریب لام کو دخل در معقولات کے لئے انھوں نے اس قصر کی بحث میں کیوں لا گھسیٹا کیوں کہ لام کے کتنے ہی معانی کیوں نہ ہوں اور اُن میں سے یہاں پر کوئی معنی کیوں نہ مقصود ہو، کم از کم اتنی بات ثابت و متحقق ہے کہ لام قصر کا فائدہ کبھی نہیں دیا کرتا۔

اور سب سے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ "انما" کو اس بے دردی سے نظر انداز کیا ہے گویا کہ نظم کلام میں وہ کوئی مد فاضل ہے حالانکہ افادۂ قصر کی اصل وہی ہے اس لئے کہ قصر کے طرق اربعہ جیسا کہ سکاکی نے مفتاح العلوم میں لکھا ہے حسب ذیل ہیں۔

"وللقصر طرق اربعة احدها طريق العطف كما تقول ...... زيد شاعر لا منجم ثانيها النفي والاستثناء كما تقول ..... وما محمد الا رسول ...... وثالثها استعمال انما ..... والسبب في افادة انما معنى القصر هو تضمينه معنى ما والا ولذلك تسمع المفسرين لقوله تعالى انما حرم عليكم الميتة والدم بالنصب

يقولون معناه ما حرم عليكم الا الميتة والدم ..... ورأيتها التقديم ....

.. تميمي أنا ـــ"   (مفتاح العلوم للسكاكی ص ۱۲۵-۱۲۷)

یہ قصر کے طرقِ اربعہ ہیں اور قارئین کرام نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ اس فہرست میں لام کا کہیں مذکور نہیں ہے۔ تعجب ہے پھر کس طرح اصلاحی صاحب نے "قصر لجنس الصدقات" سے یہ معنی نکال لئے کہ "لام یہاں جس چیز کو ظاہر کر رہا ہے وہ صرف خیرات و صدقات کا مذکورہ اصناف کے لئے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے۔"

غرض کلمہ انّما قصر کے لئے آتا ہے اور "قصر" "تخصیص الشیئ بالشیئ" سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ منطق کا قضیہ مقصورہ (exclusive Proposition.) ہے۔ اور قضیہ مقصورہ دو بسیط قضیوں کے حکم میں ہوا کرتا ہے ایک موجبہ (Affirmative.) دوسرا سالبہ (negative.) مثلاً "صرف مومن ہی جنتی ہیں" یہ جملہ دو جملوں کے برابر ہے یعنی "تمام مومن جنتی ہیں" اور "کوئی غیر مومن جنتی نہیں ہے"۔ یا "ان الحکم الا للّٰہ" دو جملوں کے برابر ہے "تمام احکام اللہ تعالےٰ ہی کے واسطے ہیں" اور "غیر اللہ کے لئے کوئی حکم نہیں ہے"۔

پس آیۂ کریمہ میں قصر کی وجہ کلمہ انّما کا استعمال ہے جس کی وجہ سے جنس صدقات صرف اصناف محدودہ پر مقصور ہے اور اس "قصر صدقات علی الفقراء" کا مطلب اصول محررہ بالا کی رو سے حسب ذیل دو جملوں میں ہوگا۔

(i) تمام صدقات (زکوٰۃ) فقراء کے واسطے ہیں ۔ اور

(ii) غیر فقراء کے واسطے صدقات (زکوٰۃ) میں سے کچھ نہیں ہے۔

اور یہی دو جملے زمخشری نے لکھے ہیں

(i) انها مختصة بها" (الاصناف الثمانية)

(ii) "لا تتجاوزها الى غيرها" (غير الاصناف الثمانية)

اور مزید تشریح صاحب کشاف نے بدیں طور فرمادی کہ

(ا) انما ھی (الصدقات) لھم "(المتصدقین علیھم)"

(ا) "لا لغیرھم (لغیر المتصدقین علیھم)"

یعنی "یہ چیز (صدقات) انھیں (اصناف ثمانیہ) کے لئے ہے ان کے ماسوا لوگوں کے لئے نہیں ہے"[1]

یہ ترجمہ خود اصلاحی صاحب ہی کا ہے اور کشاف کا محررہ بالا اقتباس بھی انھوں نے اپنے حسب منشاء پیش کیا ہے لہذا میں اس "لئے" "لام للفقراء" کا مفہوم بھی انما للحجۃ وہی لے لیتا ہوں جو انھوں نے اختیار کیا ہے یعنی "اختصاص انتفاع"، جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے

"میرے نزدیک یہاں لام یا تو استحقاق و اختصاص کے مفہوم کے لئے ہے یا انتفاع و افادہ کے مفہوم کے لئے"[2]

لہذا خود اصلاحی صاحب کے حسب توجیہ آیت کریمہ کا منشاء یہ ہوا کہ

"صرف یہی اصناف ثمانیہ صدقاتِ زکوٰۃ سے انتفاع کا استحقاق و اختصاص رکھتے ہیں نہ کہ ان کے غیر" اور یہی ملکیت کا مفہوم ہے (بلکہ غالباً اس سے بھی قدرے کم) چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ملک کے جو معنی بتائے ہیں وہ یہی ہیں،

"ومعنی الملک فی حق الآدمی کونہ احق بھا بالانتفاع من غیرہ"[3]

اور یہی جدید قانون کا موقف ہے چنانچہ پالک نے ملکیت کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر کم و بیش صادق آتی ہے۔ اس تعریف کی مزید توضیح پالک آگے لکھتا ہے

"مالک وہی شخص سمجھا جائے گا جسے تمتع و انتقال کا باقی حق ملا ہو"[4]

اسی طرح سامنڈ اپنے اصولِ قانون میں کہتا ہے

"شیٔ مادی کے مالک سے مراد وہ شخص ہے جو کسی حق کے عام تمتع و تصرف کے حق کا مالک ہو یا ان تصرفات کا مالک ہو جو دوسرے تمام مخصوص اور محدود حقوقِ تصرف و تمتع کے وضع ہونے کے

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۶ صفحہ ۴۰۶ [2] ایضاً صفحہ ۴۰۴ [3] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم باب ابتغاء الرزق صفحہ ۱۰۶ [4] اصول قانون سامنڈ جلد دوم صفحہ ۳۰ حاشیہ

بعد جو غیروں کو بطور بار و مواخذہ حاصل ہوں، باقی رہ گئے ہوں"۔[۵]

لیکن پالگنا اور سامنڈ کے حوالے تو ہیں نے صرف اس لئے دیئے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسلام کا تصورِ ملکیت (انسانی) ایسا اور ویسا ہے۔ اس اسلامی تصورِ ملکیت کی معقولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی عقل جب صحیح طور پر کسی بات کو سوچتی ہے تو وہیں جاکر ٹھہرتی ہے جہاں اسلام صدیوں پہلے پہنچ چکا ہے۔

مگر شاہ ولی اللہ صاحب رح کی حیثیت دوسری ہے۔ منکرینِ اسلام میں وہ ایک خصوصی اہمیت کے مالک ہیں۔ باایںہمہ جلالتِ قدر و علوِ مرتبہ میں اُن کی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دیتا، بالخصوص ایسی منزل میں جہاں اکابر فقہائے متقدمین کی تصریحات مبحوث عنہا ہوں جہاں ادر تو اور امام ابو حنیفہ رح اور امام شافعی کے اجتہادات معرضِ تغلیط و تحمیق میں ہوں وہاں شاہ صاحب بے چارے کہاں۔ اس لئے اسلام کا تصور ملکیت اُس کے اصولِ ولیہ (کتاب وسنت) ہی سے مستنبط ہونا چاہئے:۔

اسلام کا اصل الاصول توحید ربوبیت ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کائنات ومافیہا کا خالق و مالک صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ وہی رب السمٰوٰت والارض ہے اور اُسی کو اس کی ملک حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے وہی رب العالمین ہے

"ھو الحی لا الٰہ الا ھو فادعوہ مخلصین لہ الدین الحمد للہ رب العالمین"۔ (غافر ۶۴)

"فللہ الحمد رب السمٰوٰت ورب الارض رب العالمین"۔ (جاثیہ ۳۶)

"قل من رب السمٰوٰت والارض قل اللہ"۔ (رعد ۱۶)

"ان الٰھکم لواحد۔ رب السمٰوٰت والارض وما بینھما ورب المشارق"۔ (صافات ۴-۵)

ارض و سما اسی کی ملک ہیں۔

"وللہ ملک السمٰوٰت والارض، واللہ علی کل شیئٍ قدیر"۔ (آل عمران ۱۸۹)

"للہ ملک السمٰوٰت والارض وما فیھن وھو علی کل شیئٍ قدیر"۔ (مائدہ ۱۲۰)

---

[۵] اصول قانون سامنڈ جلد دوم ص ۲ حاشیہ

وہی مالک الملک ہے۔

"قل اللّٰھُمَّ مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء" (آل عمران ۲۶)

"ذالکم اللّٰہ ربکم لہ الملک لا الٰہ الا ھو فانّٰی تصرفون" (زمر ۶)

"ولم یکن لہ شریک فی الملک" (بنی اسرائیل ۱۱)

جو کچھ کائنات میں ہے بس اُسی کا ہے

"وللّٰہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض" (نساء ۱۳)

"قل لمن ما فی السمٰوٰت والارض، قل للّٰہ" (انعام ۱۲)

مگر اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے انسان کو خلق کیا تاکہ

"کنت کنزاً مخفیاً فاحببت اَن اعرف فخلقت الخلق"

کی حقیقت متحقق ہو چنانچہ قرآن کہتا ہے

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" (ذاریات ۵۶)

اس لئے اس نے انسان کو پیدا کیا اور کائنات وما فیہا کی گوناگوں نعمتیں اُس کے فائدے کے لئے خلق فرمائیں۔ قرآن کہتا ہے

"ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" (بقرہ ۲۹)

لہٰذا ملک حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ انسان کو صرف اُس کا بخشا ہوا حق انتفاع وتمتع ہے یا آج کل کی اصطلاح میں (جس کی تدقیق بوسانکے (Bosanquet) نے کی ہے) کائنات وما فیہا کی مِلکِ اقتدار (Property for Power) کا حق اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے اور مِلکِ انتفاع (Property for use) کا استحقاق انسان کو ہے۔ کیوں کہ ملک حقیقی (مِلکِ اقتدار) کا مفہوم دوئی کا احتمال نہیں رکھتا چنانچہ قرآن کہتا ہے

"لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللّٰہ لفسدتا"

اس لئے لامحالہ اگر توحید ربوبیت کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرے کے نظم وانضباط

کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت داعی ہو جو لادینی نظاموں کے "نظم ملکیت" (Institution of Property) کے مشابہ ہو تو ملکیت کی تدقیق اسی طور پر کرنا ہوگی کہ ملک حقیقی اللہ تعالیٰ کی ہے اور ملک مجازی انسان کی یا ملک اقتدار خدائے تعالیٰ کی ہے لیکن ملک انتفاع انسان کی ہے۔ اسی چیز کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بوسانکے (Bosanquet) سے دو سو سال قبل فرمایا تھا:-

"اعلم ان اللہ تعالیٰ خلق الخلق وجعل معایشہم فی الارض واباح لہم الانتفاع بما فیہا، وقعت بینہم المشاحۃ والمشاجرۃ فکان حکم اللہ عند ذالک تحریم ان یزاحم الانسان صاحبہ فیما اختص بہ بسبق یدہ الیہ او ید مورثہ او بوجہ من الوجوہ المعتبرۃ عندہم .... اقول الاصل فیہما ان الکل مال اللہ لیس فیہ حق لاحد فی الحقیقۃ - لکن اللہ تعالیٰ اباح لہم الانتفاع بالارض وما فیہا وقعت المشاحۃ فکان الحکم حینئذ ان لا یہیج احد عما سبق الیہ من غیر مضارۃ ....

ومعنی الملک فی حق الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ"

(حجۃ اللہ البالغۃ جلد دوم ابواب ابتغاء الرزق ص۱۰۲)

لہٰذا اگر اتمام حجت کے لئے لام للفقراء کے معنی استحقاق و اختصاص یا انتفاع و افادے کے بھی لئے جائیں تو بوجہ اس امر کے کہ کلمہ انما کے افادۂ حصر و قصر کی بنا پر یہ استحقاق و اختصاص یا انتفاع و افادہ صرف فقراء و مساکین و دیگر اصناف معدودہ فی الآیۃ کے واسطے ثابت ہے اور ان کے غیر کے لئے نہیں، اور اصناف معدودہ، غیر کے مقابلے میں اموال زکوٰۃ کے واحد حقدار ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب رح کی تصریح کے مطابق یہ فقراء و مساکین وغیرہم مال زکوٰۃ کے مالک قرار پاتے ہیں اور چوں کہ مال زکوٰۃ ادائے زکوٰۃ سے قبل زکوٰۃ دہندہ کی ملک تھا اور ادائے زکوٰۃ کے ساتھ یہ ملک منتقل ہو کر فقراء و مساکین و دیگر مستحقین کی جانب جا رہی ہے تو اس طرح ادائے زکوٰۃ

تملیکِ فقیر کو متضمن ہے۔ البتہ اگر اس انتقالِ ملک کی اور کوئی شکل ہو سکتی ہو تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے، مگر کسی نہج سے دیکھئے انتقالِ ملک کی اور کوئی شکل متصور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تملیکِ فقیر ادائے زکوٰۃ کی حقیقت ٹھہری اور یہی فقہاء سابقین و مابعد کا متفق علیہ ہے کہ

"التملیک وھو الرکن"

رہی تملیک میں تملیک شخصی و تملیکِ اجتماعی کی تدقیق، سو وہ بیش از سفسطۂ محض نہیں ہے۔ اس لئے کہ تملیکِ اجتماعی سے آخر مراد کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

پھر "تملیک اجتماعی" کے مفہوم کی تعبیر "غریبوں کی فلاح و بہبود کے کام" سے کرنا خوش فہمی وابلہ فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ

اولاً "غریبوں کی فلاح و بہبود کے کام" "رفاہِ عامہ کے کام" "اجتماعی نوعیت کے کام" میں سے ہر ایک نعرہ ایک سنہرا فریب ہے جس کے ذریعے قدیم زمانے کی شہنشاہیتوں سے لے کر عہدِ حاضر کی مزدور آمریتوں تک بر سر اقتدار طبقہ محنت کش عوام کو لوٹتا رہا ہے لیکن قدیم غیر ذمہ دار استبدادی حکومتوں کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اس معاشی دستبرد کو ان دل کش و دل فریب عنوانوں کا پردہ نہیں اُڑھاتی تھیں مگر عہد حاضر کی ذمہ دار جمہوریتوں میں مُترفین و اہلِ دول کی عیش کوشیوں کے لئے جب روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو محنت کش عوام کی کمائی، اجتماعی فلاح و بہبود اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر کے نام سے لوٹی جاتی ہے لیکن یہ اسلام ہی کا احسان تھا کہ اُس نے دکھی انسانیت کو ان جسمانی و مادی پابندیوں سے نجات دلائی چنانچہ قرآن پیغمبر اسلام کی شان میں کہتا ہے

"ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم" (اعراف ۱۵۷)

اور جناب نبی کریم نے اہلِ عرب کو خوشخبری سنائی

"یامعشر العرب احمدوا اللہ اذ رفع عنکم العشور" — اے گروہ عرب اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تم پر سے دہگی محصول کو اُٹھا دیا۔

(طحاوی: معانی الآثار جلد اول)

اس کے برعکس اسلام نے معاشرہ کی معاشی تنظیم کے لئے یہ انتظام کیا کہ تونگروں کی آمدنی کا ایک حصہ فقراء و مساکین کی ملکیت قرار دیا لیکن اس میں بھی عہدِ حاضر کی وصولی ٹیکس کی پالیسی کی تقلید نہیں کی جس میں نام کے لئے تو کبھی کبھی اہلِ دول کی آمدنی سے روپیہ میں سے ۱۵. ر انکم ٹیکس کے نام سے لے لئے جاتے ہیں مگر یہ ساری رقم "قومی دفاع" "اجتماعی فلاح و بہبود" اور "رفاہ عامہ کے کام" کے نام سے صرف طبقہ امراء و اہلِ دول کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے میں خرچ کی جاتی ہے۔ اسلام اغنیاء سے اُن کی آمدنی کا صرف چالیسواں حصہ لیتا ہے مگر وہ سب کا سب فقراء کی ملکیت قرار دیتا ہے جیسا کہ حدیث معاذ بن جبلؓ میں مذکور ہو چکا ہے

"توخذ من اغنیاءھم و ترد علی فقرائھم"

اور چوں کہ غریبوں کی اجتماعی فلاح و بہبود اور اجتماعی تملیک وغیرہ کے دل خوش کن ناموں میں تغلبِ بیجا اور گول مال کی بہت زیادہ گنجائش ہے لہٰذا وہ اس فطری اصول کو ملحوظ رکھتا ہے کہ "ہر شخص اپنی فلاح و بہبود کو خود ہی بہتر سمجھتا ہے" لہٰذا وہ فقراء اور صرف فقراء کو اُن کا حصہ پہنچا دینے کا مطالبہ کرتا ہے اس کے بعد فقراء جانیں اور اُن کا کام۔

ثانیاً:۔ اس نام نہاد "غریبوں کی فلاح و بہبود کے کام" میں تملیک اجتماعی کے اجراء کی کیا شکل ہے۔ اس کا جواب بالتصریح تو منکرینِ تملیک نے نہیں دیا مگر اصلاحی صاحب نے اس باب میں جو ایک اچھا خاصہ وعظ فرما دیا ہے اُس کا ما حصل (اگر میں زیادہ غلطی نہیں کرتا) یہ ہے کہ

"زکوٰۃ کی رقم سے غرباء کی اجتماعی خدمت و بہبود کے چھوٹے بڑے کام کئے جائیں"

لیکن اجمالی طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان رفاہِ عامہ کے کاموں کا نفع صرف غرباء تک محدود رہے گا اور غیر غرباء کو اس سے مستفید ہونے اور بعد میں چھا جانے کا موقعہ نہ ملے گا" جیسا کہ آیت کے قصر و حصر سے مستفاد ہوتا ہے۔

اب ذرا تفصیلی طور پر "نیکی اور خدمتِ خلق" کے اُن کاموں پر نظر ڈال لیجئے جن کا اصلاحی صاحب نے حوالہ دیا ہے۔

(i) غریبوں کے محلے میں مسجد بنانا۔

(ii) اُن کے لئے تعلیم دین کا کوئی ادارہ کھولنا۔

(iii) اُن کی ذہنی و فکری تربیت کے لئے کوئی اسلامی لائبریری قائم کرنا۔

(iv) اُن کے مریضوں کے مفت علاج کے لئے کوئی شفاخانہ بنانا۔

(v) غریبوں کے کسی محلے میں اگر کنواں نہیں ہے تو اُن کے پانی پینے کے لئے کنواں بنوانا۔

(vi) مسافروں کے لئے سرائے یا تالاب بنوانا۔

(vii) کسی غریب کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام کرنا۔

(viii) کسی مردہ غریب کا قرضہ ادا کرنا۔

(ix) کسی غلام کو خرید کر آزاد کرنا۔

(x) وصولیٔ زکوٰۃ کے مصارف پر اسی کا ایک جز خرچ کرنا۔

لیکن ان کارہائے خیر میں سے کسی مد میں کیوں نہ زکوٰۃ کو صرف کیا جائے اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ سَو فی صدی غریبوں ہی کے مفاد سے متعلق رہے گا اور غیر غربا یہاں تک کہ زکوٰۃ دہندگان بھی اُس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستفید نہ ہوں گے۔ مثلاً

(i) آپ مسجد بنوایئے لیکن کیا دروازۂ مسجد پر جلی حروف میں کندہ ہوگا کہ یہ صرف غریبوں کی مسجد ہے امیر اس میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اَور اگر کندہ ہو بھی تو اس پر عمل درآمد کرانے کا کیا انتظام ہوگا مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ آپ غریب ہیں یا امیر اور اگر وہ کہہ دے کہ امیر تو اس سے کہہ دیا جائے گا کہ حضور! یہ تو غریبوں کی مسجد ہے، امیروں کی مسجد سول لائن میں ہے۔ فقہی حیثیت سے قطع نظر یہ تجویز جذباتی ہے حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔

(ii) یہی حال تعلیم دین کے ادارے کا ہے کیا جنوبی افریقہ کے اسکولوں کی طرح اُس پر لکھ دیا جائے گا کہ "یہ فقیروں بھکاریوں کا مدرسہ ہے" اگر ایسا کیا جائے تو سب سے پہلے تو طلبہ عِلوِ نفس و خود داری سے ہاتھ دھولیں جو تعلیم کا مقصدِ جلیل ہے۔ پھر اگر کوئی فقیر طالب علم غنی ہو جائے تو اس کو

مدرسہ سے اس جرم میں نکال دیا جائے گا کہ وہ اب فقیر نہیں رہا۔

لیکن اگر یہ التزام نہ کیا گیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اُس مدرسہ سے صرف غربا ہی مستفید ہوں گے غیر غربا نہیں۔ اور جب غیر غربا بھی اس سے مستفید ہوں گے تو تجربہ بتاتا ہے کہ متمول طبقہ ہی اُس پر چھا جائے گا۔ انگلستان کے ایٹن (Eton) کے اسکول کی مثال ہمارے سامنے ہے یہ کسی زمانہ میں غربا ہی کے لئے بنا تھا اور اس میں غربا ہی تعلیم پاتے تھے لیکن مدرسین نے ایسی جانفشانی کے ساتھ کام کیا کہ یہاں کے فارغ التحصیل چمکنے لگے تو امرا نے بھی اپنے بچوں کو اس میں بھیجنا شروع کیا اور اب تو یہ کیفیت ہے کہ معمولی امرا بھی اپنے بچوں کو اس میں تعلیم نہیں دلوا سکتے صرف شاہزادوں اور اونچے درجہ کے امرا ہی کے لئے وہ وقف ہے۔

پھر مدارس کی افادیت کی ایک اور جہت بھی ہے وہ چند مدرسین کی روزی کا بھی سہارا ہوتے ہیں جب تک وہ مدرسین اہلِ نصاب نہیں ہیں اُس وقت تک تو اُن کا اس سے تمتع و انتفاع مناسب ہے لیکن اگر کسی مدرس کی بیوی کفایت شعاری سے کام لے یا وہ خارجی طور پر اتنا سرمایہ حاصل کرلے کہ صاحبِ نصاب ہو جائے تو کیا اس مدرس کو محض اس جرم میں نکال دیا جائے گا کہ اب وہ فقیر نہیں رہا حالاں کہ وہ کتنا ہی متقی، دیانت دار، فرض شناس اور علامۂ وقت کیوں نہ ہو۔

(iii) یہی حال اسلامی لائبریری کا ہے کیا وہ جنوبی افریقہ کی "نیگرو لائبریری" بنادی جائے گی اور غیر غریب کو اس میں داخل ہو کر اپنی ذہنی و فکری تربیت کی اجازت نہ ہوگی۔ کم از کم اسلام علم کی اشاعت کے باب میں اتنا بخیل و ضنین تو نہیں ہے۔

(iv) یہی حال شفاخانہ کا ہے۔ یہاں بھی دو صورتیں ہیں یا تو غیر غریب بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے اور اگر ایک مرتبہ غیر غربا کو یہ موقعہ ملا تو تجربہ بتاتا ہے اور انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ فقراء کے مقابلے میں سفید پوشوں کو ترجیح دی جائے گی اور کچھ ہی دنوں میں یہ غریبوں کا شفاخانہ امیروں کا شفاخانہ بن جائے گا اور اگر غیر غربا غریبوں کے شفاخانہ کے تجربہ کار اور حاذق معالجین کے علاج سے محروم کردیئے گئے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ محض ایک اصول کی مراعاة کی خاطر ایک انسانی جان کے ساتھ

بے اعتنائی برتی جائے کیا یہی اسلام ہے۔ "رحمۃ للعالمین"!

لیکن اصل فساد کی جڑ اس تجویز میں ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے "اُن کے مفت علاج کے لئے شفاخانہ بنایا جائے۔"

پھر مدرسہ کی طرح شفاخانہ کی بھی ایک جہت اور ہے کہ وہ چند ڈاکٹروں اور دوسرے اہلِ عملہ کے روزگار کا سہارا ہے پس اگر ایک ڈاکٹر یا اور کوئی ملازم شفاخانہ کسی صورت سے صاحبِ نصاب ہو جائے تو کیا صرف اس جرم میں اُسے نکال کر غریب مرضیٰ کو اُن کے علاج کی نعمت سے محروم کر دیا جائے گا۔

(۷) غریبوں کے نام سے کنواں بنوانے میں بھی یہی سوال ہے۔ کوئی مشینری ایسی سمجھ میں نہیں آتی کہ غیر غربا کو اس کنویں سے پانی لینے کی ممانعت کی جا سکے اور اگر بالفرض ممانعت کی بھی جائے تو اس حدیثِ نبوی کی مخالفت لازم آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تین چیزوں میں سب لوگ برابر کے حق دار ہیں جن میں سے ایک پانی بھی ہے۔

(ز ۷) مسافروں کے لئے سرائے یا تالاب بنوانے کا بھی یہی سوال ہے۔ تالاب کا معاملہ تو بالکل کنویں جیسا ہے۔ سرائے میں دوسرے اداروں کی طرح امیر و غریب کی تفریق عملاً و عادۃً ناممکن ہے۔

(ز ز ۷) "کسی غریب کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام اصلاحی صاحب کا صحافیانہ فنکاری کا شاہکار (Master of ...) ہے "فقہائے احناف کی قساوتِ قلبی تو ملاحظہ کیجئے کہ ایک غریب کی لاش پڑی ہوئی ہے اور کفن دفن کے لئے وہ اہلِ دول کو چندہ دینے سے منع کرتے ہیں" مگر یہ جذباتی اپیل ہے کاش وہ ایک علمی بحث میں جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ... استعمال نہ فرماتے۔ سوال محض اتنا نہیں ہے کہ

"وہ غریب مرجانے کے سبب سے اس قابل تو رہا نہیں کہ اس مال کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے کفن اور دوسرے سامانِ تجہیز و تدفین کا انتظام کر سکے اور تملیکِ فقیر کی شرط جو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے رکن کی حیثیت رکھتی ہے پوری ہو سکے۔"

کچھ اور بھی سوالات ہیں:۔

ا۔ کیا صدقۂ زکوٰۃ سے کسی غریب کی تکفین وتدفین آیاتِ قرآنی یا احادیثِ نبوی سے منصوص ہے؟ اگر ہے تو فقہاء کا یہ فتویٰ قطعاً ناجائز ہے اور بے شک اس صورت میں اُن کا اتباع "اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله" کا مصداق ہوگا۔

ب۔ لیکن اگر مسکوت عنہ ہے تو بہتر ہوگا کہ بجائے جذبات سے اپیل کرنے اور ردائے علمہ کو فقہاء سابقین کے خلاف بھڑکانے کے اس مسئلے پر سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ نظر ڈال لی جائے۔

لاوارث میت کی تکفین وتدفین تو ہو ہی جاتی ہے کسی مسلمان کی لاش کفن دفن بغیر صرف اس بناء پر نہیں پڑی رہتی کہ فقہائے احناف نے صدقۂ زکوٰۃ کو تجہیز وتدفین میں لگانے سے منع کر دیا تھا اگر پڑی رہی ہوگی تو اُس کا سبب اس کے سوا اور کچھ ہوگا۔

ج)۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ لاوارث میت کی تجہیز وتکفین کا بار کس پر پڑے۔ اسلامی سماج کے معاشی اعتبار سے تین طبقے ہو سکتے ہیں۔

اول: فقراء ومساکین جو نانِ شبینہ سے بھی محتاج ہیں۔

دوم: جو محتاج تو نہیں ہیں لیکن اتنے مالدار بھی نہیں ہیں کہ صاحبِ نصاب کہلا سکیں۔

سوم: اغنیاء جو صاحبِ نصاب ہیں۔

ان میں سے تیسرا طبقہ زکوٰۃ نکالتا ہے اور پہلا طبقہ زکوٰۃ کا حق دار ہے رہا دوسرا طبقہ تو نہ اُس پر زکوٰۃ واجب ہے اور نہ وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

اب منکرینِ تملیک کا اصرار ہے کہ چوں کہ اغنیاء زکوٰۃ نکال کر ہر بار سے بری الذمہ ہو چکے ہیں لہٰذا لاوارث میتوں کی تکفین وتدفین کا بار اُن پر نہ پڑنا چاہیئے اور نہ طبقہ دوم پر جنھوں نے صاحبِ نصاب نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں نکالی اور کسی طرح زیر بار نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کا بار فقراء ومساکین کے طبقہ پر پڑنا چاہیئے جو نانِ شبینہ سے محتاج ہیں اور جب اغنیاء کی زکوٰۃ اُن کے حصہ میں آئے تو اُس

میں سے لاوارث میتوں کی تکفین و تدفین کے نام سے اُن کا پیٹ کاٹ لیا جائے۔ اب عرض یہ ہے کہ کیا یہی انصاف ہے؟ جن کے پاس دولت کا ۳۹/۴۰ ہے وہ تو اس مصرف سے زیر بار نہ ہوں بلکہ وہ زیر بار ہوں جن کے پاس صرف ۱/۴۰ ہے اور طبقۂ دوم کے وہ لوگ بھی صاف بچے رہیں جو نصابِ شرعی کا مالک نہ ہونے کی بنا پر کسی انفاق فی سبیل اللہ سے زیر بار نہیں ہوتے۔

اور اگر فقہا یہ فتویٰ دیں کہ نہیں اس کا بار اُن بے نواؤں پر نہیں پڑے گا جو اجتماعی دولت کے چالیسویں حصے سے بھی کم کے حق دار ہوئے ہیں[1] بلکہ یا تو مملکت کسی ادارہ ([illegible]) سے یہ صدقہ دے یا اسلامی مملکت کے نہ ہونے کی صورت میں بقیہ طبقے جو اجتماعی دولت کے ۳۹/۴۰ حصے سے زیادہ کے مالک ہیں اس کارِ خیر کے لئے چندہ دیں تو اب قارئین کرام ہی فیصلہ کریں کہ اُن کا یہ فتویٰ قساوتِ قلبی پر موقوف ہے یا عدل و انصاف اور انسان دوستی پر۔ اور یہ فتویٰ محض اُن کی اصول پرستی کا (کہ اس میں تملیک معدوم ہے کیوں کہ مردہ اس کا اہل نہیں ہے) نتیجہ ہے یا حق پرستی کا۔

حرص کے بندے اور دولت کے غلام جنہیں مال کا چالیسواں حصہ بھی نکالنا ناگوار ہے بے شک یہی سمجھیں گے کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد انھوں نے فقرا ہی نہیں بلکہ اللہ میاں تک پر بڑا احسان کر دیا (نعوذ باللہ منہا) اور اب ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اسلامی تعلیم کی رو سے زکوٰۃ کم سے کم رقم ہے جو معاشرے کے تونگر طبقہ کو سماج کی معاشی تنظیم کے لئے نکالنا واجب ہے لیکن زکوٰۃ نکالنے پر بھی وہ بقیہ دولت کے علی الاطلاق مالک نہیں بن جاتے بلکہ غیر متعین طور پر اب بھی سماج کے حقوق اس سے وابستہ ہیں۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ واجب الاذعان ہے کہ

"وفی المال حق سوی الزکوٰۃ"

لہذا حق و انصاف کا تقاضہ ہے کہ لاوارث میتوں کی تجہیز و تکفین رقومِ زکوٰۃ سے نہ کی جائے کیوں کہ اس طرح فقراء و مساکین کا پیٹ کٹتا ہے، بلکہ بیت المال کے ایک مخصوص فنڈ سے یہ رقم دی جائے یا صاحبِ استطاعت چندہ کر کے اس کام کو انجام دیں۔

---

[1] کیوں کہ طبقہ دوم (جن پر آبادی کی اکثریت مشتمل ہے) کی زکوٰۃ اُن کو نہیں ملتی اسی لئے کہ طبقۂ دوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(باقی آئندہ)

کتب خانہ شکرانواں (بہار)

از

(مولانا ابو سلمہ شفیع احمد البہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

"شکرانواں ضلع پٹنہ کا مشہور گانوں ہے مولانا (رفیع الدین صاحب مرحوم) اس اطراف کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے، لاکھوں روپے کی جائداد کے مالک تھے لیکن علم کا نشہ آخر وقت تک سوار رہا، نادر مخطوطات کا ایک قیمتی کتب خانہ آپ نے شکرانواں میں مہیا کیا تفسیر ابن جریر طبری کا کامل نسخہ تیس (۳۰) جلدوں میں آپ کے پاس موجود تھا اب چھپ جانے کے بعد تو اس کی اہمیت نہ رہی لیکن طباعت سے پہلے اس کتاب کے کل تین نسخے ساری دنیا میں پائے جاتے تھے جن میں ایک نسخہ شکرانواں کا تھا، ہزار ہا روپے خرچ کرکے آپ نے اس کی نقل مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے حاصل کی تھی آپ کے کتب خانہ میں حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا جمع ہوگیا ہے شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبدالبر محدث کی کتابیں استذکار اور تمہید آپ کے یہاں موجود ہیں مُحلّٰی ابن حزم جیسی نایاب کتاب کی چودہ جلدیں آپ کے یہاں میں نے دیکھی تھیں طباعت سے پہلے ان کا دیکھنا ہی مرے لئے باعث فخر تھا واللہ اعلم یہ کہاں تک صحیح ہے کہ شرح عون المعبود جو غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اس کی تالیف میں مولانا رفیع شکرانوی کی شرح ابو داؤد سے بہت نفع اٹھایا لیکن افسوس کہ خود مولانا شکرانوی کی شرح ضائع کرادی گئی یا ہوگئی۔ (نظام تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۲۷۴)

اس اعجوبہ روزگار کے حالات مختصراً حسب ذیل ہیں

نام ونسب | رفیع الدین بن شیخ بہادر علی بن شیخ نعمت علی بن شیخ محمد دائم الصدیقی

مولانا کے نانا شیخ غلام علی صاحب جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رح

کے کسی خلیفہ کے مرید تھے۔

شکرانواں یہ پٹنہ ضلع کا مشہور گانوں ہے ضلع کی آخری مشرقی سرحد پر واقع ہے، کل آبادی بارہ چودہ سو سے کم نہیں، سو سوا سو مسلم آبادی میں سے ۲۰، ۲۲ گھر شیوخ و سادات کے ہیں، مولانا کی جائے پیدائش کا فخر اسی گاؤں کو حاصل ہے۔

تعلیم و بیعت | ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی پھر گیلانی منتقل ہو گئے اور مولوی سلامت علی مرحوم سے کافیہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا احسن صاحب گیلانی منطقی (جد امجد حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور سات سال تک مسلسل ان کی خدمت میں رہ کر درسِ نظامیہ سے فراغت حاصل کی، اس وقت ہندوستان میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ اور میاں صاحب دہلویؒ (حضرت مولانا نذیر حسین صاحب بہاری ثم الدہلوی) کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ممدوح کی نظرِ انتخاب حضرت میاں صاحب پر پڑی اور اپنے اس جذبہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا "کہ قرب و جوار کے سبب سے آپ پر مراحق ہے۔ حاضر ہو کر استفادہ کرنا چاہتا ہوں، پر شرط یہ ہے کہ صحاح ستہ اور جلالین ایک ہی سال میں ختم ہوں اور قرآۃ بھی میں ہی کروں گا۔ میاں صاحب نے غایتِ مسرت و انبساط کے ساتھ ہمت افزا جواب سے سرفراز فرمایا اور تمام شرائط کو حسنِ قبول عطا فرما کر اپنے والانامہ کو " السعی منی والاتمام من اللہ " سے مزین فرمایا۔ دہلی میں رفقائے درس میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کے علاوہ کئی اور ممتاز طلبہ تھے۔ دہلی سے مراجعت کے بعد حج کے لئے روانہ ہو گئے، سال ڈیڑھ سال قیام کے بعد واپسی میں بمبئی سے ایک پریس ساتھ لیتے آئے اور اپنے گاؤں ہی میں قلمی غیر مطبوعہ نسخوں کی اشاعت میں لگ گئے چنانچہ ذم التاویل لابن قدامہ، تائید مذہب السلف اور ابو داؤد مع شروح و حواشی اور بروایت بعض تفسیر ابن جریر طبری کے کچھ اجزا اسی پریس میں طبع ہوئے مگر بعد میں ایک نو مسلم کے حوالہ کر دیا کہ کسبِ معاش کا سلسلہ ہو جائے،

مولانا عبداللہ غزنوی کے پاس جب بیعت کے لئے پہنچے تو مولانا غزنوی نے فرمایا کہ شما در

اشنا راہ بودی کہ مرا الہام شد کہ ع مژدہ باد اکہ مسیحا نفسے می آید، (تعجیل) از دست شماعت اشاعت توحید و سنت بسیار خواہد گشت ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دولت اور اس کا صحیح مصرف | اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دھن دولت سے بھی نوازا تھا اور اس نعمت سے پورا فائدہ اٹھایا چنانچہ ہزاروں کارہائے خیر کے علاوہ خود ایک اعلیٰ مدرسہ کے بانی اور اس کے سارے اخراجات کے کفیل تھے، حدیث کے طلبہ یمن، نجد، حجاز، عراق سے برابر آتے رہتے تھے۔ خراسان کے مولوی عبداللہ صاحب مسلسل تین سال تک مقیم رہے، ان معزز مہمانوں کا مولانا کو بہت خیال رہتا تھا ان کی معمولی تکلیف سے بے چین ہو کر تڑپ جاتے تھے آم کے موسم میں روزانہ ٹوکریوں سے طلبہ کے کام و دہن کو نوازتے رہتے تھے، رمضان المبارک میں من، ڈیڑھ من آٹے کی شیرمال، آبی اور خصی کا گوشت قرب و جوار کے نادار مفلس لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔

کتب خانہ | مولانا کا علمی ذوق تو ہندوستان ہی میں نکھر چکا تھا، حجاز کے کتب خانوں نے ایک نیا اثر ڈالا، اور اب مولانا ہمہ تن قلمی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے، جو کچھ روپیہ جاتا تھا سب کتابوں ہی پر بے دریغ خرچ کرنے لگے اور خود عسرت کی زندگی وہاں بسر کرنا قبول کیا چنانچہ تفسیر ابن کثیر پر گیارہ سو اور تفسیر ابن جریر طبری پر ۲۲ سو روپے خرچ ہوئے، مولانا کا قیام تو مکہ معظمہ ہی رہتا تھا لیکن کتابیں مدینہ منورہ میں بھی نقل ہوتی تھیں، اوسطاً ڈیڑھ سو وراق روزانہ کام پر مامور تھے، حجاز پر اس وقت ترکوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ شکایت پہنچائی گئی کہ کتب خانوں میں ہلڑ مچا ہوا ہے، تفتیش ہوئی اور ناظم کتب خانہ سے جواب طلب کیا گیا۔ جواب دیا کہ اب تک سبعہ معلقہ اور حماسہ اور اس کے شروح و حواشی ہی کے دل دادہ زیادہ تر کتب خانہ سے استفادہ کیا کرتے تھے لیکن اس ہندی نوجوان جیسا صاحب ذوق اور ستھرا مذاق کا اب تک میری نظامت میں کوئی نہیں آیا ہے، تفسیر و حدیث سے والہانہ عقیدت اور اس پر جان و مال دونوں نچھاور کرتا ہے اور انھی کی وہ نقل لیتا ہے سلطان اس بیان سے بہت متاثر ہوئے اور ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچانے کا حکم صادر کیا اور مولانا سے ملنے کی خواہش کی مگر مولانا کی افتاد طبع ایسی تھی کہ ٹال گئے اور ملے نہیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ مولانا نے اپنے کتب خانہ پر صرف کیا

پٹنہ کے مشہور مشرقی کتب خانہ کے بانی مسٹر خدا بخش سے مولانا کے خوش گوار تعلقات اور گہرے مراسم تھے اور ایک ہی وضع سے ۱۵، ۱۶ سال تک نبھایا۔ خاں صاحب وکیل تھے اور ان کو کتابوں کے جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ پر مولانا کی رہنمائی اگر انھیں حاصل نہ ہوتی تو اتنی بڑی کامیابی مشکل سے ہو سکتی تھی۔ نادر کتابوں کے ذوق میں اضافہ اور ان کی نشان دہی میں بہت زیادہ مشورہ مولانا ہی نے دیا اور اس طرح نادر مخطوطات کا ذخیرہ ہو گیا۔

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ

"حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا یہاں جمع ہو گیا ہے شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا۔"

لیکن اس کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو گیا اور اب بہت مختصر تعداد میں ہے۔[۱]

مولانا گرچہ سلفی اور اہل حدیث تھے مگر فقہ سے بد کتے نہیں تھے بلکہ اس سے طبعی مناسبت تھی۔ صوبہ کے مشہور شاعر علامہ آزاد نے اپنے ایک قصیدہ میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے ؎

۱؎ جس کی فہرست حسب ذیل ہے۔ اکثر و بیشتر جدید الخط ہے

ابن تیمیہ الحرانی رح۔ التسعینیہ [۱] ۔ بغیۃ المرتاد [۲] ۔ مجموعہ رسائل [۳] جس میں آٹھ رسالے ہیں رسالہ بعلبکیۃ [۱] رسالہ [۲] فی قولہ تعالیٰ سبحان اللہ بعد عسر یسرا رسالہ [۳] فی الکلام علی قل یا ایہا الکافرون [۴] قواعد الاسترشاد فی الفرق بین التوحید والالحاد رسالہ [۵] فی الرد علی النصاری رسالہ [۶] فی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم حکایۃ عن ربہ عز وجل ما ترددت فی شئ انا فاعلہ ترددی عن قبض نفس عبد المومن الخ رسالہ [۷] فی العبادات البدعیۃ والعبادات الشرعیۃ رسالہ [۸] فی الرد علی النصاریٰ۔ ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا کہ اذا کان المسلمون مقلدین والنصاری مقلدین والیہود مقلدین فکیف وجہ الرد علی الیہود والنصاری الخ جواب [۱] بڑی دھوم دھام سے دیا ہے جو ان کا خاصہ ہے یعنی ھذا القائل کاذب ضال فی ھذا القول الخ [۲] اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفۃ اصحاب الجحیم۔ منہاج الاعتدال [۷] (جس کا مشہور نام منہاج السنۃ ہے) مسالک الحج [۸] کتاب الاستغاثہ [۹] کتاب العقل والنقل [۱۰] بیان الہدی من الضلال فی امر الہلال۔ ابن قیم حادی الارواح [۱] الطرق الحکمیۃ [۲] مدارج السالکین [۳]

۴؎ اقسام القرآن ۵؎ زاد المعاد ۶؎ ملخص کتاب بدائع الفوائد

۷؎ اغاثۃ اللہفان ۸؎ بدائع الفوائد

۹؎ الصواعق المرسلہ وغیر ذلک۔

فخرِ اقران و اماثل ذاتِ او   ایں چنیں ذاتے دریں ایام کو؟

عالمِ فرزانۂ دورِ زماں   ہم فقیہ و ہم محدث بے گماں

یہی وجہ ہے کہ مولانا کے ہاں کتبِ فقہیہ کا بھی انبار لگا ہوا ہے[1]۔

مولانا کا کتب خانہ نایاب کتابوں کے ذخیرہ کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہم کو مولانا کی علم دوستی کی قدر کرنی چاہیے کہ کس طرح انھوں نے ان کتابوں کی حفاظت کی۔

اب ہم مختصر طور پر ان نادر کتابوں کی فہرست پیش کرتے ہیں

سنن دارقطنی ۔ نسخہ ناتمام مگر نہایت عتیق و قدیم الخط اور صحیح ہے، تقریباً ۲۲ حفاظِ حدیث و محدثین کرام کے دستخط ثبت ہیں منہم الحافظ[1] ابو الحجاج بن یوسف الدمشقی ۔ الامام[2] عبد الرحیم بن الحسین العراقی حافظ[3] ابن حجر عسقلانی، الشیخ[4] عبید اللہ بن عمر العجمی، الامام[5] عبد المومن بن خلف الدمیاطی ۔ فخر[6] المتاخرین الشیخ الصلح الفلانی ۔ اس کے علاوہ اور بھی خصوصیات کا حامل ہے۔ سنن دارقطنی کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی تصحیح کے وقت شکر الواں کا بھی یہ نسخہ تھا۔

شرح الفیۃ الحدیث للعراقی ۔ پوری کتاب الامام عبد الرحیم بن الحسین العراقی کے قلمِ مبارک سے ہے۔ آخری عبارت ملاحظہ ہو۔ واجزت لکل من سمع منی الارجوزۃ المذکورۃ او بعضہا ان یروی عنی جمیع ہذا الشرح علیہا وجمیع ما یجوز لی وعنی روایتہ قالہ وکتبہ مولفہ عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن العراقی فی التاریخ المذکور ثانیاً۔

شرح سنن ابن ماجہ للحافظ مغلطائی م ۷۶۲ھ الجزء الثانی والثالث افسوس کہ شرح پوری نہ ہو سکی ورنہ بقول حافظ سخاوی ولو اکمل لعم النفع بہ، جلد ثانی پر تین مہریں ہیں، ایک میں ہے (عبدہ سید موسیٰ جیلانی) مالکہ سید عابد شاہ جیلانی ثم انتقل بالشراء الصحیح الی النوا

---

[1] مثلاً فتح القدیر لابن الہمام ۔ غایت خوشخط خط باریک ۔ فتاویٰ عالمگیری چار پانچ مہریں اس پر ثبت ہوئی ہیں ۔ رمز الحقائق وتبیین الحقائق للزیلعی ۔ اور شرح کنز الدقائق ۔ ارکان اربعہ بحر العلوم ۔ الاقناع فی حل الفاظ ابی شجاع ۔ شرح متن ابی شجاع الاصبہانی فی فقہ الشافعی ۔ مختارات النوازل ۔ رسالہ فی فقہ الاحناف ۔

الممدوح الخاتم۔ از کتب خانہ میاں محمد اکبر خاں بکتب خانہ سرکار حضور فیض گنجور مدام داخل ماند۔

جلد ثالث پر چھ مہریں ہیں ایک میں وہی (عبدہ سید موسیٰ جیلانی ۱۱۵۳) ہے۔ قدیم الخط ہے۔ یہ کتاب کسی زمانہ میں رہن رکھی گئی تھی۔ مندرجہ ذیل عبارت ہے۔ ملکہ وما قبلہ بالشراء القاضی عبد الباقی البخاری الوصی الشرعی علی متروکات عبد الرحیم اللاہوری لغیبۃ ورثتہ وہو من جملۃ الکتب المرہونۃ عند الشیخ بدر الدین الہندی بامر یوسف آفندی نائبۃ المذکور ببیعہا فاشتریت منہ لجانبا منہا علی ید محمد البزعی وکتب لی بہا حجۃ شرعیۃ وتسلم الثمن منی الافندی وذلک فی موسم سنتہ ؟

تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر۔ اس پر حافظ ابن حجر م ۸۵۲ کے ہاتھ کی بھی تحریر ہے۔ تین جلدوں میں ہے جلد اول پر یہ عبارت نظر آتی ہے۔ ھذا الکتاب الجلیل یسمی تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الشرح الکبیر وھو کتاب عظیم جدا حقیق بان یصرف العمر النفیس فی قرائتہ واقرائہ وخصوصا ھذہ النسخۃ بحسن خطہا وتمام ضبطہا وکتابۃ المؤلف علیہا بخط یدہ الکریمۃ فالحمد للہ علی ما اولانا مولانا نسألہ تعالیٰ ان یصلح آخرتنا واولنا بمنہ وفضلہ وکرمہ آمین۔ پھر آخر جلد میں یہ عبارت ہے

الحمد للہ بلغ السید الشریف الامام العلامۃ تاج الدین عبد الوہاب جمال الطائفۃ صاحب ھذا الکتاب قراءۃ متقنۃ علی ملخصہ احمد بن علی بن حجر فی مجالس عدیدۃ آخرہ فی السابع من شہر اللہ المحرم عام تسعۃ...... وعارض بالاصل الذی ...... فصح ان شاء اللہ واذنت لہ ان یروی عنی جمیع الکتاب وسائر ما یجوز عنی روایتہ۔ حامدا مصلیا مسلما۔

پھر اس کے نیچے یہ عبارت ہے ھذا خط مؤلفہ قدس اللہ روحہ

الجزء الثانی من المؤتلف والمختلف للدار قطنی۔ خط قدیم ہے۔ اس فن کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے۔ متعدد محدثین کے دستخط ہیں، باب الراء سے (رزیق وزریق والزریق)

باب الیاء (الیمن) تک ہے۔ یہ کتاب بھی کسی زمانہ میں رہن رکھی گئی تھی۔

الجزء الثانی من کتاب الکشف لمشکل الصحیحین لابن الجوزیؒ۔ خط قدیم ہے ہر ہر صحابی کی مشکل کو حل کیا ہے

کشف المشکل من مسند عبد اللہ بن زید الانصاریؓ

فی الصحابۃ رجلان من الانصار یقال لکل واحد منھما عبد اللہ بن زید وانما یفرق بینھما بالاجداد فاحدھما ابن ثعلبۃ وھو الذی رای المنام فی الاذان وھو من اھل بدر۔ والثانی ابن عاصم وھو صاحب ھذا المسند ولم یشھد بدرا وجملۃ ما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمانیۃ واربعون حدیثا اخرج لہ منھا فی الصحیحین ثمانیۃ کل ۱۲۰ اوراق ہیں۔

طبقات القراء للحافظ الذھبی م ۷۴۸ھ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع ہوتا ہے نسخہ بہت ہی قدیم ۷۴۶ھ بخط مؤلف حافظ ذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہے۔ اس کا نسخہ پٹنہ لائبریری اور پیرس کے کتب خانہ میں بھی ہے۔

مشارق الانوار علی صحاح الآثار مما یشکل من الامھات الثلاث للقاضی عیاضؒ خط قدیم ہے۔ ۲۶۰ اوراق ہیں۔ الامہات الثلث سے مراد۔ بخاری[1] و مسلم[2] و موطا امام[3] مالک ہے، اس کتاب کی احادیث کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ محدثین میں یہ قول مشہور ہے کہ ھذا الکتاب یساوی ثقلہ ذھبا۔ یورپ میں طبع بھی ہو چکی ہے

بخاری شریف غایت خوشخط، قلم نہ جلی نہ خفی بلکہ اوسط۔ مکمل

الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجرؒ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے پیش نظر جو نسخہ تھا اُس کے علاوہ ایک اور نسخہ بھی فکر انواں کا یہ نسخہ بھی تھا جس کا تذکرہ مقدمہ میں موجود ہے

فتح الباری لابن حجر العسقلانی مکمل (۱۴ جلد) سنہ کتابت مختلف ہے۔ بعض خود حافظ ابن حجر کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ہے اور بعض جلد ۹۳۷ھ اور بعض ۸۷۸ھ اور بعض

کی کتابت ۸۶۹ھ میں ہوئی ہے اور الجزء الاول جدید الخط ہے۔

الجزء الاول من شرح المصابیح للزینی رح ناقص۔ خود شارح زین العرب رح کے خط سے پوری کتاب ہے۔ اسی کے ساتھ علامہ توربشتی رح کی شرح کا ایک ٹکڑا بھی شامل ہے۔ ورق ۱۳۵۔

الجزء الثانی من الدیباجہ فی شرح سنن ابن ماجہ۔ ابواب الطہارۃ وسننہا الی باب لزوم المساجد وانتظار الصلوٰۃ، سرِ ورق پر ایک تحریر ہے جو قدیم ہے مگر حک و فک کی وجہ سے پڑھا نہیں جاسکا۔

شرح مشکوٰۃ المصابیح للزینی رح ناقص

کتاب منہل شرح مصابیح للعلامہ غیاث الدین محمد بن محمد الواسطی المتوفی ۸۱۶ھ مکتوبہ ۹۴۰ھ عدد اوراق ۳۴۲۔

مطر النجاح مقدمہ شرح صحیح مسلم بن الحجاج للشیخ ولی اللہ الفرخ آبادی م ۱۲۴۹ھ۔

مولانا شیخ ولی اللہ رح کا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں

اما بعد می گوید بندہ محمد ولی اللہ بن احمد علی حسینی فرخ آبادی کہ ایں بندہ را در ۱۱۹۱ھ یک ہزار ویک صد نود ویک ہجریہ کہ شرف وصول بحرمین شریفین مکہ مبارکہ ومدینہ طیبہ حاصل گشت ویک سال وچند ماہ دولتِ اقامت ومجاورت آں امکنہ شریفہ دست داد، منجملہ سعادت کہ دراں ایام بحصول پیوست یکے قرأت وسماع کتب ستہ حدیث است بر شیوخ کرام ومحدثین عظام انجا و اجازت یافتن بروایت وحدیث آنہا خصوصًا وبدیگر کتب قرأۃ وتفسیر وحدیث وفقہ وتصوف عمومًا وبعد عود از سفر حجاز کہ آخر ۱۱۹۶ھ (؟) یک ہزار ویک صد ونود وشش بفرخ آباد رسیدم وطرح اقامت دریں بلدہ انداختم بنظرِ صحت وحُسنِ وجودت کتاب صحیح مسلم ہمیشہ بدل می گذشت کہ بریں کتاب شرحے نویسم بزبان فارسی کہ یک گونہ ازمخ والبسط باشد از ترجمہ شیخ محب اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق

بن شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہم پس در ماہ جمادی الاولی ۱۲۲۶ھ یک ہزار دو صد و بیست و چہار
دریں شرح آغاز نمودم و آنزا بمطر نجاج موسوم ساختم الخ پھر امام مسلم تک سلسلہ سند بیان کیا ہے
اس کے بعد مختصر طور پر اپنی سوانح عمری و سلسلہ نسب جو شاہ ناصر تذدی کے واسطہ سے حضرت علی
کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔ بیان کیا ہے۔ پھر اکتسابِ علوم و اجازتِ حدیث کا حال لکھا ہے۔
زبان بہت صاف اور واضح ہے۔ پیچیدگی و اغلاق مطلق نہیں ہے رواۃ کے تراجم بھی لکھتے گئے ہیں

مسند ابو داؤد الطیالسی کامل۔ جدید الخط

جامع الاصول یہ اس نسخہ سے منقول ہے جو مؤلف پر پڑھا گیا تھا۔ قدیم الخط ہے

تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف للمزی ۔ بوسیدہ اور استفادہ ناممکن اس لئے
اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا جاتا ہے۔

جواب ابی مسعود محمد بن ابراھیم بن عبید اللہ دمشقی ، دار قطنی کے
صحیحین پر کچھ الزامات و تتبع ہیں، ابو مسعود دمشقی نے مسلم کے الزامات کا جواب دیا ہے۔ یہ صرف
۲۴/ حدیثوں کا جواب ہے۔ دمشقی، دار قطنی کے معاصر ہیں۔ ان کی وفات ۴۰۰ھ کے بعد ہوئی ہے

تبصرۃ المبتدی و تذکرۃ المنتہی لابن الجوزی جدید الخط یعنی ۲۹۶ھ کا مکتوبہ
ہے۔ کتاب نو طبقوں پر مشتمل ہے یہ صرف اوائل کے چار طبقے ہیں

کتاب الوجیز للغزالی خط عمدہ ہے ۹۵۶ھ میں ابو العلاء احمد بن موسیٰ الزنجانی نے
اپنے لئے اصبہان سے اسے نقل کرایا تھا۔

شرح الوجیز للرافعی جدید الخط کتابت ۱۳۰۰ھ

فتح العلام لشرح الاعلام باحادیث الاحکام ، لقاضی القضاۃ شیخ
ابو یحیی زکریا الانصاری الخزرجی مرقومہ ۱۱۹۹ھ۔

التذکرۃ فی کشف احوال الموتی و امور الآخرۃ مؤلفہ محمد بن احمد الانصاری
القرطبی و کتاب احوال القبور و معرفۃ

احوال اہلہا الی یوم النشور لابن رجب الحنبلی ۔ وشرح الصدور فی احوال الموتی والقبور للسیوطی

مکتوبات حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر قدس اللہ سرہ ۔ جامع مکتوبات عمدۃ الآفاق حضرت سید حاجی عبد الرزاق رح کاتبہ و مالکہ فقیر سید علی بن شاہ دائم اشرفی خاتمہ بتاریخ بستم شہر رجب روز جمعہ بعد از نماز سنہ ۱۱۱۱ھ ۔ ۲۰۲ اوراق

مناقب رزاقیہ مصنفہ ملا نظام الدین سہالوی ۔ دربیانِ احوال ومناقب حضرت شاہ عبد الرزاق بانسوی قدس سرہ ۔

ارشاد الاخوان از تالیفات حاجی اشرفی سمنانی مرید سلطان الاولیاء مخدوم عالم شیخ علاؤ الدین قدس سرہ ۔ ناقص

مکتوبات صد و چند حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیی بہاری رح

ترجمہ مجسطی ۔ مجسطی کہ مشکل ترین کتب علم ہیئت است ۔ مترجمہ بالفارسیہ ابو الخیر المعروف بخیر اللہ المخاطب بخیر اللہ خاں سلمہ الرحمن المتخلص بمہندس بن لطف اللہ غفر لہ ۔ فارغ شدم از تحریر ایں شرح وتسوید ایں وتصحیح ایں روز دوشنبہ در اوائل ذی قعدہ سنہ نہصد وبیست ویک از ہجرۃ نبویہ ۔ ومن مترجم عاصم ابو الخیر عرف خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس بن احمد تمام کردیم ایں ترجمہ را بازوائد چند بتاریخ شب بست وچہارم محرم روز یکشنبہ سال یک ہزار ویک صد وشصت ہجریہ مطابق سال بست ونہم جلوس محمد شاہ پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ بعد ازیں نقل کرد وبقید تمام آورد ایں ترجمہ مجسطی را بحسب فرمودہ حضرت رائے صاحب روز جمعہ تاریخ بست وپنجم شہر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۹ سنہ ہجریہ نبویہ وسنہ عالمگیر ثانی بادشاہ غازی سنہ ۲ بدست فقیر حقیر محمد مکرم تبریزی ثم الدہلوی ۔

حیوۃ الحیوان للدمیری غایت قدیم، کچھ اجزاء جدید الخط ہیں۔

کتاب المتبع فی شرح اللمع ۔ اللمع نحو میں ابن جنی کا ایک رسالہ ہے، یہ اسی کی شرح

علامہ عکبری کے قلم سے ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی سیکڑوں کتابیں ہیں مثلاً تاریخ صغیر للبخاری حاشیۃ الطیبی علی الکشاف۔ حاشیہ علی البیضاوی لعصام الدین۔ شرح رسالہ قوشجیہ از مصلح الدین لاری در علم ہیئت۔ رسالہ علامہ قوشجی در ریاضی بزبان فارسی۔ رسالہ فی تحقیق مسئلۃ الجعل لحافظ امان اللہ بنارسی۔ نسخہ فیروز شاہی، رسالہ بہاؤالدین عاملی فی علم الھیئۃ۔ شرح نخبۃ الفکر۔ کتاب الجمع بین الصحیحین للحمیدی۔ تہذیب التہذیب۔ لابن حجر۔ المحلی لابن حزم۔ کتاب المقنع فی معرفۃ موسوم مصاحف اہل الامصار۔ تفسیر کشاف۔ لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطی۔ مثنوی مولانا روم۔ قاموس معالم التنزیل للبغوی۔ احیاء العلوم للغزالی۔ فتح المغیث للسخاوی لسان المیزان لابن حجر۔ میزان الاعتدال للذہبی۔ شمائل ترمذی مرقومہ ۹۲۰ھ۔ شرح سفر السعادۃ للشیخ عبد الحق۔ الفیہ للعراقی۔ فتوحات مکیہ۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ جامع الصغیر للسیوطی۔

وحی الٰہی

تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم اے۔ رفیق ندوۃ المصنفین

وحی اور اس سے متعلقہ مباحث پر محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر ایسے دل پذیر و دل کش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سماجاتا ہے اور حقیقتِ وحی سے متعلق تمام خلشیں صاف ہوجاتی ہیں۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، کتابت نفیس ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی، طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ قیمت عہ، مجلد للعہ

تصانیف اشعری

از

جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم۔ اے۔
استاذ السنۂ عربی و فارسی الہ آباد۔ یونیورسٹی

(۲)

(۵۰) "فی المجتهاد الاحکام" اجتہاد الاحکام کی ترکیب اضافی سے کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اصل میں، فی الاجتہاد فی الاحکام ہے۔ مسٹر میکارتھی نے کمالِ صحت کے ساتھ یہ نام دیا ہے۔

(۵۷) "اس مسئلے پر کہ کسی چیز کا کر سکنا، اس کے مقابل نہ کر سکنے سے بالکل الگ چیز ہے"۔ کسی چیز کا کر سکنا اور اس کے مقابل کا نہ کر سکنا بالکل ایک ہی بات ہے۔ دو الگ چیزیں کیسے ہوتیں؟ کسی چیز کا مقابل نہ کر سکنے سے اس چیز کا کر سکنا لازم آتا ہے۔ مترجم صاحب نے عجیب خلط مبحث کر دیا ہے، مسٹر میکارتھی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز سے عاجز ہونا اس کی ضد سے عاجز ہونے سے مختلف ہے۔ مسٹر میکارتھی نے موضوعِ کتاب کی مزید صراحت کی جس کا ترجمہ ہے" اور یہ کہ عجز صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے جو موجود ہو اور اس کتاب میں ہم نے اپنے ان اصحاب کی حمایت کی ہے جو اس نظریہ کے قائل ہیں"۔ اس عبارت سے اجمالی طور پر عجز کے بارے میں متکلمین کا اختلاف اور امام صاحب کے مسلک کا پتہ چلتا ہے، مترجم صاحب نے اس بحث کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

(۵۸) "الاستقصاء لجامع اعتراض الدهريين وسائر اصناف الملحدين" اوّل تو مسٹر میکارتھی نے لفظ جمیع لکھا ہے جسے مترجم صاحب نے جامع بنا دیا۔ ابن عساکر نے امام صاحب کے الفاظ میں موضوع کی تصریح بھی کی ہے جس کا مطلب ہے "ہم نے اس کتاب میں دہریہ کے تمام ان اعتراضات کا ذکر کیا ہے جو موحدین کے اس قول پر وارد ہوتے ہیں کہ حوادث کے لئے کوئی اوّل

ہے اور یہ کہ ان کا وجود بغیر کسی محدث کے صحیح نہیں اور یہ کہ محدث ایک ہے اور ہم نے ہر ایک اعتراض کا جواب دیا ہے اور نیز اس کتاب میں ہم نے نظریۂ قدمِ اجسام کے متعلق دہریہ کے دلائل کا ذکر کیا ہے۔" مسٹر میکارتھی نے اس کا ترجمہ بھی کیا ہے، کیا اچھا ہوتا اگر مترجم صاحب موضوعِ کتاب کی تصریح بھی کر دیتے تاکہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا۔

(۵۹) "مادیین کے رد میں، جو اجسام کے قِدَم کے قائل ہیں" خود امام اشعری نے موضوع کی صراحت کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ دہریہ کس بنیاد پر نظریۂ قدم اجسام کے قائل ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر اجسام بجائے قدیم ہونے کے حادث ہوتے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو پیدا کرنے والے نے ان کو اپنی ذات کے لئے پیدا کیا یا کسی اور سبب سے، اور ان دونوں شکلوں میں ذات باری کے ساتھ سوءِ ادبی لازم آتی ہے، مسٹر میکارتھی نے اس کا بھی ترجمہ کیا ہے اور قِدَمِ اجسام کا مسئلہ اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں، اس کی اصل یونانی فلسفہ ہے، قدیم حکمائے یونان میں سے ایپکورس اس کا قائل تھا اور اس کے دلائل بھی وہی تھے جو آج کل دہریہ پیش کرتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو

(History of Philosophy, P.103 by Weber.)

(۶۰) "داؤد بن علی الاصبہانی کے رد میں، اعتقاد کے بعض مسائل کے رد میں" یہاں پھر ترجمہ سے دونوں ٹکڑوں کا ربط ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ question of belief کا ترجمہ اعتقاد کا مسئلہ ہوا نہ کہ اعتقاد کے بعض مسائل۔ ابن عساکر نے امام صاحب کی یہ عبارت نقل کی ہے نقضنا به اعتراضا على داؤد بن علی الاصبهانی فی مسئلة الاعتقاد یعنی اس کتاب میں ہم نے اس اعتراض کی تردید کی ہے جو داؤد نے مسئلۂ اعتقاد میں ہم پر وارد کیا ہے تعجب ہے مسٹر میکارتھی اعتراض کا ترجمہ argument سے کرتے ہیں۔ داؤد اصبہانی فرقۂ ظاہریہ سے تعلق رکھتا تھا۔ امام صاحب کا اس سے اختلاف کئی باتوں میں ہے، اوّل تو یہی مسئلۂ اعتقاد، دوسرے اجماع اور قیاس جن کی حجیت کا وہ منکر تھا تیسرے یہ کہ وہ بجز چند مخصوص احادیث کے باقی کا منکر تھا۔

(۶۱) "تفسیر القرآن والرد علی من خلق البیان من اهل الافک البرهان" کتاب کا نام اس طرح بدلا گیا کہ جس سے کفر کا احتمال لازم آتا ہے، مسٹر میکارتھی نے خالف البیان من اهل الافک

والبهتان لکھا ہے۔

(۶۵) "رویتِ سعیدہ پر: اس میں ہم نے جبائی کے اقوال کی تردید کی ہے جو محمد بن عمر الضیمری نے جمع کئے۔" یہاں پر Vision of God کا ترجمہ رویت سعیدہ سے کیا گیا جس کی کوئی سند نہیں۔ مسٹر میکارتھی نے رومن میں محمد بن عبد الضیمری لکھ کر s کے نیچے ایک نقطہ بھی لگا دیا ہے جو ص کی علامت ہے، مترجم صاحب نے ص پر ایک فرید نقطہ لگا کر ض بنا دیا جو غلط ہے۔ علاوہ ازیں جبائی کے اقوال کی تردید نہیں کی گئی بلکہ اس نے امام صاحب پر جو اعتراضات کئے تھے اُن کی تردید کی گئی ہے، اقوال اور اعتراضات میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ اسی طرح محمد بن عبد الصیمری نے جبائی کے اقوال جمع نہیں کئے جیسا کہ اردو ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ جبائی نے اپنی کتابوں میں مختلف مقامات پر جو اعتراضات کئے تھے ان کو جمع کیا اور امام صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے ان اعتراضات کو غلط ثابت کیا۔ یہ تمام باتیں مسٹر میکارتھی کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتی ہیں۔

(۶۶) "الجواهر فی الرد علی اهل الزیغ والمنکر" جواہر کہاں سے آیا، اصل میں جوہر ہے، علاوہ ازیں منکر کا قافیہ بھی جوہر ہوتا ہے نہ کہ جواہر۔

(۶۷) "جبائی کے سوالوں کے جواب میں" کس بارے میں سوالات کئے گئے تھے اس کا پتہ نہیں چلتا، حالاں کہ مسٹر میکارتھی نے لکھا ہے کہ وہ سوالات نظر و استدلال اور اُس کے شرائط کے بارے میں کئے گئے تھے۔ علم کلام میں نظر و استدلال ایک اہم مبحث ہے، امام رازی نے محصل کے پہلے ہی رکن میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اس سے امام صاحب کے تبحرِ علمی کا پتہ چلتا ہے کہ خود جبائی جو آپ کا استاد تھا ایسے اہم موضوع پر آپ سے سوالات کرتا تھا۔ مترجم صاحب غالباً جلدی میں تھے یہاں پر ایک کتاب کا نام ہی چھوڑ گئے، مسٹر میکارتھی نے کتاب ۶۹ کا نام کتاب فی مقالات الفلاسفة خاصة دیا ہے جس میں بالخصوص فلاسفہ کے اقوال و آراء کا ذکر ہے۔ اسی طرح امام صاحب نے فنِ مقالات میں تین کتابیں لکھیں ایک تو یہی ہے۔ دوسری مقالات الاسلامیین اور تیسری جمل المقالات ہے۔

(۶۹) "کتاب فی الرد علی الفلاسفہ اس میں تین مقالے ہیں، ابن قیس، مناذری کے رد میں، ہیولیٰ اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں، اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں"۔ غالباً کاتب صاحب نے مادّی کو بدل کر مناذری بنا دیا، علاوہ ازیں ارسطو کے صرف خیالات کے رد میں نہیں ہے بلکہ اس کے دلائل کی تردید ہے۔ ابن عساکر نے امام اشعری کی مزید عبارت نقل کی ہے وبینا ما علیھم فی قولھم باضافۃ الاحداث الی النجوم وتعلیق احکام السعادۃ والشقاوۃ علیھا احداث سے یہاں پر مراد حوادث ہیں نہ کہ ایجاد، مگر مسٹر میکارتھی اس کا ترجمہ Production سے کرتے ہیں، نیز فی السماء والعالم کا ترجمہ concerning the heavens and the world سے کیا ہے، حالاں کہ یہ ارسطو کی کتاب کا نام ہے جس میں حوادث کو تاروں کی طرف منسوب کرنے اور ان سے سعادت و شقاوت کے احکام مستنبط کرنے پر دلائل دیتے ہیں، امام صاحب نے ان دلائل کی تردید کی اور بتایا کہ اس قول کے ماننے میں کیا کیا اعتراضات ان پر وارد ہوتے ہیں (الفہرست لابن ندیم، تاریخ الحکما للقفطی) طبیعات ارسطو کی سات کتابوں میں سے ایک کا نام کتاب السماء والعالم ہے۔

(۷۱) " اسکافی کی کتاب المضاہات کے رد میں، قدر کے عقیدہ کے سلسلے میں"۔ اس عبارت سے اوّل تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ المضاہات کا کیا موضوع تھا۔ دوسرے دونوں ٹکڑوں میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا اور پھر قدر کے عقیدہ میں کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ اختلاف تو قدر کے مسمّٰی کے بارے میں تھا مسٹر میکارتھی کی عبارت سے صاف طور پر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اسکافی کی کتاب المضاہات جو لفظ قدر کے اطلاق کے بارے میں ہے اس کی تردید میں یہ کتاب ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ معتزلہ اور قدریہ کہتے تھے کہ ہم قدر کے منکر ہیں اور تم لوگ اس کے قائل ہو لہٰذا قدریہ کے نام کے مصداق تم ہوئے نہ کہ ہم۔ المضاہات کا انگریزی ترجمہ الفرائد الدریہ میں conformity اور likeness دیا ہے۔ تعجب ہے مسٹر میکارتھی نے اس کو Rivalry سے ترجمہ کیا ہے۔

(۷۳) "کتاب فی معلومات اللہ ومقدوراتہ" اردو ترجمہ میں صرف نام دیا ہے مگر مسٹر میکارتھی نے موضوع کی بھی تصریح کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ابو الہذیل کی تردید میں لکھی گئی جو اس بات کا قائل تھا کہ خدا کا علم اور اس کی قدرت محدود ہے، امام صاحب کے نزدیک خدا کا علم اور قدرت لامتناہی اور لامحدود ہے۔

(۷۸) "حارث الوراق کے رد میں، صفات الٰہی کے سلسلے میں اور ابن راوندی کے رد میں" عبارت ایسی گنجلک ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین مختلف باتوں میں یہ کتاب ہے، حالانکہ مسٹر میکارتھی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حارث الوراق نے صفات کے بارے میں ابن راوندی کی جو تردید کی ہے اس کے رد میں یہ کتاب ہے۔

(۸۰) "قیاس کے سلسلے میں" مسٹر میکارتھی لفظ vindication دیا ہے، اگر بجائے "سلسلے میں" کے صحیح لفظی ترجمہ کر دیا جاتا تو امام صاحب کا مسلک معلوم ہو جاتا، امام صاحب اور جملہ فقہائے احناف قیاس کو مثل قرآن اور حدیث کے ایک حجت شرعی مانتے ہیں مگر اہلِ حدیث اس کے منکر ہیں۔ غالباً یہ کتاب بغداد میں لکھی گئی جہاں اس وقت اہلِ حدیث کا زور تھا

(۸۳) "کتاب فی متشابہ القرآن" اس میں اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں شمار کر کے ان کا رد کیا ہے اور ابن الراوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے" ملاحدہ اور معتزلہ کو کس حیثیت سے ایک ہی زمرے میں شمار کیا اس کا پتہ نہیں چلتا حالانکہ مسٹر میکارتھی کی عبارت بتا رہی ہے کہ ملاحدہ اور معتزلہ دونوں متشابہ احادیث پر اعتراض کرنے میں شریک تھے، ابن الراوندی کی کتاب التاج کی تردید ایک علیحدہ کتاب ہے اس لئے کہ دونوں کے موضوع میں نمایاں فرق ہے، اصل کتاب کا موضوع متشابہ احادیث پر اعتراض کی تردید ہے اور کتاب التاج کا موضوع حسب تشریح امام اشعری (وھو الذی نصر فیہ القول بقدم العالم) نظریہ قدمِ عالم کی تائید تھی، لہذا اس کی تردید بھی اسی مسئلہ سے متعلق ہو گی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اگر یہ تردید کتاب فی

متشابہ القرآن کا ایک جز ہوتی تو نقض کے بعد فیہ کا لفظ آنا ضروری تھا۔

مسٹر میکارتھی نے اس کتاب کے لئے بھی علیحدہ نمبر نہیں قائم کیا، یہ غلطی غالباً اسی وجہ سے ہوئی کہ تبیین میں جو لفظ نقض آیا ہے اس کو بجائے مصدر کے فعل ماضی پڑھا گیا۔

(۸۷) "ابن راوندی کے رد میں، اس کے تواتر کی تردید کے رد میں"، مسٹر میکارتھی نے موضوع کتاب کی مزید صراحت کرتے ہوئے لکھا And dealing with the arguments relied upon by the opponents of tawatur.

یعنی اس کتاب میں ان دلائل سے بھی بحث کی گئی ہے جن پر مخالفین تواتر اعتماد کرتے ہیں، مترجم صاحب کی مختصر عبارت سے کتاب کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ابن فورک ایک اور کتاب کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام مسائل فی اثبات الاجماع ہے، تعجب ہے مسٹر میکارتھی نے اثبات القیاس کو تو ایک کتاب سمجھ کر اس کے لئے نمبر قائم کیا مگر اجماع سے متعلق کتاب کا محض لفظی ترجمہ کردیا اور اس موخر الذکر کتاب کو تواتر سے متعلق کتاب کا جزو سمجھا، حالاں کہ تواتر اور اجماع دو مختلف موضوع ہیں، اور اردو کے مترجم صاحب تو غالباً جلدی میں تھے انھیں اس کا ترجمہ کرنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔

(۸۹) "کتاب نقد شرح الکتاب"۔ یہاں بھی مترجم صاحب نے کتاب ۱۷ کی طرح نقض کو نقد لکھ دیا۔

(۹۰) "ابو الفرج مالکی اور اشعری کے درمیان علت الخمر پر مباحثہ"، مسٹر میکارتھی لکھتے ہیں "شاید یہ مباحثہ شراب کے جواز کے بارے میں ہوا ہوگا"، حالانکہ چاروں اماموں میں سے کسی کے یہاں بھی شراب کی حرمت میں اختلاف نہیں، البتہ اختلاف اس بارے میں ہے کہ شراب کی حرمت کا کیا سبب ہے، کیوں کہ بعض کے نزدیک نبیذ جائز ہے اور بعض کے یہاں ناجائز، اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ حرمتِ شراب کا سبب مختلف فیہ ہے۔ مترجم صاحب نے علت الخمر لکھ کر چھوڑ دیا۔ اردو محاورے میں علت الخمر استعمال نہیں ہوتا، اس کا مفہوم عام طور پر مے نوشی

کی لت سمجھا جائے گا۔

(۹۶) "ابو ہاشم کے سوالات کے جواب ہیں۔ یہ کتاب ابی مالح الطبری کی درخواست پر لکھی گئی"۔ مسٹر میکارتھی نے ابن ابی صالح لکھا ہے، کاتب صاحب صلح کو تو مالح کر سکتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ ابن کا لفظ ہی اڑا دیں۔

(۹۷) "رسالۃ لمحت البحث" یہ صحیح نہیں ہے۔ مسٹر میکارتھی نے رسالۃ الحث علی البحث لکھا ہے

(۹۸) "ایک رسالہ عقائد پر، اس بارے میں کہ آیا 'خلق' کا استعمال صحیح ہے۔ اس ترجمہ سے مفہوم ہی خبط ہو جاتا ہے۔

اول تو Faith کا اردو ترجمہ ایمان ہوا نہ کہ عقائد۔ دوسرے اختلاف خلق کے مطلق استعمال میں نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں کہ 'خلق' کا اطلاق ایمان پر کرنا صحیح ہے یا نہیں۔ چنانچہ مسٹر میکارتھی لکھتے ہیں. Is the term "creation" to be applied to it.

(۹۹) "سرحد کے آدمیوں سے کچھ سوال کئے گئے تھے، ان کے جواب ہیں، اہل الحق کے عقائد کے سلسلے میں"۔ آخر امام صاحب کو کیا پڑی تھی کہ سوال کیا گیا سرحد کے آدمیوں سے اور جواب یہ دے رہے ہیں۔ کیا امام صاحب سرحدی تھے؟ مترجم صاحب مسٹر میکارتھی کی عبارت سمجھنے سے قاصر رہ گئے حالاں کہ انھوں نے صاف لکھ دیا ہے کہ خود سرحد کے آدمیوں نے امام صاحب سے اہل الحق کے عقائد کے بارے میں سوالات کئے تھے ان کا جواب لکھ کر انھیں سرحدیوں کو بھیجا گیا جس کی تائید کتاب نمبر ۱۰۳ سے بھی ہوتی ہے، جس کے متعلق آگے چل کر خود مسٹر میکارتھی نے کہا ہے کہ یہ وہ کتاب نمبر ۹۹ ہے۔

(۱۰۴) "کتاب لامام"۔ یہ صحیح ہے کہ غریب کاتب بدنام ہوتا ہے اور مختلف القاب سے یاد کیا جاتا ہے، مگر کوئی کاتب ن کو بدل کر م نہیں کر سکتا۔ یہ مترجم صاحب ہی کی جدت طرازی معلوم ہوتی ہے، حالانکہ مسٹر میکارتھی نے کتاب الایمان لکھ کر انگریزی میں Book of Faith سے ترجمہ بھی کر دیا ہے۔

مسٹر میکارتھی نے کل ۱۰۶ کتابوں کی فہرست دی ہے جس میں سے چار کے نام الفاظ بدل کر دہرادئے گئے ہیں، ایک استحسان الخوض فی علم الکلام (۱۰۱) جو بعینہ رسالۃ الحث علی البحث (۹۷) ہے، دوسری رسالۃ کتب بہا الی اہل الثغر بباب الابواب (۱۰۳) جو بعینہ کتاب ۹۹ ہے، تیسری کتاب الایمان (۱۰۴) جو بعینہ کتاب ۹۸ ہے۔ چوتھی کتاب التبیین عن اصول الدین (۱۰۰) جس کا دوسرا نام کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ (۱۰۵) ہے، اوّل الذکر کے سوا باقی تین کتابوں کی تکرار کا خود مسٹر میکارتھی نے دبی زبان میں اعتراف کیا ہے، چنانچہ نوٹ میں تکرار کا اشارہ کرکے سوالیہ نشان لگادیا ہے۔ اب صرف ۱۰۲ کتابیں بچیں، اس میں سے کتاب ۱۰۲ قول جملۃ اصحاب الحدیث واھل السنۃ فی الاعتقاد غالباً کوئی مستقل کتاب نہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے کسی شاگرد نے بعد میں مقالات الاسلامیین سے یہ قول علیحدہ نقل کرلیا ہے، امام صاحب نے مقالات الاسلامیین جلد دوم میں جملۃ قول اصحاب الحدیث واھل السنۃ کے عنوان سے ایک علیحدہ باب قائم کیا ہے جو ۲۹۰ سے شروع ہوکر ۲۹۷ پر ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا مسٹر میکارتھی کی فہرست سے کل ۱۰۱ کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سب کی سب حافظ ابن عساکر کی تبیین میں موجود ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ مسٹر میکارتھی نے کتابوں کو نمبر وار ذکر کیا ہے اور تبیین میں نمبر نہیں دئے گئے۔ اس کے علاوہ ابن عساکر کی فہرست سے چار اور کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن کو مسٹر میکارتھی نے نظر انداز کردیا ہے، ایک وہ جو زمانۂ اعتزال میں صفات پر لکھی تھی اور بعد میں اس کا رد لکھا، دوسری وہ کتاب جو اس نئی والی کتاب کی تردید میں جسے زمانۂ اعتزال میں لکھا تھا، تیسری نقض کتاب التاج اور چوتھی [illegible]

دو کتابیں ایسی ہیں جن کا نام اگرچہ ابن عساکر نے فہرست میں نہیں دیا، مگر تبیین دیکھ کر ان کا پتہ چل جاتا ہے۔ اوّل کتاب الابانہ (۱۰۵) ہے، جس کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے، نیز بارہ صفحات (۱۵۲ — ۱۶۳) میں اس کا مقدمہ لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے۔ دوسری کتاب کشف الاسرار وھتک الاستار (۱۰۶) ہے، اس کا ذکر تبیین کے صفحہ ۳۹ پر موجود ہے، جس وقت امام اشعری نے جامع مسجد میں لوگوں کے سامنے اپنے ترک اعتزال کا اعلان کیا تو لوگوں کے سامنے منجملہ اور کتابوں کے یہ کتاب مذکور الصدر بھی پیش کی جس میں معتزلہ کے عقائد کی خرابیاں بتائی ہیں۔

آخر میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسٹر میکارتھی نے فہرست کے آخر میں لکھ دیا ہے کہ بہتر ہوگا اگر اس انگریزی ترجمہ کو عربی متن سے مقابلہ کر کے جانچ کر لی جائے۔ افسوس کہ بیدار صاحب نے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا ورنہ اس قدر شدید غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوتے۔

ندوۃ المصنفین کی تازہ ترین عظیم الشان کتاب

ترجمان السنہ جلد سوم

کئی سال کے انتظار کے بعد اس متبرک اور اہم ترین کتاب کی تیسری جلد شائع ہوگئی، یہ جلد پہلی دو جلدوں سے ضخامت میں بھی زیادہ ہے اور اس کے مباحث ومضامین بھی مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں، اس میں مسئلۂ قضاء وقدر کے تمام بابوں کے علاوہ، پوری کتاب الانبیاء بھی آگئی ہے، جس میں وحی اور نبوت ورسالت کے ایک ایک گوشے پر سیر حاصل کلام لکھا گیا ہے اور تمام متعلقہ احادیث کو نئے نئے عنوانوں کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کے حالات وواقعات صحیح اور مستند حدیثوں کی روشنی میں واضح کئے گئے ہیں، خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی کی خصوصیات سے متعلق تمام بحثوں کو عجیب وغریب انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ ان مباحث کے مطالعہ کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع ونزول کا مسئلہ آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے، یہ عظیم الشان جلد کم وبیش پانچ سو حدیثوں کے ترجمے اور تشریح پر مشتمل ہے۔ صفحات ۶۲۴، بڑی تقطیع قیمت دس روپے آٹھ آنے۔ مجلد بارہ روپے آٹھ آنے۔

ادبیّات

نذرِ آلمؔ

از

(جناب شارقؔ میرٹھی ایم اے)

"جناب آلمؔ مظفر نگری کو اُردو کے صاحب فن اساتذہ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے "نذرِ حکمت" کے عنوان سے ہز ایکسی لنسی علی اصغر حکمتؔ سفیرِ ایران کی غزل کے جواب میں فارسی کی ایک نہایت عمدہ غزل کہی ہے۔ یہ غزل آپ کے قابل قدر تازہ مجموعۂ کلام "سدرہ وطوبیٰ" میں شامل ہے۔ میں نے جس وقت اس غزل کو پڑھا وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور بے ساختہ چند اشعار کا مفہوم اُردو کے قالب میں ڈھل کر زبان پر آ گیا۔ میں نذرِ آلمؔ کے عنوان سے ان اشعار کو جنابِ آلمؔ کی خدمتِ اقدس میں پیش کر کے متوقع ہوں کہ وہ اس ہدیۂ شوق کو قبول فرمائیں گے۔ (شارقؔ میرٹھی ایم اے)

آلمؔ

ازاں بحلقۂ یاراں کسے آشنائے نیست
کہ درجہاں بدلے جذبۂ وفائے نیست

فرازِ طور بود، بجذ و بیتوں کہ دلم
کدام منزلِ عشقت کہ کربلائے نیست

غمِ تو نعمتِ کونین و کمتر از خاکست
دلے کہ حاملِ ایں دردِ بے دوائے نیست

شارقؔ

اِس راز سے جہاں میں کوئی آشنا نہیں
دل میں کسی کے جذبۂ مہر و وفا نہیں

وہ بخود و بے ستوں ہوں کہ دل یا فرازِ طور
ہے راہِ عشق کون سی جو کربلا نہیں

میری نگاہِ شوق میں کم تر ہے خاک سے
وہ دل جو مبتلائے غمِ بے دوا نہیں

بجز نمود تجلائے تو کرا بینم
کہ مطمحِ نگہِ شوق ماسوائے نیست

تواے کہ حالِ دلِ غم نوازِ من پرسی
خبر نداری کہ از مدتے بجائے نیست

برم زموجِ بلاخیز کشتیٔ خود را
بہ آں کنارہ کہ در چشم ناخدائے نیست

ہزار تاجِ شہی زیرِ پا ہمی دارد
گدائے یارگہِ عشقِ تو گدائے نیست

حقیقتِ الم بے نوا ہمی ندر است
خراب میکدۂ عشق و پارسائے نیست

آنکھوں کے روبرو ہے تجلیٔ حسنِ دوست
اب مطمحِ نگاہِ طلب ماسوا نہیں

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ غم نواز کا
مدت سے میرے پہلو میں اس کا پتا نہیں

موجِ بلا میں ایسا کنارہ بھی ہے، جہاں
شارقؔ رسائیٔ نگہِ ناخدا نہیں

قدموں میں اپنے رکھتا ہے تاجِ شہنشہی
جو تیرے آستاں کا گدا ہے گدا نہیں

شارقؔ حقیقتِ الم بے نوا نہ پوچھ
مخمورِ جامِ عشق ہے یہ پارسا نہیں

صاحب "کہف الایمان"

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی وفات پر

از

(جناب کاشفؔ راجوپوری)

اس عالمِ تصویر کا انداز غضب ہے
پُر جوش و بلاگیر و ہم آہنگ و پُر اسرار

اس پھول کا انجام یہاں رنگِ خزاں ہے
جس سے صفتِ مہر ہے پیشانیٔ گل زار

وہ موج پٹکتی ہے ہر آن سر اپنا
جس موج سے اک بوند بنی گوہرِ شہوار

وہ بادِ صبا جس پہ بپا حشرِ گلستاں
وہ بادِ صبا گردشِ پیہم سے گراں بار

وہ قطرہ کہ سیرابیٔ دہقان سراپا
ہے قطعِ مقاماتِ منازل اسے دشوار

ہر آن ہر اک چیز یہاں گرمِ سفر ہے
ہے باعثِ تجدید یہاں لذتِ کردار

اس انفس و آفاق میں اک جلوۂ موجود
ہر شے میں برابر کبھی پیدا کبھی پنہاں

یہ منزلِ کردار نہ پستی نہ بلندی
ہے کاہشِ پیہم یہاں آسودگیٔ جاں

اس منزلِ تجدید میں ہستی، متغیر
گاہے ہمہ بدمستی گاہے ہمہ عرفاں

شاہی قدمِ فقر پہ جھکتی ہے برابر
ماضی کا اشارہ ہے ہر اک آیتِ امکاں

اس قید سے وہ نقش مبرا ہے کہ جس میں
نقاش نے مستور کیا ولولۂ جاں

آئینِ فنا عشق سے ہے لرزہ براندام
وہ عشق کہ ہے عالمِ تدبیر سے بالا

موجوں کی کشاکش میں وہ گوہرِ ضیا تاب
جس کو نگہِ خاورِ زرتاب نے تاکا

ہر چیز گذرتی ہے یہاں جہدِ بقا سے
اک عشق کی دنیا ہے کہ امروز نہ فردا

جو عشق کہ مضراب سے پیدا ہو بصد ناز
مٹ جانے سے بلبل کے وہ نغمہ نہیں مٹتا

جس معجزۂ عشق میں ہے دل کی نبوت
وہ معجزۂ عشق ابد تک خرد افزا

آنکھ اس کے نظارہ کا تحمل نہیں کرتی
جس جلوۂ اعجاز پہ ہے عشق کا پردہ

وہ مردِ مجاہد کہ جسے عشق ہے حاصل
اس مردِ مجاہد کا مکاں اور زماں اور

وہ سیلِ گراں گیر ٹھہرتا نہیں اک دم
پستی سے گذرتا ہے تو ہوتا ہے رواں اور

وہ ذات کہ ہے عالمِ تعبیر سے اونچی
اس کے لئے آئینِ بہار اور خزاں اور

وہ گوہرِ زرتاب کہ دریا جسے پالے
درکار ہے اس کے لئے زینتِ کلِ جہاں اور

اس برقِ جہاں تاب و جہاں سوز کا عالم
چھپتا ہے نگاہوں سے تو ہوتا ہے عیاں اور

تبصرے

تجدید معاشیات از مولانا عبدالباری ندوی تقطیع متوسط ضخامت ۵۱۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد صہ/ پانچ روپیہ پتہ:- مکتبۂ تجدید دین - شبستان قدم رسول - ہارڈنگ روڈ لکھنؤ۔

مولانا عبدالباری ندوی نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی اور دینی کارناموں کی تشریح و توضیح کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے یہ کتاب اُس کی چوتھی کڑی ہے۔ تین کتابیں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں ایک خاص ترتیب اور عنوان بندی کے ساتھ مولانا مرحوم کے ان تمام ارشادات، ملفوظات اور تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ایک شخص کی معاشی زندگی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا ایک جید عالم دین اور نکتہ شناس شریعت تھے اور ماہرِ فنِ معاشیات نہیں تھے اس بنا پر اُن کے ارشادات کی حیثیت محض اخلاقی تھی اور اُن کا طرزِ استدلال و بیان اقناعی تھا نہ کہ علمی اور فنی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک فرد کی معاشی طمانیت و آسودگی کا بڑا دار و مدار معاشیات کے اسی اخلاقی پہلو کی رعایت پر ہے جو اسلام نے متعین کیا ہے اس بنا پر اس کتاب کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا تھانوی بڑے دقیقہ رس تھے اور ان کی نگاہ باریک سے باریک جزئیہ پر بڑی گہری پڑتی تھی۔ پھر قدرت نے اظہارِ مدعا و مطلب کا بڑا موثر و دل نشین پیرایہ عطا فرمایا تھا اس لئے جو بات اُن کے قلم یا زبان سے نکل جاتی تھی اثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ پھر لائق مرتب نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ رنگا رنگ عنوانات میں اُن سب کو تقسیم کر کے اور ایک خاص نہج پر مرتب کر کے اور چار چاند لگا دئیے ہیں۔ اس حیثیت سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ معاشیات کے طلبا فن کے مطالعہ کے ساتھ اس کتاب کا بھی مطالعہ کریں تب اُن کو یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو گی کہ آج کل علمِ معاشیات انتہائی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود فرد یا اجتماع کو معاشی

سکون کی نعمت بخشنے میں کیوں ناکام رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ کتاب بے حد غلط چھپی ہے اور انتہا یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات تک مسخ ہو گئی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو ص ۱۰۵، ص ۱۱۱، ص ۱۱۵، ص ۱۷۲، ص ۲۸۵ وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

اسلامک لٹریچر لاہور کا خاص نمبر اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب مرتبہ جناب محمد مظہر الدین صدیقی۔ طابع و ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔ ضخامت ۱۳۹ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت دو روپے۔

اسلامک لٹریچر انگریزی زبان کا مشہور اسلامی اور علمی ماہنامہ ہے زیر تبصرہ نمبر اُس کا خاص نمبر ہے جو مئی اور جون ۵۶ء کی دونوں اشاعتوں کو ملا کر شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں فاضلانہ ادارتی مقالہ کے علاوہ مشرق و مغرب کے ارباب قلم سے بارہ مقالات ہیں جو اسلامی اور مغربی تہذیب کی جداگانہ خصوصیات۔ دونوں کا باہمی تعلق۔ یورپ پر اسلام کے اثرات۔ کے علاوہ اور دوسرے عنوانات پر بھی ہیں اسلامی اور مغربی تہذیب کے باہمی تعلق پر ہمارے فاضل دوست لفٹنٹ کرنل خواجہ عبد الرشید کا مضمون اگرچہ بعض قدامت پرستوں پر گراں گذرے گا۔ لیکن ہے وہ پڑھنے کے لایق اور جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں وہ غور کے قابل ہیں اُن کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ جناب ریحان شریف کا مقالہ "اسلامی اصول تہذیب میں لچک" پروفیسر ضیاء الدین احمد کا مقالہ "یورپ پر اسلام کا اثر" بھی پر از معلومات۔ دلچسپ اور مفید ہیں دوسرے عنوانات کے مقالات میں محمد اسد صاحب کا مضمون "مغرب کی اسپرٹ" پروفیسر منٹگمری واٹ پروفیسر لیبری۔ ڈاکٹر ایس ایم امام الدین وغیرہم کے مقالات بھی پڑھنے کے لائق ہیں بہرحال بحیثیت مجموعی یہ خاص نمبر بہت کامیاب ہے۔ اس طرح اسلامی تہذیب سے متعلق بڑی اچھی اور بصیرت افروز معلومات اور مختلف افکار و آراء جو مشرق و مغرب میں پائے جاتے ہیں یک جا جمع ہو گئے ہیں اسلامیات کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

چند دن حجاز میں از جناب محمد زبیر صاحب اسسٹنٹ لائبریرین۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تقطیع

خورد ضخامت ۸۳ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ :- فرحت منزل بدرباغ۔ علی گڈھ

جناب محمد زبیر صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ کئی سال ہوئے حج کیا تھا۔ یہ کتاب اُسی کی یادگار میں لکھی گئی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں روئدادِ سفر ہے جس میں حجاز مقدس کے مقامات ومشاعر کے تاریخی احوال کا بھی تذکرہ ہے اور اس میں سب سے زیادہ قابل قدر لائق مصنف کا وہ جذبۂ وجوشِ ایمانی ہے جس کا اظہار سطر سطر سے ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ میں حج سے متعلق مختلف اور منتشر معلومات ہیں جن کو بغیر کسی خاص ترتیب کے یوں ہی جمع کر دیا گیا ہے۔ بہرحال مفید وہ بھی ہیں۔ عام قارئین کے لئے اس کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

بُرہان

جلد ۳۸ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۷ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ماہنامہ دار العلوم کی گذشتہ اشاعت میں ایک صاحب نے حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کے متعلق اپنی ذاتی شہادت لکھی ہے کہ حضرت نے ایک مجلس میں فرمایا کہ فلسفۂ قدیم اسلام سے بہت دور تھا اور اس کے مقابلہ میں موجودہ سائنس اسلام سے بہت قریب ہے۔ کتنے لوگوں نے یہ فقرہ پڑھا ہوگا لیکن اس ایک چند حرفی فقرہ کی اہمیت کیا ہے؟ یہ کم لوگوں کو محسوس ہوا ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان و ادب میں تو امامِ وقت اور یگانۂ روزگار تھے ہی جس کا اعتراف سب کو ہے لیکن اس کا علم شاید کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزیکس۔ کیمسٹری اور بیالوجی کا بھی بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ان علوم میں اُن کی نظر مبصرانہ تھی۔ آئزک نیوٹن اور دوسرے علمار سائنس کی کتابوں کے تراجم عربی زبان میں ہو چکے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے انھیں تراجم کی مدد سے ان علوم کا مطالعہ کیا تھا اور اُن میں اس درجہ درک و بصیرت پیدا کرلی تھی کہ طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کو جن میں ایک مولانا محمد بدر عالم صاحب مؤلف ترجمان السنہ بھی تھے۔ باقاعدہ سائنس کا درس دیتے تھے۔

ناقد جلیل صاحب جو آج کل یو۔ پی سکریٹریٹ میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ جس زمانہ میں علی گڈھ میں سائنس کے مشہور طالب علم تھے۔ ایک مرتبہ سیوہارہ میں حضرت شاہ صاحب سے ملے اور ایتھر کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ حضرت الاستاذ نے ان سوالات کے جو مفصل جوابات دیئے۔ ناقد جلیل صاحب کہتے تھے کہ یہ جوابات اس درجہ عالمانہ اور فاضلانہ تھے کہ ہماری یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہر حال لکھنے کا منشا یہ ہے کہ سائنس کو اسلام سے قریب تر جس ذاتِ گرامی نے کہا ہے وہ صرف ابن حجرِ وقت اور ابن تیمیہ عصر ہی نہیں تھی بلکہ سائنس کے مختلف علوم سے بھی بڑی حد تک آشنا اور اُس کی مبصر تھی اس بنا پر آپ کا یہ ارشاد ایک بیرونی تماشائی کا نہیں بلکہ محرمِ خانہ اور واقفِ رازِ

اندرون کا ارشاد ہے اور اس بنا پر علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ دونوں کے لئے نہایت اہم اور سبق آموز ہے

مثلاً فلسفۂ قدیم کے وہ مسلمات و نظریات جن سے اسلام کو شدید نقصان پہنچا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عرض قائم بالغیر ہوتا ہے اور لا یبقیٰ زمانین۔ اس کا وجود آنی اور فانی ہوتا ہے۔ اس ایک مسلمہ کی وجہ سے اعمال کا وزن ناممکن ہو جاتا ہے۔ افعال کے صدور سے قبل استطاعت کا وجود محال قرار پاتا ہے۔ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کی شہادت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ صحیح بخاری میں ہے "کلمتان خفیفتان علی اللسان، ثقیلتان فی المیزان" اس کی کوئی اصل باقی نہیں رہتی۔ لیکن سائنس نے تمام چیزوں کی اصل انرجی کو تسلیم کر کے ان تمام وساوس و اوہام کا خاتمہ کر دیا ہے، آج حرارت، آواز اور خیال تک کی پیمائش اور اُن کا وزن کیا جا سکتا ہے۔ انسان کا چہرہ اور اس کے اعضاء اپنی زبان میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، سائنس کے تخلیقی شاہکاروں کا دار و مدار تین ہی چیزوں پر ہے۔ بجلی، کوئلہ اور پیٹرول۔ آخر الذکر دونوں چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن نے اذا زلزلت الارض زلزالھا و اخرجت الارض اثقالھا و قال الانسان مالھا یومئذٍ تحدث اخبارھا بان ربک اوحیٰ لھا کہہ کر پہلے ہی موجودہ عہد کی ان ترقیات اور جیالوجی کی کرشمہ سازیوں کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ پھر آج کل اٹیم کی انرجی کا بڑا شہرہ ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ اٹیم قدیم فلسفہ کا وہی جزء لایتجزیٰ ہے جس کو فلسفہ نے ہمیشہ رد کیا لیکن قرآن نے کل ممزق کہہ کر فلسفہ کی اغلوطہ کاری کا پردہ چاک کیا اور اس طرح قیامت کے ثبوت کے لئے ایک راہ ہموار کی۔ شاعر نے کہا تھا:۔ "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں" لیکن آج اٹیم کی بے پناہ طاقت کے انکشاف کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر نے نری شاعری کی تھی اور حقیقت بیانی نہیں کی تھی۔

پھر اسی سائنس کا صدقہ ہے کہ خدا کا وجود اپنے تمام کمالاتِ الوہیت کے ساتھ عقلی طور پر جس قدر آج یقینی اور قطعی ہو گیا ہے اب سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ علمائے سائنس نے اس کثرت اور شدت کے ساتھ خدا کے وجود کا اقرار کیا ہے کہ اب سائنس کے طالب علم ہونے کے معنی ہی "موحد"

ہوتا ہیں۔

اس سلسلے میں آئنسٹائن اور وہائٹ ہیڈ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں جن میں سے اول الذکر نے مادہ کا تصور ہی ختم کر دیا اور موخر الذکر نے ریاضی کے اصول سے خدا کے وجود اور اُس کی صفات کا اثبات کیا اور غالباً سائنس کی اسی پیدا کی ہوئی عام فضا کا اثر ہے کہ پچھلے دنوں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر خرشچیف بھی تقریر کرتے کرتے بے ساختہ خدا کا نام لے پڑے اور ان کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔

علاوہ بریں غور کرو جمہوریت۔ مساواتِ انسانی۔ شرف و مجدِ بنی آدم۔ عالمی شہریت۔ معیشتِ باہمی۔ وحدتِ ادیان۔ یہ سب جو آج کی دنیا کے سب سے زیادہ محبوب نعرے ہیں۔ کس کی صدائے بازگشت ہیں؟ ان تمام افکار کا اصل منبع اور سرچشمہ کہاں ہے؟ وہی وادیٔ بطحا جس کی ارضِ پاک پر آخری کتابِ الٰہی کا نزول ہوا یا کوئی اور؟ اگر یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور جوشِ عقیدت کا شاعرانہ پیرایۂ اظہار نہیں تو باور کرنا چاہیئے کہ آج دنیا علمی اور فکری و نظری اعتبار سے اسلام سے جتنی قریب آگئی ہے اتنی کبھی نہیں آئی تھی۔ فکر و نظر کی گمراہی اور عقل و دانش کی غلط اندیشیوں کا وہ کون سا تلخ تجربہ ہے جو دنیا نے نہیں کر لیا۔ اور جس کے تباہ کن نتائج خود اُس نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لئے۔ آج یہ کیا ہے کہ وہی یورپ اور امریکہ جو خدا ناشناسی کے لئے مشہور تھے۔ وہاں گراہام بیلی کی دعوتِ خدا شناسی پر لاکھوں انسان سر دھنتے ہیں اور رو رو کر پھر خدا کی طرف لوٹ جانے کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور وہ اپنی ایک ایک تقریر سے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو بیک وقت بپتسمہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ انسانیت کا مردہ ضمیر پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اور اُس کی اخلاقی حس کی رگوں میں زندگی کا پھر تازہ خون پیدا ہو رہا ہے۔

ان حالات

میں سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ خود دینِ حق اور مذہبِ قیم کے علم برداروں کا کیا فرض ہے اور اُس فرض کو کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے؟

مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

اُستاذ عربی مدرسہ عالیہ رام پور (یوپی)

دلائل کی تنقیح

(۶)

(viii) کسی مردہ غریب کا قرضہ صدقۂ زکوٰۃ سے ادا کرنا اس سے زیادہ بے انصافی کا مقتضی ہے۔ اس لئے کہ اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں۔

مواخذۂ اخروی کا اندیشہ:۔ اس کے لئے بجائے اس کے کہ فقرار و مساکین کا پیٹ کاٹا جائے یا تو قرض خواہ جو عموماً طبقۂ اغنیار سے تعلق رکھتے ہیں اس غریب مردہ کو آخرت میں مقروض رکھنے کے بجائے اس دنیا میں معاف کردیں یا اگر وہ لوگ معاف نہ کریں تو اہلِ خیر مسلمان اس قرضہ کو ادا کردیں۔

سماج کی معاشی تنظیم:۔ سماج کی صالح تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ قرض داروں سے قرض خواہوں کے قرضے چکوانے کا مؤثر انتظام ہو۔ اب غور کیجئے ما نحن فیہ میں کیا ہوگا قرضہ فقرار کے حصے میں چکوایا جائے گا لہٰذا فقرار کا تو پیٹ کٹا اور فائدہ ہوا اغنیار کا کہ اُن کی ڈوبی ہوئی رقم وصول ہوگئی (اس لئے کہ قرض خواہ عموماً طبقۂ اغنیار ہی سے تعلق رکھتے ہیں)

لہٰذا اس مسئلہ میں بھی اہلِ انصاف ہی انصاف کریں گے کہ اگر فقہار نے یہ فتویٰ دیا کہ صدقہ زکوٰۃ سے مردہ کا قرضہ ادا نہیں کیا جاسکتا تو انھوں نے حق و انصاف اور اسلام کی روح کو ملحوظ رکھا یا نہیں مگر جب مزاج سرمایہ داری عہد کی انفرادیت (Individualism) سے متاثر ہوجاتے

ہیں تو پھر اسلام کی انصاف کوشی اور انسان دوستی کو مشکل ہی سے درک کر پاتے ہیں۔

(xi) صدقۂ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کرنا سو اس زمانہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس بحث کی ایک جدلی قیمت رہ گئی ہے۔

زکوٰۃ معاشرۂ اسلامی کے ملئے ریڑھ کی ہڈی ہے مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اس کی ثانوی حیثیت ہے اولاً یہ ایک خالص تعبدی امر ہے اور اللہ تعالیٰ یہ آزمانا چاہتا ہے کہ اُس کے بندے اُس کے حکم کی تعمیل میں مال جیسی پیاری چیز سے کہاں تک دست بردار ہو سکتے ہیں۔ یہ اُن کے تیاگ کا امتحان ہے۔

لہذا اگر آدمی کسی نفع عاجل کی خاطر اپنی دولت کو صرف کرے تو یہ تجارت ہے "تیاگ" نہیں ہے تیاگ وہ ہے جس میں کسی نفع یقینی یا نفع موہوم کی امید نہ ہو اور یہی چیز زکوٰۃ میں ملحوظ ہے۔ جس زمانہ میں غلام خریدے اور آزاد کئے جاتے تھے یہ رسم معروف تھی کہ آزاد کنندہ کو غلام کی وِلا حاصل ہو جایا کرتی تھی یعنی اگر غلام لاوارث مرے تو اُس کا ترکہ اُس کے آزاد کرنے والے کو ملے گا۔ اب اگر رقم زکوٰۃ سے غلام آزاد کیا جائے تو اس میں اُس کی ولا زکوٰۃ دہندہ کو حاصل ہو گی یعنی ایک نفع کی اس میں توقع ہے تو پھر یہ تجارت ہوئی "تیاگ" تو نہ ہوا جو امور تعبدی کی جان ہے۔

یہ ہے روحِ اسلام کا تقاضا جس کی بناء پر فقہاء سابقین نے فتویٰ دیا کہ رقم زکوٰۃ سے بردے آزاد نہیں کئے جا سکتے۔ ضمناً تملیک کے اصول کی بھی مراعاۃ ہو گئی۔

(x) وصولی زکوٰۃ کے مصارف پر رقوم زکوٰۃ کا خرچ ہونا:۔ عاملین علی الزکوٰۃ کے سہم سے جو انکار کرے وہ کافر۔ مگر عامل اور فضولی میں فرق ہے۔ عامل کو جو فقراء کو تحصیلِ زکوٰۃ سے فارغ کر دیتا ہے دو وجہ سے معاوضہ ملتا ہے:

اولاً:۔ اُس نے فقراء کو جسمانی طور پر تحصیلِ زکوٰۃ کی کلفت سے فارغ کر دیا۔

ثانیاً:۔ ذہنی طور پر اُس نے فقراء کو فارغ البال کر دیا اور اطمینان دلا دیا کہ رقومِ زکوٰۃ اُن تک ضرور پہنچ جائیں گی۔

فضولی پہلی شرط کو پورا کرتا ہے دوسری کو نہیں[۱] لہذا معاوضہ کا مستحق کیوں ہو؟ اور ہر دو ہیچ کا پچو لیا

---

[۱] کیوں کہ اگر وہ رقوم زکوٰۃ میں تغلب بیجا یا خیانتِ مجرمانہ کرے تو اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کیا ضمانت ہے۔

جسے امام نے اس کام کے لئے مقرر نہ کیا ہو وہ بطور خود اس کام کو اپنے ذمہ لے لے وہ فضولی ہے خواہ وہ شخص واحد ہو یا کوئی انجمن و ادارہ ہو الا یہ کہ اس انجمن یا ادارے نے حکومت کی طرف سے یہ حق حاصل کر لیا ہو۔ اس صورت میں اس انجمن یا ادارے کے متعلق تغلب بیجا یا خیانتِ مجرمانہ کا اندیشہ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا وہ معاوضہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔

غرض نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے اُن میں (بالخصوص پہلے چھٹے میں) اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ سو فی صدی غریبوں کے مفاد سے متعلق ہیں کیسے ناممکن ہے کہ غیر غربا حتیٰ کہ زکوٰۃ دہندہ بھی اُس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستفید نہ ہوں۔ اور اگر ایسا ہوا ——— جو ہونا یقینی ہے ——— تو پھر آیت میں جو قصر و حصر ہے اُس کا کیا فائدہ رہا۔ انما کا عمل ذوقِ اجتہاد کی خاطر لغو ہو جائے گا اور پھر اس صورت میں اولاً تو آیت کی بلاغت اور مقتضائے کلام کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا اور ثانیاً انما کا عمل لغو ہونے کے بعد "ومنھم من یلمزک فی الصدقات" اور "انما الصدقات للفقراء" میں کیا ربط رہ جائے گا۔

پھر نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے وہ سب غریبوں کے مفاد سے متعلق ہے حالاں کہ قرآن و حدیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ صدقات زکوٰۃ صرف فقرار کا حق ہیں اور قرآن کے مصطلحہ فقرار اور اردو کے غربار میں زمین آسمان کا فرق ہے نیز مصارف زکوٰۃ کو قرآن نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اب اس میں اضافہ کا کسی کو حق نہیں ہے اور تو اور خود پیغمبر اسلام کو بھی اس میں دخیل نہ ہونے کا اعتراف تھا۔ چنانچہ حدیث مشہور ہے جسے امام ابوجعفر الطحاوی نے شرح معانی الآثار میں روایت کیا ہے۔

"حدثنا یونس قال حدثنا ابن وھب قال اخبرنی عبد الرحمٰن عن زیاد بن انعم عن زیاد ابن نعیم انه سمع زیاد بن الحارث الصدائی یقول:۔

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی قومی فقلت یا رسول اللہ اعطنی من صدقاتھم ففعل وکتب لی بذالک کتاباً فاتاہ رجل، فقال یا رسول اللہ

اعطنی من الصدقۃ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ عزوجل لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصدقات حتی حکم فیھا ھو من السماء فجزأھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلک الاجزاء اعطیتک "

(طحاوی: شرح معانی الآثار جلد اول صد ۳۰۴-۳۰۵)

حضور نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ تو ان اصنافِ ثمانیہ میں سے کسی صنف کے تحت ہے جو میں زکوٰۃ میں سے تیرا حصہ لگاؤں۔ کیا ہم بھی اصلاحی صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں کہ نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست انھوں نے دی ہے (یہاں تک کہ لاوارث میت کی لاش کی تجہیز و تکفین بھی) وہ ان مصارفِ ثمانیہ میں سے کس کس مصرف کے تحت آتی ہے جو انھیں رقوم زکوٰۃ سے پورا کرنے کی وجہ جواز پیدا ہو سکے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب اللہ عزوجل تقسیم زکوٰۃ کے باب میں نبیِ مرسل کے حکم کے ساتھ تو راضی ہوا نہیں بلکہ آسمان سے خود اُس کے باب میں حکم محکم نازل فرمایا تو کیا ہمارے لئے اس حکمِ خداوندی کے بعد گنجائش رہ گئی ہے کہ ہم "زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام انجام دے سکیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے"۔

ختمِ مقال سے پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاید بعض قلوب میں خلجان پیدا ہو کہ فقہا اس درجہ ظاہر پرست (Literalist) تھے کہ ایک اصول کی مراعاۃ کی خاطر "زکوٰۃ کے ذریعے سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیتے تھے جو غربا کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں"۔ ایسا نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور ساتھ ساتھ باضابطہ بھی۔ لہذا بیت المال (Public Treasury) کا نظم و ضبط کچھ ضوابط کے ساتھ ہوتا تھا یہ نہیں کہ جو آمدنی ہوتی گئی "کل شیئ فی جوف الفرا" کے مصداق ایک بھنڈار خانہ میں جمع ہوتی رہی اور جیسی خرچ کے لئے ضرورت ہوئی اسی عمرو عیار کی زنبیل میں سے رقم نکالی جاتی رہی۔ جن لوگوں نے عہدِ حاضر کے متمدن ممالک کے مالیات عامہ (Public Finances) کی تنظیم کا مطالعہ

کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آمدنی و خرچ کی مختلف مدات ہوا کرتی ہیں اور ایک مد کی آمدنی نہ دوسری مد میں جمع ہو سکتی ہے اور نہ ایک مد کا خرچ دوسری مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی بیت المال کی تنظیم بھی اسی اصول پر ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مضمون میں بہت اچھی طرح دی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں، مزید تفصیل کے لئے قارئین شمس الائمہ السرخسی کی المبسوط ملاحظہ فرمائیں (الجزء الثالث صـ۱۷-۱۸) لہٰذا نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کا حوالہ اصلاحی صاحب نے دیا ہے اُن میں سے پہلے چھ کے مصارف خراج کی مد سے ادا کئے جاتے تھے اور ساتویں کا صدقہ چوتھی مد سے دیا جاتا تھا۔ یوں اگر اہلِ خیر چاہیں تو زکوٰۃ کے علاوہ اپنی کمائی میں سے اجتماعی فلاح و بہبود اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر میں خرچ کریں بقول شاعر ع

پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

مگر صدقات زکوٰۃ و عشر کا صرف مصارفِ ثمانیہ پر مقصور ہے۔ نام نہاد نیکی اور خدمتِ خلق کے کسی کام کو فقراء کا پیٹ کاٹ کر انجام نہیں دیا جا سکتا اور اگر کوئی اس کی تجویز کرتا ہے تو اپنے لئے اُس مرتبہ کا مدعی ہے جس سے افضل الانبیاء صلوات اللہ علیہم نے دستبرداری کا اعتراف کیا جیسا کہ ابھی ابھی زیاد بن حارث الصدائی کی حدیث میں بحوالہ طحاوی گذر چکا ہے

غرض مصارفِ زکوٰۃ اور اس کا طریقِ ادا قیامت تک کے لئے مقرر ہو چکا ہے۔ حکم محکم ہے اور کسی ترمیم و اصلاح یا نسخ کا محتمل نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اصلاحی صاحب باوصف اپنے علم و فضل اور خلوص و دیانتداری کے اسے محض ایک انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

"اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ ...... اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غرباء کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۵۸ عدد ۱ صـ۳۴)

اگر کوئی قرآن و حدیث سے ناواقف شخص ایسا غیر ذمہ دارانہ فتویٰ دیتا تو چنداں حیرت نہ ہوتی مگر یہ ایک ذمہ دار کبیر جماعت کا فتویٰ ہے جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ علوم قرآن و حدیث سے بے بہرہ

نہیں ہیں۔ کاش کہ وہ یہ فتویٰ صادر فرمانے سے پہلے یہ دیکھ لیتے۔

۱۔ حکومتیں غربار کی نفع بخش اسکیموں ہی کے نام سے مُترفین واہلِ دول کی تجوریاں بھرنے کے لئے ملک کی آمدنی لگایا کرتی ہیں۔

۲۔ زکوٰۃ نہ تو سب غربار کے فائدے کے لئے ہے اور نہ اس مقصد کے لئے کہ اس کے ذریعے (جیسا کہ اصلاحی صاحب فتویٰ دیتے ہیں) سب کو فائدہ پہنچے۔ ورنہ پھر انّما کے ذریعے حصر وقصر کا کیا فائدہ ہوا۔

زیاد بن حارث الصدآئی کی حدیث جسے امام طحاوی نے روایت کیا ہے افضل الانبیا تک سے اس قسم کے اختیارات کو مسلوب کر رہی ہے۔

لیکن اصلاحی صاحب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی عظمت وپستی کو اُسی پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں جس سے لادینی حکومتوں کے خوب وناخوب کی پیمائش کی جاتی ہے اگر اسلام کی کوئی تعلیم اس معیار پر پوری اُترتی ہے تو اپنانے کے قابل ہے ورنہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔

"قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص وتحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں کم از کم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح وترقی میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا .... دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دور رس اور مفید اسکیم پر نہیں خرچ کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے۔"

حالانکہ جیسا کہ مقدمہ رابعہ میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے ہمارے ذہنی اضطراب وفکری انتشار کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم لادینی نظاموں کے معیارِ خوب وناخوب سے دین کے نظام کو جانچنا چاہتے

ہیں۔ لیکن قرآن کا حکم اس باب میں صاف اور غیر مبہم ہے

"ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر وابقی"۔

مگر مولینا کے دل و دماغ پر اقتصادی منصوبہ بندی (Economic Palanning) اور دور رس تجاویز (Long Term Development schemes) اس درجہ چھائی ہوئی ہیں کہ انہیں اسوۂ رسول و فرمانِ رسالت کا بھی خیال نہیں۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا معیاری طریقہ

"کہ محصلین زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں، زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غرباء میں تقسیم کر دیں"[1]

جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کا من گھڑت بتلاتے ہیں حقیقتاً فرمانِ رسالت

"ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیاءھم فترد فی فقرائھم"۔

کی تعبیر اور اسوۂ رسول

"قدم علینا مصدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ الصدقۃ من اغنیاءنا فجعلھا فی فقرائنا"

کی پیروی ہے اور اس حیثیت سے

"وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم"۔

کے حسب الارشاد واجب الاتباع اور

"ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

کے حسب التصریح موجب خیر و فلاح ہے اور

"وعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین"۔

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۴۰ عدد ۱ ص ۳۳

کے بموجب واجب الاقتداء ہے۔ لیکن اصلاحی صاحب کی "حرارتِ ایمانی اور جذبۂ سنت پسندی" نے اس میں دو واضح قباحتیں ڈھونڈھ لیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

"اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں"

حالانکہ اگر اس قسم کی گستاخی منکرینِ حدیث کی جانب سے ہوتی تو شاید انھیں گردن زدنی، کشتنی، سوختنی بھی کچھ قرار دیا جاتا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ راجِعُون۔

اطالت کلام مانع ہے ورنہ تاریخی شواہد پیش کئے جاتے اور اعداد شمار دیئے جاتے کہ نام نہاد "منصوبہ بندی" ہر جگہ حتی کہ اشتراکی روس میں بھی ناکام رہی اور اسی طرح دور رس مفید اسکیمیں صرف مترفین واہلِ دول کے فائدے کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ پھر ایک مردِ مسلمان کا معمول بہ یہی ہے کہ

"وان ھٰذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ"

"اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء"

"وکذالک انزلنٰہ حکما عربیا ولئن اتبعت اھوائھم من بعد ما جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا واق"

اور ہمیں یقین ہے کہ صرف اتباعِ خدا ورسول ہی سے ہماری حیاتِ اخروی کے ساتھ ساتھ حیاتِ دنیوی بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہم وہ غلطی نہیں کرنا چاہتے جو اہلِ کتاب نے اتباعِ احکام الٰہی کو چھوڑ کر کی تھی، ہمارا یقین ہے کہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو اُن کی دنیوی زندگی بھی عظمت وبلندی کی حامل ہوتی۔

"ولو انھم اقاموا التورٰۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم"

غرض اس شوقِ تجدد پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکامِ شرعیہ کو وقتی مصالح سمجھ کر لوازم وبے اتفاقی کے لئے وجہ جواز پیدا کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں

"سوال یہ ہے کہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ

ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ اور اسی بستی میں تقسیم کردی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔"

کاش مولانا وہ "نہایت واضح دلائل" بھی ثبت قلم فرما دیتے جن کی روشنی میں انھیں شریعت کا یہ حکم محکم ایک انتظامی معاملہ نظر آرہا ہے! لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتظامی اور شرعی کی تدقیق ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے ورنہ حقیقتاً "واضح دلائل" کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شرعی قانون اور حکمِ محکم ہے۔ دلائل سنیئے۔

اولاً: حدیث معاذ بن جبلؓ "توخذ من اغنیاءھم و ترد علی فقرائھم" میں اخذ ورد کا حکم بصیغۂ مضارع مذکور ہوا ہے جو حال اور مستقبل دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یعنی جس طرح عہدِ نبوی میں زکوٰۃ لی جاتی اور تقسیم کی جاتی تھی اسی طرح آنے والے معاشروں میں بھی وصول اور تقسیم کی جائے گی۔

ثانیاً: "ولکم فی رسول اللہ اسوۃ" کا مقتضا ہے کہ عہدِ نبوی کی اس سنت کو برقرار رکھا جائے بلکہ صرف سنتِ نبوی پر مبنی اجتماعی تنظیم کا باز احیا رہی قیامِ حکومت اسلامیہ کا مقصود حقیقی ہے۔ اور ترمذی نے جو علی بن سعید الکندی سے روایت کی ہے اُس سے غیر مبہم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا وہی طریقہ تھا جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کی من گھڑت بتا رہے ہیں۔ تو آخر اس اسوۂ رسول کے اتباع اور التزام سنتِ نبوی سے انحراف کی ہمت افزائی کرانے والے کون سے دواعی ہیں۔ محض اس لئے کہ فقراء کے حق سے "حکومتی سطح" کی "ترقیاتی اسکیموں" کو (Finance) نہیں کیا جاسکتا (روپیہ نہیں لگایا جاسکتا) جس سے مترفین و اہلِ دول کی تجوریاں بھر سکیں اُسوۂ رسول کو محض ایک انتظامی معاملہ (وقتی مصلحت) کہہ کر صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے۔

ثالثاً۔ اُس تملیکِ اجتماعی کی جو منکرینِ تملیک کے پیشِ نظر ہے، کوئی مثال صدر اسلام میں نہیں مل سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کی معاشرتی زندگی اس کے لئے سازگار نہ ہو۔۔۔

. . . . ہو سکتا ہے کہ طرقِ دولت آفرینی
(Means of Production) اس وقت محض ابتدائی حالت (Primitive state)
میں ہوں اس لئے تقسیم دولت کا وہ پرپیچ طریقہ جسے "تملیک اجتماعی" کا نام دیا جا رہا ہے، اُس عہد میں مستعمل نہ ہو۔ لیکن اس قسم کا استدلال تو ایک مارکسیت زدہ منکر حدیث کے منہ سے امید کیا جا سکتا تھا جس نے مارکس اور اینجلز کے اشتراکی منشور[1] پر ایمان لا کر "افضل الرسل" کو ایک نیم جاگیردارانہ نظامِ معاشرت کا مصلح سمجھنے پر اکتفاء کی ہو لیکن مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالمِ دین سے اس کو توقع نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر بالفرض یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہی تھا اور دائمی حکم نہیں تھا بلکہ شریعت میں نام نہاد "تملیک اجتماعی" کی گنجائش ہے تو کم از کم آنے والے زمانے ہی کے لئے اللہ یا اللہ کے رسول نے اس کی جانب اشارہ فرما دیا ہوتا۔ اور اگر ایجابی اشارہ نہ کیا تھا تو کم از کم قرونِ مابعد ہی کے لئے جب کہ طرقِ دولت آفرینی میں اصلاح و ترقی کے پیش نظر دولت و ثروت کی غیر معمولی افراط ہونا مقدر ہو چکی تھی تملیک شخصی پر زور نہ دیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کو آنے والے زمانہ کی دولت و ثروت کا اندازہ تھا مگر اس دولت و ثروت کی فراوانی کے عالم میں جب کہ اس "عہد کی حکومتیں جدید نظریات کی معتقد ہوں گی" اللہ کے سچے رسول کے پیش نظر "تملیک فقیر" اور "تملیک شخصی" ہی تھی چنانچہ صحیح مسلم میں حارث بن وہبؓ سے روایت ہے

"تصدقوا فیوشک الرجل یمشی بصدقتہ فیقول الذی اعطیھا لو جئتنا بھا بالامس قبلتھا فاما الآن فلا حاجۃ لی بھا فلا یجد من یقبلھا"

دوسری حدیث میں ابو موسیٰؓ سے مروی ہے

"لیأتین علی الناس زمان یطوف الرجل فیہ بالصدقۃ من الذھب ثم لا یجد احدا یأخذھا منہ"

---

[1] Communist manifesto.

تیسری روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں غیر مبہم طریقہ پر زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ وہ بغیر تملیکِ شخصی کے ادا نہیں ہو سکتی۔

"لا تقوم الساعۃ حتی یکثر المال ویفیض حتی یخرج الرجل بزکاۃ مالہ فلا یجد احداً یقبلھا منہ"

پس اگر یہ محض ایک انتظامی معاملہ تھا جو وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا جیسا کہ امین احسن صاحب کا خیال ہے اور آئندہ کے لئے شریعت کا ناقابلِ تنسیخ حکم نہیں تھا تو قربِ قیامت میں زکوٰۃ دہندہ کو اس دردسری کے دینے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ مال زکوٰۃ لے کر فقیر کو ڈھونڈھتا پھرے اور ایک نہ لے تو دوسرے کی اور دوسرا نہ لے تو تیسرے کی خدمت میں وہ پیشکش پیش کرتا پھرے کیوں نہ اس کا حکم دے دیا یا اشارہ کر دیا کہ وہ اسٹیٹ کو یا کسی انجمن و ادارے کو اپنی زکوٰۃ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے اور وہ اسٹیٹ یا پبلک ادارہ اس طرح کی رقموں کو "ایک مرکزی اسکیم کے تحت میں کنٹرول کر کے کسی ترقیاتی منصوبہ (developmental scheme) یا رفاہِ عامہ کے کاموں میں لگا دے"

لیکن شارع علیہ السلام کو کبھی یہ نام نہاد "تملیکِ اجتماعی" مقصود ہی نہیں تھی۔ اُن کے پیشِ نظر اپنے زمانہ سے لے کر قیامِ قیامت کے زمانہ تک ادائے زکوٰۃ کی جو شکل تھی وہ یہی تھی کہ

"آدمی اپنا مال زکوٰۃ لے کر خود نکلے اور مستحق کو ڈھونڈھتا پھرے اور جب ایک انکار کر دے تو دوسرے کو تلاش کرے خواہ اس میں اسے کتنی ہی دردسری کیوں نہ برداشت کرنی پڑے"

غالباً اس منصوص حکمِ نبوی کے بعد اس بات کے وہم کے لئے کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ عہدِ نبوت و زمانہ صحابہ کی

"توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

کی عمومی پالیسی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت محض ایک انتظامی معاملہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ حدیث کا سیاق پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ شارع علیہ السلام کے پیش نظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلے میں تملیکِ شخصی یا تملیکِ فقیر ہی کا اصول تھا۔

غالباً اصلاحی صاحب "تملیکِ فقیر" کے انکار پر جو اصرار فرما رہے ہیں اُس کا منشاء یہ ہے کہ وہ "نیکی اور خدمتِ خلق کے تمام کاموں کو" رقومِ زکوٰۃ سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے آیت کریمہ کے آخر میں جو "وفی سبیل اللہ" کا ذکر ہے اس پر خصوصیت سے زور دیا ہے فرماتے ہیں

"فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں۔۔۔۔ اگر اس کے تحت تمام مصارف خیر آتے ہیں جیساکہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے تو تملیکِ شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیکِ اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردد ہے کہ للفقراء کی لام کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیئے۔ یہ دیکھئے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۵۰ عدد ۱ ص ۵۶-۵۷)

"فی سبیل اللہ" کی توضیح ہمیں اصل بحث سے دور لے جائے گی لہذا اس سے صرفِ نظر مناسب ہے۔ اسے کسی اور وقت کے لئے رہنے دیجئے لیکن اصلاحی صاحب نے جو فرمایا ہے کہ "اس کے تحت تمام مصارفِ خیر آتے ہیں جیساکہ ہر مسلک کے علماء وائمہ نے تصریح کی ہے" محلِ نظر ہے۔ شاید ہی کسی نے آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" میں "وفی سبیل اللہ" سے مراد تمام مصارفِ خیر کو لیا ہو۔ القدوری میں ہے۔

"وفی سبیل اللہ المنقطع الغزاۃ"

المبسوط میں شمس الائمہ السرخسی نے فرمایا ہے

"واما قولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ فھم الفقراء الغزاۃ ھکذا قال ابویوسف"

آگے چل کر انھوں نے اسے صاف کر دیا۔

"وابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ بقول الطاعات کلہا فی سبیل اللہ تعالیٰ لکن عند اطلاق ھذا اللفظ المقصود بہم الغزاۃ عند الناس "۔

دیگر مسالک کے متعلق امام شعرانی نے "المیزان" میں لکھا ہے

"ومن ذالک قول الائمۃ الثلاثۃ ان المراد بقولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ الغزاۃ مع قول احمد فی اظہر روایتہ ان منہ الحج "۔ (المیزان للشعرانی صہ ۱۳)

یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک کہتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ ہیں اور امام احمد بن حنبل حج کو بتاتے ہیں یعنی مجموعی طور پر تمام ائمہ کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ اور حجاج ہیں نہ کہ جملہ مصارفِ خیر۔

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ قاضی ابوالولید ابن الرشد نے بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد میں فرمایا ہے جو نقل مذاہب کے باب میں نہایت مستند اور معتمد علیہ کتاب ہے۔

"واما فی سبیل اللہ فقال مالک سبیل اللہ مواضع الجہاد والرباط وبہ قال ابوحنیفۃ وقال غیرہ الحجاج والعمار وقال الشافعی ھو الغازی جار الصدقۃ وانما اشترط جار الصدقۃ لان عند اکثرھم انہ لا یجوز تنقیل الصدقۃ من بلد الی بلد الا من ضرورۃ "۔

(بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد جلد اول صہ ۲۳۷)

اس میں امام مالک کا مذہب خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ وہ فی سبیل اللہ سے بالتصریح مواضع جہاد و رباط مراد لیتے تھے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اصلاحی صاحب نے توطیدِ مقصد اور سخن پروری کی خاطر غلط بیانی اور کتمانِ حق سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے قاضی ابن العربی مالکی کی کتاب "احکام القرآن" کا ایک اقتباس نقل کیا ہے :۔

"قال مالک سبل اللہ کثیرۃ۔ احمد واسحٰق قالا انہ الحج

فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد

والذی یصح عندی من قولهما ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو" اور اسحاق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشأ یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲۸ عدد ۱ ص۵۵)

لیکن مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے یہ حقیقت پیش کرنی پڑ رہی ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکام القرآن کی عبارت میں سے سخن پروری اور توطیدِ مقصد کی خاطر ایک پورا ٹکڑا حذف کر دیا ہے اور حذف کرنے کا کوئی اشارہ (مثلاً نقطے) بھی نہیں کیا۔ ہم اسے کاتب کے تصرف یا سہوِ قلم پر ہی محمول کر لیتے مگر انھوں نے ترجمہ بھی اپنی کتر بونت کی ہوئی عبارت کا کیا ہے۔ احکام القرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

"(المسئلۃ التاسعۃ عشر) قولہ وفی سبیل اللہ قال مالک سبل اللہ کثیرۃ ولکن لا اعلم خلافاً فی ان المراد بسبیل اللہ ھاھنا الغزو من جملۃ سبیل اللہ الا ما یوثر عن احمد واسحٰق فانھما قالا انہ الحج والذی یصح عندی من قولھما ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو لانہ طریق بر فاعطی منہ باسم السبیل وھذا یحل عقد الباب ویخرم قانون الشریعۃ وینثر مسلک النظر وما جاء قط باعطاء الزکوٰۃ فی الحج اثر"

(احکام القرآن لابن العربی جلد اول ص۳۹۶)

اس میں سے اصلاحی صاحب نے دو جگہ سے خط کشیدہ عبارت اڑا دی کیوں کہ اس کے ہوتے ہوئے اُن کی عمارتِ استدلال زمین پر آ رہتی۔ لیکن اس کتر بونت میں انھیں یاد نہ رہا کہ احمد و اسحٰق قالا کا جملہ ماسبق سے ربط رکھنے کے لئے کوئی اور عبارت بھی درکار ہے۔

اس تصرفِ بے جا کی توقع ایک عالم تو درکنار ایک عامی سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

"فانا للہ وانا الیہ راجعون"

محمود غزنوی پر ایک سرسری نظر

از

(جناب قاری محمد بشیر الدین صاحب نیڈرت ایم اے)

محمود غزنوی کے ۳۳ سالہ عہدِ حکومت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زندگی کے چند لمحات بھی ایسے نہیں جنھیں جدو جہد سے خالی کہا جا سکے اس کے اندر جو وصف سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اس کی سپاہیانہ و مجاہدانہ اسپرٹ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود جیسا اولوالعزم فاتح عجمی سرزمین اب تک پیدا نہ کر سکی۔ سکندر کے کارنامے محمود کے کارناموں کے آگے ہیچ ہو گئے۔ شمال کے وحشی تاتاری جیحون کے اس پار منتشر کر دیئے گئے۔ ایران کی چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتوں کو مٹا دیا گیا۔ اصفہان سے بندیل کھنڈ اور سمرقند سے گجرات تک نامور غزنوی نے ہر ایک دشمن کو زیر کیا اور ہر مدِ مقابل کو نیچا دکھایا۔ محمود جب تخت نشین ہوا ہے تو اس کے قبضہ میں صرف غزنی، بلخ اور بست کے صوبے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے حدودِ حکومت کو بڑھایا۔ سیستان۔ غور۔ غرجستان، خوارزم، کافرستان، رے، جبال، اور اصفہان کے صوبے براہِ راست غزنی کی حکومت میں ملا لئے گئے اور قزدار، مکران طبرستان، جرجان، ختلان، صغانیان اور قبادیان کے حکمرانوں نے اس کی بالادستی کو تسلیم کر لیا جنوب و مشرق کی طرف ہندوستان میں لمغان سے لے کر دریائے بیاس کے کنارے تک اور ملتان، بھٹنڈہ اور سندھ کی حکومتوں پر غزنی کا پرچم لہرا دیا۔ علاوہ بریں زیریں کشمیر، قنوج، کالنجر، گوالیار منج، اسونی، نرائن پور اور گجرات وغیرہ کے راجاؤں کو باج گذار بنا لیا۔ اس طرح عراق اور بحر کیسپین سے لے کر دریائے گنگا کے کنارے تک اور بحیرۂ ارال سے لے کر بحیرۂ عرب تک ایک وسیع و عریض حکومت قایم کر کے عجمی سلاطین کی فتوحات کے سابقہ ریکارڈ کو توڑ دیا۔ شرقاً غرباً طول میں اس کی حکومت ۲۰۰۰ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور شمالاً جنوباً چوڑائی ۱۴۰۰ میل تھی۔

محمود فنِ سپہ گری سے زیادہ تدبیرِ جنگ میں ماہر تھا غزنی کے تخت پر بیٹھ کر اس کی عقابی آنکھیں مشرق و مغرب کی ہر چیز پر نظر رکھتی تھیں اس کے دھاووں کی تیز رفتاری دشمنوں کو حیرت میں ڈالتی تھی ایک شخص جو اسی جاڑے میں (۱۰۰۶ء) ملتان کے قرمطیوں کو خوف زدہ کر کے ساتھ ہی بلخ کے تاتاریوں کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے ایک باغی صوبے دار (سکھپال) کو گرفتار کرنے کے لئے بھی وقت نکال سکتا ہو اس کے لئے اپنے دلیر مگر سست قدم معاصرین کے دلوں میں ہل چل مچا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ پھر محمود باوجود اس مردانگی کے بہت ہی محتاط تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں ناکام نہیں ہوا۔ محمود کے ہندوستان پر حملے جن میں اس کی فوجی لیاقت اعلیٰ ترین پیمانے پر نظر آتی ہے حزم و احتیاط اور شجاعت کا حیرت انگیز مجموعہ ہیں۔

جس قدر اس کی دلیری اور حزم و احتیاط لائقِ ستائش ہے اسی قدر اس کے ماتحتوں کی بے خوف جرأت و شجاعت قابلِ داد ہے انھیں ایک شخص کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت کرنا سکھایا گیا تھا اس کی فوج میں ترکی، تاتاری، ایرانی، افغانی اور ہندی عناصر الگ الگ ہونے کے باوجود ایک تھے محمود کی تنظیم و تربیت نے انھیں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ٹھوس اور ناقابلِ شکست بنا دیا تھا۔ اس کے تمام حریفوں نے بالعموم اور تاتاریوں نے بالخصوص اپنی جانیں کھو کر یہ سبق حاصل کیا تھا کہ صرف جواں مردی اور توکل بہ تقدیر سے ترتیب و تنظیم یافتہ افواج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

محمود کو اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا اس لئے اور بھی موقع ملا کہ اسے خوش قسمتی سے حکومت کے نظم و نسق کے لئے وزیر نہایت ہوشمند و دور اندیش ملے۔ اس لئے اس نے انتظامِ مملکت کا اکثر و بیشتر کام اپنے وزرا پر چھوڑ دیا حکومت کے ابتدائی دو سال تک محمود کے باپ کا وزیر ابو العباس فضل بن احمد اسفرائینی وزارت کا کام انجام دیتا رہا۔ باوجود کم تعلیم پانے کے ملکی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں ابو العباس کا علم ایک بحرِ بیکراں تھا اس کے جانشین خواجہ احمد بن حسن میمندی نے ۱۸ سال تک وزارت کا کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بادشاہ کا رضاعی بھائی اور ہم سبق تھا۔ بلحاظ علم و فضل و سیاسی فہم و تدبر یگانۂ روزگار تھا۔ سلطان کے لئے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنا

ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا اگر اس کے وزیر احمد کی انتظامی قابلیت شامل حال نہ ہوتی۔ احمد کے معزول[1] و مقہور ہونے کے بعد سلطان نے ایک عرصہ تک کسی وزیر کا تقرر نہ کر کے اس امر کا ثبوت دیا کہ اگر ضرورت ہو تو وزارت کا عہدہ توڑا جا سکتا ہے اور بغیر وزیر کے بھی سلطنت کا کام چلانے کی اس کے اندر صلاحیت ہے۔ آخری سالوں میں اس نے احمد حسن بن میکائیل کو جو عام طور سے حسنک کے نام سے مشہور ہے اپنا وزیر بنایا۔ یہ نیا وزیر سلطان کے مقرب دوستوں میں سے تھا اس پر سلطان کو ازحد بھروسہ اور اعتماد[2] تھا

محمود غزنوی ایک بہترین سپہ سالار و سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب و شائستگی کے زیور سے بھی آراستہ و پیراستہ تھا۔ مستند کتابوں میں اسے فقیہ مانا گیا ہے۔ اور فقہ میں اس کی ایک مبسوط[3] تصنیف تفرید الفروع موجود ہے۔ فارسی تذکروں اور تاریخوں میں اس کے طبع زاد[4] چند شعر بھی منقول

---

[1] خواجہ احمد بن حسن میمندی کا غیر معمولی عروج لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ سلطان کے داماد امیر علی اور سپہ سالار التونتاش کی سرکردگی میں ایک بڑی جماعت اس کے خلاف قائم ہو گئی۔ بالآخر خواجہ احمد کو ہندوستان کے ایک قلعہ کالنجر میں جو کہ تمام خطرناک قسم کے سیاسی قیدیوں کے لئے بطور کالے پانی کے استعمال ہوتا تھا قید کر دیا گیا۔ وہاں وہ ایک عرصہ تک قید رہا۔ محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود نے اسے رہا کر کے اپنا وزیر مقرر کیا۔ [2] احمد حسن ایک مرتبہ حج کو جاتے ہوئے ملک شام سے گذرا جو اس وقت فاطمی خلیفۂ مصر کا ایک مقبوضہ تھا خلیفۂ مصر نے اسے اپنا طرفدار (اسمٰعیلی) بنانے کی غرض سے خلعت پیش کیا جسے اس نے قبول کر لیا اس پر خلیفۂ بغداد نے صدائے احتجاج بلند کی مگر محمود حسنک کے معقولی عقائد سے واقف تھا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ محمود اس پر کتنا اعتماد کرتا تھا اس کا اندازہ اس جواب سے ہوگا جو اس نے خلیفۂ بغداد کو اپنے ایک معتمد کے ذریعہ سے دیا۔ اس نے کہا کہ "اس بڈھے خلیفہ کو لکھ دو کہ محض عباسیوں کی خاطر میں نے دنیا بھر سے لڑائی مول لی ہے۔ قرامطہ کو میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور جس کسی کے متعلق ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ قرمطی ہے تو فوراً اس کو دار پر چڑھا دیتا ہوں اگر یہ تحقیق ہو گیا کہ حسنک قرمطی ہے تو امیر المومنین کو اس کا انجام بھی معلوم ہو جائے گا لیکن اس کی میں نے پرورش کی ہے اور وہ مثل میرے بھائی اور بیٹوں کی ہے وہ قرمطی ہے تو میں بھی قرمطی ہوں۔" آخر میں محمود نے خلعت کو خلیفہ بغداد کے پاس بھجوا دیا۔ جس کو خلیفہ نے جلوا دیا اس طرح خلیفہ بغداد کی تشفی ہو گئی اور بات گئی گذری ہوئی۔ (ملاحظہ ہو بیہقی ص۲۱۲) [3] ڈاکٹر ناظم ص۱۵۷ بحوالہ حاجی خلیفہ جلد دوم ص۳۲۷ و قصیدہ عسجدی کا شعر ؎ بردادن صلات کتابی بکرد شاہ + چونانکہ بو حنیفہ کتاب صلات کرد، شعر العجم جلد اول ص۵۵ طبع چہارم [4] بعض طبع زاد اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

بہ زخم تیغ جہاں گیر و گرز قلعہ کشائے	جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
بسے بلاد گرفتم بہ یک اشارت دست	بسے قلاع گرفتم بیک فشردن پائے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہیں۔ لیکن اس کی علم دوستی کا شاید سب سے اچھا ثبوت وہ عالی شان مدرسہ اور کتب خانہ ہے جو اس نے غزنی میں تعمیر کرایا تھا اس کے سالانہ مصارف کے لئے جاگیریں اور گانوں وقف تھے[1] حقیقتاً وہ ایران کی ادبی "نشاۃ جدیدہ" کا عظیم الشان مربی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ عربی حکومت کے زوال پر جب ایرانی النسل بادشاہوں کی حکومتیں قایم ہوئیں تو ایرانیوں کو اپنی قومی زبان اور قومی روایات کے از سرِ نو زندہ کرنے کا خیال آیا۔ اور ہر چھوٹا بڑا دربار اس تجدیدی تحریک کا مرکز بن گیا۔ لیکن محمود کی تخت نشینی کے وقت تک فارسی علم و ادب کا سرمایہ نہایت قلیل تھا۔ نثر میں گنتی کی چند کتابیں تھیں نظم میں زیادہ تر قطعات و رباعیات کا رواج تھا۔ قصیدہ و غزل نہایت ابتدائی حالت میں تھے۔ محمود کی قدردانیوں نے نہ صرف تاریخ و اخلاق کے فنون کو ترقی دی بلکہ محمودی شعرا نے شاعری کے اصل فن کو ترقی دے کر زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں۔ واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہارِ جذبات، قدرتی مناظر کی تصاویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ البتہ قصیدہ کے مقابلہ میں غزل پیچھے رہ گئی سو اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی ابھی ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ یہ زمانہ اسلام کی ترقی کے شباب کا تھا۔

محمود کی علمی قدردانی اور شاہانہ داد و دہش نے دور دور کے علماء و شعراء کو کھینچ کھینچ کر غزنی بلا لیا بقول فرشتہ "چار سو متنین شاعر سلطان کے ملازم تھے"[2] جن پر وہ سالانہ چار لاکھ دینار خرچ کرتا تھا[3]۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعراء کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانبردار کو میسر نہیں ہوا اُن شعراء کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دئے۔ جن شعراء نے محمود کے دربار میں شہرت پائی اور جو واقعی آسمانِ سخن کے سبعہ سیارے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چو مرگ تاختن آرد ہیچ سود نبود بقار بقائے خداوند و ملک ملک خدائے

(منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۲۰ از ملا عبدالقادر بدایونی)

نوٹ:۔ صاحب تاریخ گزیدہ نے انھیں اشعار کو سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف منسوب کیا ہے۔ [1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۰ [2] ایضاً صفحہ ۳۹ [3] گزیدہ صفحہ ۳۹۵

وہ یہ ہیں۔ "عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضائری، فرخی، منوچہری"[1]

فردوسی کے سوا باقی تمام شعرا نے قصیدے لکھے ہیں جن میں سلطان کی ہندوستانی فتوحات کی طرف اشارے ہیں "عنصری نے ۱۸۰ اشعار کا قصیدہ لکھا۔ جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں"[2] عسجدی و فرخی شاید سلطان کی مہم سومنات میں شریک تھے۔ عسجدی نے اس کے متعلق ایک زبردست قصیدہ لکھا تھا جس کے فقط چند شعر محفوظ ہیں۔ مطلع تھا۔

تا شاہِ خسرواں سفرِ سومنات کرد   کردار خویش را عَلَمِ معجزات کرد[3]

اس سے زیادہ پُرزور قصیدہ فرخی کا ہے جو اس نے اس فتح کی یادگار میں لکھا تھا۔ اس قصیدہ میں سفرِ سومنات اور فتح کی تمام تفصیلات درج ہیں۔[4] اس قصیدہ میں ۱۷۵ اشعار ہیں، مطلع ہے ؎

فسانہ گشت وکہن شد حدیثِ اسکندر   سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر

سلطان محمود کی قدر شناسی کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس نے حکیم بو علی سینا[5] ...... اور ابوریحان[6] بیرونی کو جو شاہ خوارزم کے دربار میں تھے اپنے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی ان کے بلانے کے لئے اس نے اپنا ایک خاص سفیر روانہ کیا جو خود بھی اپنے زمانہ کا ایک نہایت نامور فاضل تھا اس سفیر کا نام خواجہ حسین بن علی بن میکال ہے۔

---

[1] و [2] شعر العجم جلد اول ص۵۹ طبع چہارم [3] قاضی منہاج الدین سراج جورجانی نے اس مطلع کا ایک قصیدہ عنصری کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کے دو شعر لکھے ہیں ؎ تا شاہِ خسرواں سفرِ سومنات کرد + آثار غزو را عَلَمِ معجزات کرد
شطرنج ملک باخت ملک با ہزار شاہ + ہر شاہ را بلعب دگر شاہ مات کرد (طبقات ناصری ص۱۰)
[4] دیوان حکیم فرخی ص۶۶ تا ص۶۷ [5] حکیم بو علی سینا ایک آزاد قسم کا انسان تھا اس نے محمود کے دربار میں آنے سے اس لئے انکار کردیا کہ سلطان کو اس کے خیالات ناگوار گذرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس جگہ اور جس شہر میں وہ جاتا محمود کے عُمّال اس کا تعاقب کرتے یہاں تک کہ بالآخر اس کو رَے کے دیلمی فرمانروا کے یہاں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ برخلاف اس کے بیرونی کو طوعاً و کرہاً غزنی آنا پڑا۔ بو علی سینا کی مختصر سوانح عمری حبیب السیر میں درج ہے۔
[6] البیرونی کے حالات پر اخفار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ فقط اس کی تصانیف میں کہیں کہیں اس کے قلم سے اپنی نسبت جو کوئی لفظ ٹپک گیا ہے اسے پھیلا کر اس کی داستانِ حیات ترتیب دینی پڑتی ہے۔ وہ خوارزم (خیوا) کے قریب ایک گاؤں بیرون میں ۳۶۲ھ ۹۷۳ء میں پیدا ہوا، ۲۳ برس تک اپنے وطن میں رہا پھر کئی سال شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار سے وابستہ رہا اور یہیں "آثار الباقیہ" نامی کتاب سنہ ۳۹۰ھ میں مرتب کی اس کے بعد وہ خوارزم چلا آیا۔ سلطان

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

شاعری پر اُس نے جس حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین آیا اور شعراء نے دربارِ عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینبی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے[1]۔ غضائری رازی کو جوڑے کا ایک شاعر تھا دو شعروں پر دو توڑے (۱۴ ہزار درم) دیئے چنانچہ غضائری خود کہتا ہے ؎

مراد و بیت بفرمود شہریارِ جہاں ... برآں صنوبرِ عنبر عذارِ مشکیں خال

دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم ... برغم حاسد و تیمار بد سگال نکال

ملک الشعراء عنصری کا منہ ایک برجستہ قطعہ کہنے پر تین بار موتیوں سے بھر گیا۔ یوں بھی عنصری کی جو پہلے ایک نادار شخص تھا دولت مندی مشہور ہے۔ سلطان کی فیاضی کے طفیل چار سو زریں کمر بستہ غلام اُس کے جلو میں چلتے تھے اور ظروف میں اس کی دیگیں تک طلائی یا نقرئی تھیں[2]۔ اُس کا اسبابِ سفر چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔

فردوسی کے سلسلہ میں محمود کے بخیل ہونے کا جو قصہ مندرج ہے وہ حقیقت سے دور اور بے بنیاد ہے۔ وہ شخص جو چار لاکھ اشرفی سالانہ مستقلاً علماء و شعراء پر صرف کرے، جو دار العلوم اور اس کے مصارف کے لئے ایک زبردست جائداد وقف کر دے، جو طلباء اور شائقینِ علم کی ہمت افزائی میں ہمیشہ اپنے خزانے کا منہ کھلا رکھے، جو حوضوں اور فواروں، محلوں، مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر میں دولتِ خطیر صرف کرنے سے گریز نہ کرے، جو ایک ایک شعر پر تین تین بار ایک شاعر کا منہ جواہرات سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) محمود نے جب خوارزم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو اُسے غزنی آنا پڑا۔ یہاں پہلے محمود اور بعد کو مسعود نے اُس کی سرپرستی کی۔ مؤخر الذکر کے نام سے اُس نے "قانونِ مسعودی" معنون کی بالآخر ۷۰ سال کی عمر میں ۱۱۴ سے زیادہ علمی کتابیں لکھنے کے بعد ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔ اُس کی شہرت کا اصل سبب اُس کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو علمی دنیا میں "کتاب الہند" کے نام سے موسوم ہے۔ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی نے اُس کا ترجمہ اُردو میں کرا کر دو جلدوں میں شائع کرا دیا ہے۔ ڈاکٹر سخاو جنہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا ہے شہادت دیتے ہیں کہ آج بھی دورِ جدید کی تمام آسانیوں کے باوجود اتنی صحت اور وسعتِ نظر کے ساتھ قدیم ہند پر ایسی محققانہ کتاب لکھنا جیسی بیرونی لکھ گیا ہے سالہا سال کی محنت کا کام ہے۔ بیرونی نے ہندو اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ کم و بیش بیس کتابیں لکھی ہیں۔ (مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو علوم عرب جلد سوم باب علوم دخیلہ (ج) مصنفہ علامہ جرجی زیدان و "ہندو عرب کے تعلقات" باب سوم مصنفہ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم) [1] بحوالہ شعر العجم جلد اول صلا [2] بحوالہ چہار مقالہ ص۴۵ [3] بحوالہ شعر العجم جلد ا ص۵۵ طبع چہارم

بھر دے، جو ایک معمولی سی اور وہ بھی غیر زبان کی نظم پر اپنی فتوحات سے فائدہ اُٹھا کر ایک غیر مذہب والے مفتوح شخص (راجہ کالنجر) کو پندرہ پندرہ قلعے تفویض کر دے، جس کا دربار دنیا کے ادبار و حکماً کا مخزن رہا ہو، کیا اس کی نسبت کوئی دانش مند شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ طامع اور بخیل تھا؟ نظامی سمرقندی کے قول کے بموجب فردوسی شاہنامہ کو طوس کے گورنر کی خدمت میں پیش کر کے بطور صلہ حکومت کے محاصل سے آزادی حاصل کر چکا تھا محمود کے ۲۰ ہزار درم کا عطیہ اُس پر مستزاد ہے لیکن شاعر کے نزدیک یہ عطیہ اُس کے حوصلے سے کم تھا اس لئے دوسرے موقع پر محمود کا شاعر کو خوش کرنے کے لئے ۶۰ ہزار دینار بھیجنا اُس کے وسیع القلب اور فیاض ہونے کا بیّن ثبوت ہے[1]۔ محمود کی علم پروری اور ذوقِ ادب کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی مثالیں مورخین نے پیش کی ہیں وہیں ایک نمایاں مثال وہ بھی ہے جو صاحبِ طبقاتِ اکبری نے بیان کی ہے اور وہ یہ کہ کالنجر کے راجہ نندا نے یہ دیکھ کر کہ وہ محمود کے محاصرہ کی تاب نہیں لا سکتا تین سو ہاتھی پیش کرتے ہوئے صلح کی درخواست کی چوں کہ اُن ہاتھیوں پر کوئی مہاوت نہ تھا اس لئے محمود نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انھیں پکڑ کر سوار ہو جائیں چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ نندا یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور محمود کی تعریف میں چند اشعار ہندی زبان میں لکھ کر پیش کئے۔ محمود نے اپنے ہندو ساتھیوں سے اُن اشعار کو پڑھوا کر سنا۔ اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے اس قدر بے مثل تھے کہ محمود اپنے صحیح مقصود کو بھی بھول گیا اور اُس نے بے اختیار ہو کر پندرہ قلعوں کی حکومت جن میں کالنجر بھی شامل تھا راجہ کو بخش دی، تحائف دیے۔ اس کے علاوہ فرشتہ نے بھی اس واقعہ کو انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے (فرشتہ جلد اول ص ۳۳)۔ سلطان کے ادبی ذوق کی شاید سب سے عمدہ شہادت یہ ہے کہ اس نے عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ سب شعراء کا کلام دیکھے اور بغیر تنقید و اصلاح کسی کے اشعار دربار میں پیش نہ ہوں۔

---

[1] علامہ محمود خاں شیرانی نے فردوسی و محمود پر سیر حاصل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ فردوسی کے معاملہ میں محمود کو متہم کیا گیا ہے (ملاحظہ ہوں رسائل اردو از مولوی عبدالحق صاحب بابتہ سال ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء)

اِن تمام واقعات کو ممکن ہے کہ ایک نکتہ چیں محمود کے فضائل کے بجائے اُس کے معائب کے دفتر میں لکھے لیکن اسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محمود کی یہ فیاضیاں مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فنِ ادب و تاریخ کی ترقی کی غرض سے تھیں اُس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا لیکن اُس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے۔ بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا۔ اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور فارسی صنائع و بدائع پر ایک کتاب لکھی۔ غرض کہ محمود کی سرپرستی اور شعرار کی عرق ریزی نے فارسی شاعری میں غزل کے سوا ہر صنفِ شعر کو اوجِ کمال پر پہنچایا اور یہی وہ علمی خدمات ہیں جو اُس کے نام کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضامن ہیں اسی چیز کو نظامی عروضی سمرقندی نے اس طرح دکھایا ہے ؎

بسا کاخے کہ محمودش بنا کرد	کہ در رفعت ہمی بامہ مِرا کرد[1]
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے	مدیح عنصری ماند است برجائے

یعنی سلطان محمود نے بہت سی عمارتیں بنائیں جو بلندی میں چاند پر چشمک کرتی تھیں اُن کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قایم نظر نہیں آتی لیکن عنصری نے اس کی تعریف میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ آج تک سلامت ہے محمود غزنوی قانوناً خلیفۂ بغداد کا ایک باج گذار لیکن عملاً بااختیار بادشاہ تھا اُس نے اپنے آقایئی خلیفۂ بغداد کے اقتدار کو بحال کرنے کے لئے دنیا بھر سے لڑائی مول لے لی۔ قرامطہ کا استیصال اُس نے کیا، تاتاری و ایرانی حکمرانوں سے بنرد آزمائی اُس نے کی اور یہ سب خلیفۂ وقت کے خوش کرنے یا پھر اپنی سلطنت کی توسیع و استحکام کے لئے۔ اُس کو اپنے مفتوحہ و مقبوضہ علاقہ سے یکساں لگاؤ تھا۔ محترم پروفیسر حبیب صاحب کا یہ خیال صحت طلب ہے کہ "سلطان ایک وسط ایشیائی حکمراں تھا اور عجم کی تاریخی سرزمین ہی اُس کی امیدوں کا ملجا و ماوی تھی"[2] اس میں شبہ نہیں کہ توسیعِ حکومت کے لئے وسط ایشیائی علاقے زیادہ موزوں تھے اور محمود نے اسے نظر انداز نہیں کیا لیکن واقعات شاہد ہیں کہ اُسے

---

[1] بحوالہ چار مقالہ صـ۳۶ [2] علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم جلد اول کے صـ۵۹ پر مصرا ۱، کی جگہ "ندا" لکھا ہے اور "ور"، کی جگہ "از" اس طرح پورا مصرع یوں تحریر ہے "کہ از رفعت ہمی بامہ ندا کرد"

[3] سلطان محمود غزنوی از پروفیسر محمد حبیب صاحب صـ۸۵ ترجمہ

اپنے ہندی مقبوضات ومفتوحات پر بھی بہت نازتھا۔ پنجاب وسندھ کا باقاعدہ الحاق کرلیا گیا تھا، قنوج و کالنجر اور گجرات کے علاقے باجگذار بنا لئے گئے۔ گو امتدادِ زمانہ سے مقبوضہ ومحروسہ علاقے کا بڑا حصہ اس کی اولاد کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن پنجاب آخر تک سلاطین یمینیہ کا ماویٰ ومستقر رہا۔

سلطان کو ہندوستان اور وہاں کے نفائس ونوادر سے جو دلچسپی تھی اُن کی بعض مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ روایت ہے کہ قنوج ومتھرا کے سفر سے واپس آنے کے بعد جب اُس نے غزنی میں ایک وسیع ورفیع مسجد "عروسِ بہشتی" اور ایک عالی شان مدرسہ وکتب خانہ کی بنیاد ڈالی تو ان عمارات کے لئے بہترین سنگ مرمر اور سنگِ رخام ہندوستان کی کانوں سے منگوایا اور ان کے متعلق جو باغ لگوایا اس میں درخت بھی ہند وسندھ کے نصب کرائے ان درختوں کو وہاں بویا نہیں گیا تھا بلکہ پرورش یافتہ بڑے بڑے درخت یا پودے بجنسہٖ اکھڑوا کر غزنی منگوا لئے گئے تھے[1]۔ ایک دوسری روایت کے بموجب سلطان نے سومناتھ کی فتح کے بعد گجرات کو اپنا مستقر بنانے کا ارادہ کرلیا تھا گو اس ارادے پر ساتھ والوں کے جوشِ حبِ وطن کی وجہ سے عمل نہ ہوسکا تاہم یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کیا کم ہے کہ اسے ہندوستان سے دلی لگاؤ تھا۔

مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر جو شے اُسے بادشاہ ہند کہلائے جانے کے مستحق گردانتی ہے وہ یہاں کے راجہ مہاراجاؤں کی طرح جنگی ہاتھیوں کی غور وپرداخت اور قدردانی ہے وہ اس "مہیب آلہ جنگ" کا ازحد شائق تھا چنانچہ یہ قصہ مشہور ہے کہ جب محمود نے قلعہ مینیا یک یا مینیچ کو ۱۹؁ میں فتح کیا تو گو راجہ چندر رائے بچ کر نکل گیا لیکن اس کا سب سے بڑا ہاتھی جو ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا ایک رات کسی طرح ازخود شاہی لشکر میں آگیا۔ سلطان کو اس سے بے حد خوشی ہوئی اور یہ ہاتھی جسے سلطان پہلے بڑی سے بڑی قیمت پر راجہ سے خریدنا چاہتا تھا اور جسے راجہ نے دینے سے انکار کردیا تھا "خداداد" کے نام سے شاہی فیل خانہ میں داخل کرلیا گیا[2]۔ سلطان کے پاس ان ہاتھیوں کی جتنی تعداد جمع ہوگئی

---

[1] فرشتہ ص ۳۰۔ ترجمہ تاریخ یمینی میں یہ عبارت نظر سے گزری "واز نواحی اقطار سند وہند درختے چند بیاوردند"

[2] فرشتہ ص ۳، تحفۃ الکرام ص ۔۔۔ ۲۵۰۰ ہاتھی غزنی کے فیل خانہ میں تھے۔

تھی اتنی اب تک کسی مسلمان فرمانروا کے وہم وخیال میں بھی نہ گذری ہوگی بلکہ خود ہندو راجہ مہاراجاؤں میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ہاں فیل خانۂ غزنی کے برابر ہاتھی موجود ہوں۔

سلطان محمود نے جس طرح ہندی ہاتھیوں سے فائدہ اٹھایا اسی طرح ہندی سپاہیوں سے بھی کام لیا۔ معرکۂ ٹگو کوٹ کے بعد سلطان نے مستقلاً دس بارہ ہزار ہندی فوج ملازم رکھی جو اپنے ہندو سپہ سالاروں کے ماتحت غزنی کے تخت کی حفاظت کے لئے ایران و ترکستان کے معرکوں میں اسلامی فوجوں کے دوش بدوش شیرو آزما ہوتی۔ ہندوؤں کے اس فوجی دستے کے علاوہ غیر سپاہی پیشہ ہندوؤں کی تو ۱۰۲۰ء کے بعد ہی غزنی میں وہ کثرت ہوگئی تھی کہ فرشتہ کے الفاظ میں "غزنین دراں سال از بلاد ہندوستاں می شمردند"[۱] دارالسلطنت غزنی میں ہندوؤں کو اپنے معتقدات کے بموجب سنکھ بجانے اور بتوں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ المعری نے رسالۃ الغفران صـ ۱۵۳ پر ایک عورت کے ستی ہونے کا واقعہ درج کیا ہے۔

الغرض سلطان محمود کے ہندوستان سے دلچسپی لینے کا ہند کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر پڑا اوّل تو ممالک سندھ و ملتان میں جہاں عربوں کے زوال اور قرامطہ کی بے پروائی سے اسلام کی قوت نہایت ضعیف ہوگئی تھی مسلمانوں کے قدم پھر جم گئے۔ دوسرے پنجاب کا وسیع و سرسبز علاقہ مستقل طور پر سلطنت غزنی کا جزو بن گیا جس سے سیاسی، سماجی، علمی اور تمدنی شان دار نتائج برآمد ہوتے، مگر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ محمود ہی کے حملوں نے مسلمانوں کو آئندہ تمام ہندوستان فتح کرنے کا راستہ دکھایا۔

اس کی لڑائیوں کا مقصد اشاعتِ مذہب کبھی بھی نہ تھا بلکہ یہ لڑائیاں دشمنوں سے انتقام لینے اور حکومت کی توسیع کے لئے لڑی گئیں[۲]۔ محمود گیارہویں صدی عیسوی کا بادشاہ تھا اس میں قرونِ اولیٰ کے

---

[۱] سوینیدر رائے ، تلک ناتھ وغیرہ [۲] بحوالہ فرشتہ صـ ۲۸ [۳] اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ غزنوی دور کے مورخین ابوالفضل بیہقی مصنف "تاریخ مسعودی" اور ابو النصر عتبی مصنف "تاریخ یمینی" وغیرہ سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے ملازم تھے اس لئے جب کبھی وہ ان بادشاہوں کی جنگوں کا ذکر کرتے تھے تو اپنے مربیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کا مقصد تہذیب و مذہب کی اشاعت بتاتے تھے حالاں کہ یہ جنگیں سراسر ملک گیری کے لئے ہوتی تھیں۔ موجودہ زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ملک پسماندہ اقوام کو محکوم بناتے وقت اپنا مقصد تہذیب و تمدن کی اشاعت بتاتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد اپنی حکومت اور تجارت کی ترقی ہوتا ہے اسی طرح محمود اور دوسرے بادشاہوں کی لڑائیاں اپنی طاقت اور شان و شوکت کو بڑھانے (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

مسلمانوں کی خوبیاں تلاش کرنا بے کاری بات ہے۔ لڑائیاں بعض اہم سیاسی وجوہ کے بنا پر لڑی گئیں۔ اس کے جارحانہ اقدام سے ملک کی ثروت کو صدمہ پہنچا ہندوؤں کی قوت پارہ پارہ ہوگئی یہ سب باتیں مسلم اور اپنی جگہ پر صحیح سہی لیکن اُس کے فاتحانہ اقدام کو اسلام کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں نفرت کا سبب گرداننا صحیح نہیں ہے۔ اس کی ۳۳ سالہ زندگی کا ریکارڈ آپ کے سامنے ہے اُس پر غور کیجئے اور پھر بتایئے کہ اُس نے حالتِ امن میں کس مندر کو محض مذہبی تعصب کی بنا پر لوٹا یا کس ہندو کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اس کے برخلاف اُس کی زندگی مذہبی رواداری کی مثالوں سے بھرپور ہے۔ اُس نے راجگان پنجاب کی بدعہدیوں کو بار بار انگیز کیا۔ اپنے حلیف راجہ قنوج کی خاطر کالنجر کے دو چکر لگائے بالآخر اس کو بھی اپنا کر چھوڑا۔ راجہ گجرات سے جو کچھ سلوک کیا وہ بھی سامنے ہے پھر کیوں کر اس کی روش کو وجہ منافرت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کو نہ صرف مسلمانوں سے بلکہ تمام دیگر اقوام سے اجتناب ضرور رہا ہے اور ایک حد تک مہاتما گاندھی جی جیسے[۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے لئے ہدی تھیں اور یہ چیز اس زمانہ کے ہندو و مسلمانوں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی تھی۔

بہر حال مورخین کی مذکورہ بالا خصوصیت کے علاوہ ان کے طرز تحریر پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔ مبالغہ اور لفاظی فارسی نثر نویسیوں بلکہ عام مشرقیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی بادشاہ نے ایک دو مندر مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کر دیں تو یہ مورخین تحقیق کئے بغیر اس واقعہ کا ذکر یوں کریں گے کہ سیکڑوں یا ہزار ہا بت خانے توڑے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ حالانکہ یہ مبالغہ اور لفاظی کے سوا کچھ نہیں (تصنیف ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صفحہ ۳۹) مثلاً قطب الدین ایبک کے متعلق ایک فارسی مورخ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی میں ایک ہزار بت خانے گرا کر ایک ہزار دار العلوم قائم کئے تھے اس بیان کو اگر سنجیدگی کے ساتھ پرکھا جائے تو قطعی ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے ایک شہر میں چار سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ چار سال بھی بیشتر لڑائیوں اور دوسری الجھنوں کی نذر ہوئے وہ اس قلیل مدت میں کس طرح ایک ہزار مدرسے قائم کر سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائی ٹس نے مدرسوں کی اس تعداد کو مشکوک قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ابتدائی مورخوں کی تحریروں کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں سے پرکھنا پڑے گا۔ ان کے ہر بیان کو لفظاً و معناً صحیح سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ ایلیٹ صاحب نے فارسی تواریخ کے لغوی ترجمہ مرتب کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ انگریزی مورخین جن کی رسائی اصل فارسی کتب تک نہیں ہوتی وہ ترجمے کو پڑھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

[۳] وفٹ نوٹ نمبر ۱:۔ سلطان محمود غزنوی از پروفیسر حبیب صاحب صفحہ ۸۰ ترجمہ [۳] آج ہماری گردنیں دنیا کی اقوام کے آگے شرم و ندامت کی وجہ سے جھکی ہوئی ہیں کہ ہمارے ہی ایک ہندی بھائی ناتھو رام ونیکسے کے ہاتھوں اس دنیا کے مخلص اعظم کی جان لے لی گئی۔ یہ واقعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء بروز جمعہ بوقت ۵ بجے شام کا ہے۔

مخلص ہمدردی کی کوششوں کے باوجود اس زمانہ میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے لیکن غزنوی دور میں اس کے اسباب کچھ اور ہی تھے جن کا تفصیل کے ساتھ البیرونی نے کتاب الہند میں تذکرہ کیا ہے[1]۔ محمود نے تو اس نفرت و مغائرت کو ایک حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرکے اور مذہبی رواداری سے کام لے کر انھیں اس امر کا موقع دیا کہ وہ مسلمانوں کو قریب سے رہ کر دیکھیں اور سمجھیں۔ اسی طرح اُس نے سازشی و معاند گروہوں کو جو ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت بڑھانے کا سبب ہو سکتے تھے بجائے قتل کرنے کے پکڑ پکڑ کر لا بسایا تاکہ وہ مسلمانوں سے اور مسلمان ان سے مانوس ہو جائیں۔

قدرت نے محمود کو ظاہری حسن و جمال سے محروم رکھا تھا۔ اُس کا قد میانہ اور اعضا متناسب تھے۔ چیچک کے داغوں نے چہرے کی رونق مٹا دی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ سلطان آئینہ دیکھ کر بہت ملول ہوا اور اپنے وزیر سے کہنے لگا "بادشاہوں کی صورت رعایا کی بصارت کو قوت بخشتی ہے لیکن عجب نہیں کہ میری شکل دیکھنے والے کی آنکھ کو تکلیف پہنچائے" حاضر جواب وزیر نے عرض کیا "ہزار میں ایک بھی حضور کی صورت نہیں دیکھتا مگر سیرت کا سب پر اثر پڑتا ہے حسب معمول نیکی کی طرف متوجہ رہئے ہر شخص آپ سے محبت کرے گا"۔ محمود کو تمام مورخین نے متفقہ طور پر سلیم الطبع، شجاع، مستقل مزاج حلیم و بُردبار اور علم دوست تسلیم کیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک سبب کچھ تو اس کی فطری صلاحیت تھی جو قدرت نے اس میں ودیعت کی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کا اٹھان سبکتگین جیسے بے مثل صفات کے فرماں روا کے ہاتھوں ہوا۔ سبکتگین نے محمود کی تربیت میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا تھا چنانچہ مشہور ہے کہ محمود نے اپنی کم سنی میں ایک باغ نہایت محنت سے تیار کرایا اور اس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت بھی تعمیر کرائی۔ سبکتگین جب مہمات ملکی سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس نے یہ باغ دیکھ کر محمود سے کہا کہ "اے جان پدر ایسے باغ و محلات تو ایک معمولی امیر بھی تیار کرا سکتا ہے میں تو تجھ سے ایسی عمارت کی توقع رکھتا ہوں جس کی نظیر کہیں نہ ملے"۔ محمود نے دریافت کیا کہ وہ عمارت کیسی ہے۔ سبکتگین نے جواب دیا کہ وہ تعمیر ہے اہل

---

[1] کتاب ہذا کی جلد دوم میں اُن وجوہات کو تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ [2] ریاست نادر اور گزیدہ ص۲۹۵ کی اس روایت کو ابن اثیر اور سبط ابن الجوزی نے غلط مانا ہے۔ اُن کا کہنا ہے۔ سلطان میانہ قد کا حسین اور خوش رو نوجوان تھا جسم گٹھا ہوا آنکھیں چھوٹی۔ گول زنخداں اور داڑھی کے بال گنے چنے تھے۔

فضل و کمال کے دلوں کی جو قائم رہنے والی ہے اور جس پر کسی نہال کا نصب کرنا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا ہے۔[1]
جنھوں نے محمود کی سیرت کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ باپ کی نصیحت پر اُس نے کس حد تک عمل
کیا اور اس باب میں وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جوان ہو کر محمود نے سارے عالم
کو اپنی شہرت سے معمور کر دیا۔

محمود اپنے بیٹے مسعود کی طرح قوی، پہلوان اور دیو ہیکل نہ تھا لیکن جسم سڈول اور گٹھیلا پایا تھا۔ مسلسل
مسافتوں کی تکالیف اس کا جسم بآسانی سہار لیتا تھا۔ بہ حیثیت سپہ سالار کے محمود یہ بخوبی جانتا تھا کہ بلا وجہ
جان کو خطرہ میں ڈال دینا بہادری کی دلیل نہیں ہے لیکن اگر کبھی موقع آن پڑا ہے تو محمود ہاتھی پر سوار ہو کر
دشمن کے ٹڈی دل میں گھس گیا ہے اور دادِ شجاعت ہی دے کر لوٹا ہے۔ محمود کو جو چیز سب پر غالب کر دیتی تھی
وہ اُس کی اعلیٰ دماغی قابلیت تھی۔ سخت سے سخت الجھی ہوئی گتھیوں کو وہ بات کی بات میں ناخنِ تدبیر سے
سلجھا دیتا اور ایک نظر میں گرد و پیش کے آدمیوں کی دلی کیفیات کا جائزہ لے لیتا۔ صاحب زینت المجالس
نے بحوالہ تاریخ ناصری لکھا ہے کہ محمود ایک مرتبہ ہرات میں آیا تو مجلس وزراء کے ایک امیر عبدالرحمٰن نامی
کو قیام کرنے کے لئے ایک نہایت فاضل بزرگ کا مکان دیا گیا۔ یہ مکان نہایت عمدہ اور وسیع تھا۔ امیر کی
نیت بگڑ گئی اور اُس نے اس مکان پر اپنا قبضہ جمانا چاہا چنانچہ ایک مناسب موقع پر اُس نے محمود سے
اُس بزرگ کی شکایت کی اور کہا کہ "میں ایک دفعہ اچانک اس بزرگ کے حجرہ میں داخل ہو گیا میں نے
دیکھا کہ اُس کے سامنے ایک برنجی بت رکھا ہوا ہے اور قریب میں شراب سے لبریز ایک پیالہ۔ اُس نے پہلے
شراب پی اور پھر اُس بت کے سامنے سرنگوں ہو گیا چنانچہ میں اُس بت اور برتن کو لے آیا ہوں جو حکم مناسب
ہو دیا جائے۔" محمود نے حکم دیا کہ "صاحب مکان کو لایا جائے" محمود نے اُس بزرگ کو تھوڑی دیر غور سے دیکھا
اس کے بعد عبدالرحمٰن کو بُری طرح ڈانٹا اور کہا کہ "اے بزدل سچ بتا تو نے ایسی لغو بات کیوں کہی اور تو اس
درویش کا کیوں دشمن ہو گیا ہے؟" آخر کار عبدالرحمٰن کو اقرار کرنا پڑا کہ یہ جھوٹی شکایت صرف اس لئے کی تھی
کہ اس طرح اس کا مکان ضبط کر لیا جائے گا اور مجھے مل جائے گا۔"

---

[1] فرشتہ بحوالہ مآثر الملک جلد اول ص ۱۷

محمود میں حکومت کا مادہ خداداد تھا وہ کبھی نچلا نہ بیٹھتا اپنے دل کا حال گہرے سے گہرے دوست پر بھی ظاہر نہ ہونے دیتا۔ وزیروں اور مصاحبوں سے خلا ملا ضرورت سے زیادہ نہ رکھتا۔ مصاحبوں کو اُمورِ سلطنت میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ تیز فہمی اور دور اندیشی اُس کی سرشت میں تھی وہ ہر پہلو سے اپنے فائدے کو پیشِ نظر رکھتا تھا۔ سلطان کے بارے میں عفو و درگذر اور رحم و انصاف کی متعدد روایات ہیں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کیا جائے گا۔

ایک مرتبہ ایک داد خواہ حاضر ہوا اور کہا کہ خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تخلیہ ہوتے پر اُس نے محمود سے کہا کہ "آپ کا ایک عزیز روزانہ رات کو میرے گھر آتا ہے اور مجھے گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ میں انصاف کی غرض سے آپ کے پاس آیا ہوں اگر آپ انصاف کرتے ہوں تو کیجئے ورنہ میں معاملہ کو منصفِ حقیقی پر چھوڑ دوں" محمود یہ سُن کر آب دیدہ ہو گیا اور کہا کہ آئندہ جس وقت وہ شخص تیرے گھر میں آئے تجھے فوراً اطلاع کر۔ چنانچہ تیسرے روز وہ شخص پھر آیا اور کہا کہ "اس وقت وہ آدمی گھر میں موجود ہے" محمود نے یہ سنتے ہی تلوار ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مرد اور عورت پلنگ پر سو رہے ہیں۔ محمود نے فوراً چراغ گل کر کے اپنی تلوار سے مرد کا سر قطع کر دیا اور پھر چراغ روشن کر کے مقتول کا چہرہ دیکھا اور خدا کا شکر ادا کر کے پینے کے لئے پانی مانگا۔ مستغیث نے چراغ گل کرنے اور پانی پینے کا سبب پوچھا تو کہا کہ "چراغ اس لئے گل کر دیا تھا کہ کہیں مجھے صورت دیکھ کر رحم نہ آجائے اور پانی پینے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں اس ظلم کا انسداد نہیں کر لوں گا پانی نہیں پیوں گا۔ آج میں تین دن کا پیاسا تھا اس لئے تشنگی رفع کرنے کے لئے پانی مانگا تھا"

ظالموں سے انتقام لینے میں وہ کس قدر سخت تھا اس کا اندازہ اس حکایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے ایک بار کچھ تحائف فرمانروائے کرمان کے پاس روانہ کئے۔ راستہ میں قزاقوں نے سارا سامان لوٹ لیا اور سفارت کے چند آدمیوں کو بھی قتل کر دیا محمود کو اس واقعہ کی خبر اس وقت ملی جب کہ وہ خوارزم کی طرف جا رہا تھا جب محمود بست میں پہونچا تو شہزادہ مسعود ہرات سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن محمود نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے کہا کہ "میں تمہاری صورت کیوں کر دیکھ سکتا ہوں جب کہ

تمہارے علاقے میں ظلم و بے امنی کا یہ حال ہے۔ میں تم سے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ ڈاکوؤں کے ظلم سے رعایا کی جانیں محفوظ نہ ہوجائیں"، چنانچہ مسعود واپس گیا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اس گروہ کو گرفتار کرکے محمود کے سامنے پیش کیا۔ (ریاست نامہ)۔ اسی طرح عراق کی اُس بڑھیا کا واقعہ نہایت مشہور ہے جس نے اپنا قافلہ لٹ جانے کے بعد محمود کو تنبیہ کی تھی کہ وہ دور و دراز مقامات کا انتظام نہیں کرسکتا تو کیوں اپنے ملک کو اس قدر وسیع کرلیا ہے (ریاست نامہ ص۵۵) الغرض محمود کی یہی انصاف پسندی تھی جس نے فردوسی کو یہ لکھنے پر مجبور کردیا کہ ؎

جہاں دار محمود شاہ بزرگ به آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

چو کودک لب از شیر مادر بشست به گہوارہ محمود گوید نخست

اُس کی دولت کا حساب لگانا محال ہے جو اسے چاروں طرف سے خراج و غنائم کی صورت میں حاصل ہوتی تھی۔ یہ سن کر کہ آلِ سامان کے خزانہ میں جواہرات کی مقدار سات[1] رطل سے زیادہ نہ تھی وہ اگر سجدۂ شکر بجالایا تو کچھ بے جا نہ تھا کیوں کہ خود اُس کے خزانے میں سو رطل سے زیادہ وزن کے بے نظیر جواہر موجود تھے[2]۔

لیکن وہ اپنے خزانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے والوں میں نہ تھا اُس نے حکومت کے استحکام اور علوم و فنون کی ترقی کے لئے نہایت فیاضی و فراخدلی کے ساتھ روپیہ کو پانی کی طرح بہایا۔ اس کے دربار میں شیعہ، ہندو، عیسائی، یہودی ہر ملت و مذہب کے اہلِ کمال موجود تھے[3]۔

عہدِ غزنوی کے کسی مخصوص قانون یا آئین کا پتہ تاریخ سے نہیں چلتا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمود تمام معاملات میں صرف مذہب اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا تھا اور کسی دوسرے آئین کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور اُس کے متقدمین کا بھی اسی پر عمل تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے اگر اس کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی تو کسی سے کمتر بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ذاتی عقائد کے لحاظ سے محمود ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا وہ خدائے واحد و حاضر کا دل سے معتقد تھا اور یہی ایمان و ایقان کی طاقت تھی جو ہمیشہ اس کے آڑے وقت میں کام آتی اور اُس کے قلب کو مطمئن رکھتی۔ خوفِ خدا کے متعلق اُس کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ

---

[1] رطل وزن میں غالباً چھ چھٹانک یعنی ۳۰ تولہ کے قریب ہوتا تھا [2] فرشتہ ص۳۶ [3] شعر العجم جلد ا ص۱۰۱ طبع چہارم

جب خلیفۂ بغداد نے اسے سمرقند پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی[1] تو سلطان محمود نے غضب ناک ہو کر ایلچی سے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار ہاتھی لے کر جاؤں اور سمرقند کو تباہ کر کے اُس کی مٹی تک اُن پر لاد کر غزنیں لے آؤں۔" خلیفۂ بغداد القادر باللہ نے اس کے جواب میں جو مراسلہ بھیجا اس میں بسم اللہ کے بعد صرف ایک سطر تھی اور اس میں بھی صرف ا ل م یہی تین حرف الگ الگ لکھ کر خط کو ختم کر دیا تھا۔ ان حروفِ مقطعات کو دیکھ کر تمام درباری حیران رہ گئے اور دیر تک مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ایک شخص نے بڑھ کر عرض کیا کہ شاید یہ سورۃ "الم ترکیف" کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ سنتے ہی سلطان دم بخود رہ گیا اور شدّتِ خوف سے اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ ایلچی سے بہت کچھ معذرت کی اور بیش قیمت تحائف کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عریضۂ ندامت و افسوس لکھ کر بغداد بھیجا۔ محمود فطرتاً بے انتہا منکسر المزاج تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا اور اُس کی فتوحات نے وسط ایشیا اور سرزمین ہند کے ایک معقول حصہ کا احاطہ کر لیا تھا لیکن اُس نے خود کبھی اپنے تئیں سلطان کہلانا مناسب نہیں سمجھا اور نہ "سکوں" میں اپنے نام کے ساتھ لفظ "سلطان" کا اضافہ کیا۔ تختِ خلافت کی طرف سے اُس کو یمین الدولہ، امین الملۃ، کہف الدولہ والاسلام کے خطابات ملے تھے اور طبقاتِ ناصری کی روایت سے "سلطان" کا خطاب بھی اُس کو دیا گیا تھا۔[2] لیکن محمود نے ہمیشہ لفظ "سلطان" کے استعمال سے احتراز کیا اور خلیفۂ بغداد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا۔

ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ اقرارِ رسالت، قیامت پر ایمان اور شعائرِ اسلامی کا احترام مسلمان پر فرض ہیں۔ محمود کے ہم عصر لوگوں نے یہ افواہیں اڑائی ہیں کہ وہ قیامت کا قائل نہیں تھا اور اس حدیث کے ماننے میں بھی اسے تامل تھا کہ علماء پیغمبروں کے قائم مقام ہیں۔ آخر کار ایک شب کو خواب میں[3] آنحضرت صلعم کی زیارت

[1] علامہ شبلی نے اس روایت کو بغداد پر منطبق کیا ہے ملاحظہ ہو شعر العجم جلد اول صفحہ۔ [2] طبقات ناصری ص۹ از منہاج الدین سراج [3] کہتے ہیں کہ سلطان کے دل میں یہ شبہ جاں گزیں تھا کہ سبکتگین اُس کا اصلی باپ نہ تھا ایک روز رات کے وقت جب سلطان محل میں واپس آیا تو اُس کی نظر طلائی چراغ پر پڑی اس نے حکم دیا کہ وہ چراغ اس طالب علم کو دے دیا جائے جو بازار دوکان کی روشنی میں مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی شب کو خواب میں آنحضرت صلعم کی زیارت نصیب ہوئی آپ نے فرمایا "سبکتگین کے بیٹے! تجھ کو خدا دونوں جہان میں با آبرو رکھے کیوں کہ تو نے ایک میرے جانشین کا احترام کیا ہے،" اس طرح سلطان کے تینوں شکوک ... رفع ہو گئے۔ (محمود غزنوی از پروفیسر محمد حبیب صاحب)

کے بعد اُس کے شکوک رفع ہوگئے اور وہ اولیار کرام کی خدمت میں برابر حاضر ہونے لگا اُس کو ابو الحسن خرقانیؒ سے خصوصی ارادت وعقیدت تھی۔[1] اگر اس روایت[2] پر غور کیا جاوے جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ سے ہم تک پہنچی ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ جس طرح وہ اس دنیا میں باآبرو رہا اسی طرح عقبیٰ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسے سربلند رکھا جو ایک مومن کا منتہائے مقصود ہے۔

---

[1] بیہقی ص ۲۳۳۔

[2] محمود غزنوی کے بارے میں ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ "بعد وفات اس کو خواب میں دیکھا گیا پوچھا کہ اللہ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا اُس نے جواب دیا کہ مجھے اپنے کرم سے بخش دیا اور سبب میری بخشش کا یہ ہوا کہ ایک شب مجھے ایک مکان میں رہنے کا اتفاق ہوا وہاں طاق میں قرآن شریف رکھا ہوا تھا۔ جس وقت نیند کا غلبہ ہوا میرے دل نے چاہا کہ لیٹ جاؤں لیکن طاق میں قرآن شریف رکھا ہونے سے میں نے یہ امر خلافِ ادب جانا اور یہ بھی گوارا نہیں ہوا کہ اپنے آرام کے واسطے مصحف کی جگہ تبدیل کردوں۔ الغرض تمام شب بیٹھا رہا اور جاگ کر صبح کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ادب کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ (ماخوذ از فوائد الفواد)

سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی صحیح تاویل

از

(جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

دنیا کی محبت بہت بُری چیز ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی رعنائیاں اور دلفریبیاں بڑے بڑے علماء اور زاہدوں کے دامنِ تقدس کو داغ دار بنا دیتی ہیں اسی لئے ایک حدیث میں اس کی بابت یوں فرمایا گیا ہے کہ:-

لا اخاف علیکم الفقر بل اخاف علیکم الدنیا	مجھے تمہارے فقر و فاقہ کا خوف نہیں بلکہ دنیوی مال و دولت کا خطرہ ہے

یہود کے حالاتِ زندگی پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کی محبت میں بُری طرح گرفتار تھے، دنیا کمانے کے لئے آیاتِ الٰہی میں توڑ مروڑ کرتے تھے وہ دنیا کے مال و دولت پر اس قدر ریجھے ہوئے تھے کہ حیاتِ دنیوی کے سب سے زیادہ دلدادہ اور ہزاروں برس اسی دنیا میں گذارنا پسند کرتے تھے جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے (احرص الناس علی حیوۃ ...... یود احدھم لو یعمر الف سنۃ) دنیا پرستی کے نتیجہ میں آخرت کو فراموش کر چکے تھے اور "عمل صالح" سے یکسر تہی دامن ہو گئے تھے سورۂ بقرہ میں ان کی حبِ دنیا کی پوری داستان بیان ہوئی ہے کہ جائز و ناجائز ہر طریقہ سے متاعِ دنیوی حاصل کرنے میں منہمک تھے اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کمانے کا انھوں نے کتنا خوب ایک حربہ بھی فراہم کر لیا تھا کہ سحر و شعبدہ دعا و تعویذ یعنی علوم سفلیہ اور علویہ کو سیکھتے اور سکھاتے تھے تاکہ مال و زر حاصل کریں جیسا کہ فرمایا:-

واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک	اور انھوں (علماء یہود) نے اس کی پیروی کی جو شیاطین
سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین	عہد سلیمان میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا
کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل	بلکہ شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو سحر سکھلاتے تھے

علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر جو علم
وما یعلمان من احد حتی یقولا انما	اترا اس کی بھی پیروی کی حالانکہ وہ دونوں یہی کہہ
نحن فتنۃ فلا تکفر، فیتعلمون منھما	کر سکھلاتے تھے کہ ہم فتنہ ہیں پس تم کفر نہ کرنا پس یہ لوگ
ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ	ان سے وہ باتیں سیکھتے جس کے ذریعہ میاں بیوی میں
وما ھم بضارین بہ من احد الا	جدائی کرتے حالانکہ یہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا
باذن اللہ ویتعلمون ما یضرھم	سکتے مگر اللہ کی اجازت سے اور یہ وہی سیکھتے جس
ولا ینفعھم ولقد علموا لمن اشتراہ	سے ان کو نقصان ہوتا اور کوئی فائدہ نہ ہوتا حالانکہ
مالہ فی الآخرۃ من خلاق ولبئس	انھیں خوب معلوم تھا کہ جس نے اسے خریدا اس
ما شروا بہ انفسھم لو کانوا یعلمون	کے لئے آخرۃ میں کوئی حصہ نہیں اور کتنا برا بھاؤ
	تاؤ اپنے ہی ساتھ انھوں نے کیا کاش خود بھی جان لیتے

اس آیت میں بہت سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض نہایت ہی غور وفکر کے محتاج ہیں اس لئے ہم بھی چند سوالات قایم کر کے ان کا جواب دیں گے اللہ تعالیٰ اس کارِ دشوار میں ہماری مدد کرے اور صحیح نقطۂ نگاہ کی تلقین کرے۔

(۱) "وما کفر سلیمان" کا کیا مفہوم ہے اور یہ کہہ کر یہود کے کس خیالِ خام کو باطل کیا گیا ہے

(۲) بظاہر اس آیت میں سحر کو کفر قرار دیا گیا ہے کیا فی الواقع کفر وسحر ایک ہی چیز ہیں اور دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

(۳) وما انزل علی الملکین میں "ما" کیسا ہے اور اس کا عطف کس پر ہے؟

(۴) "ما انزل" میں اگر "ما" کو موصولہ مانا جاتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی چیز فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔

(۵) "ملکین" کے متعلق بھی اہلِ تفسیر نے بہت ساری موشگافیاں کی ہیں اس بارہ میں صحیح صورتِ حال کیا ہے؟

اب ان سوالات کے نمبروار جواب ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ میرے نزدیک "وما کفر سلیمان" بطور جملہ معترضہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یہود اپنی کفریات و سحریات کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ یہود حضرت سلیمانؑ کو نبی نہیں مانتے تھے اور ان کی سلطنت کو اُن کے جادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے اس لئے اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ حضرت سلیمانؑ نے کوئی کفر نہیں کیا یعنی ان کو سحر و شعبدہ سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ سحر و شعبدہ بازی تو ان شیطانوں کا کام تھا جو حضرت سلیمانؑ کے باغی تھے اور بھاگ کر سحر سیکھتے تھے اس لئے انھیں نے دراصل کفر کیا ہے اور حضرت سلیمانؑ کو کفر و سحر سے کوئی نسبت ہی نہ تھی پس گویا جملہ معترضہ لاکر حضرت سلیمانؑ کو کفر و سحر سے بری قرار دیا گیا ہے اور کفر و سحر کی نسبت باغی اور مفرور شیطانوں کی طرف کی گئی ہے

۲۔ سحر و کفر میں بعض علماء تفریق کرتے ہیں چنانچہ امام رازی نے سحر کی آٹھ قسمیں قرار دے کر بعض کو کفر اور بعض کو غیر کفر بتایا ہے لیکن فقہاء کا مسلک یہ ہے۔

ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ مالک و احمد رحمہم اللہ) کے نزدیک جادو سیکھنا کفر ہے اور سیکھنے کے بعد جو شخص جادو کا عمل ایک دفعہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کے عمل کرنے سے نہیں بلکہ بطور عادت چند دفعہ جادو کا عمل کرنے سے ایسا شخص واجب القتل ہو جاتا ہے مگر اس سلسلہ کی روایات سے ائمہ ثلاثہ کے مسلک کو تقویت پہنچتی ہے اور خود اس آیت میں سحر کا کفر ہونا نہایت واضح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سحر کی متعدد قسمیں قرار دے کر بعض کو تو کفر میں داخل کیا جاتا ہے اور بعض کو الگ کر لیا جاتا ہے البتہ کفر کے گناہ کبیرہ اور قبیح ہونے میں تو کسی کا اختلاف نہیں معلوم ہوتا یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں بھی سحر کا تذکرہ کیا ہے وہاں سحر کی مذمت ہی مقصود معلوم ہوتی ہے کہیں بھی مدح و ستائش کے انداز میں سحر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو سحر سے بری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک شیطانی عمل اور قبیح فعل ہے اس لئے سحر کو چاہے کفر مانو یا نہ مانو اس کے مذموم قبیح اور گناہ کبیرہ میں تو کوئی تامل ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ "وما انزل" میں ما کے متعلق اہلِ علم کی کئی رائیں ہیں:۔

(الف) ما نافیہ ہے اور "لم ینزل" کے معنی میں ہے اور اس کا عطف "وما کفر سلیمان" پر ہے، عبداللہ بن عباس سے اس کی ایک روایت بھی ہے۔

(ب) ما موصولہ ہے اور اس کا عطف "السحر" پر ہے امام رازیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے یعنی یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین۔

(س) ما مجرور ہے اور اس کا عطف "علی ملك سلیمان" پر ہے یہ ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے

(ج) ما موصولہ ہے لیکن عطف ما تتلوا الشیاطین پر ہے عبداللہ بن عباس سے اس کی بھی روایت ہے اور جمہور کا یہی مسلک ہے میرے نزدیک بھی گوناگوں وجوہ سے یہی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۲) اب جب کہ ما کا موصولہ ہونا جمہور کے نزدیک محقق ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں پر کیا چیز نازل ہوئی تھی اس کے متعلق بھی اہل علم کی کئی رائیں ہیں۔

۱- جمہور کے نزدیک "ما انزل" سے بھی سحر ہی مراد ہے یعنی علماء یہود نے شیطانوں اور فرشتوں کے سحر کی پیروی کی تھی،

۲- مجاہدؒ کے نزدیک جمہور کے خلاف یہاں سحر کے بجائے تفریق بین المرء وزوجہ مراد ہے جیسا کہ بعد میں اس کا ذکر بھی آیا ہے

۳- ابو مسلم نے "ما انزل" سے دین، شرع اور دعوت الی الخیر کو مراد لیا ہے اور اس کا مفہوم یوں بیان کرتا ہے کہ یہود نے جس طرح سحر کو حضرت سلیمانؑ کی طرف یوں ہی منسوب کر دیا تھا اسی طرح دونوں فرشتوں کی طرف بھی افتراءً منسوب کیا تھا حالانکہ اُن پر سحر کے بجائے دین و شرع نازل ہوا تھا اور اسی کی وہ تبلیغ بھی کرتے تھے۔

مگر اس عاجز کو ان اقوال میں سے کسی پر اطمینان نہیں ہو سکا، ابو مسلم اور مجاہد کے اقوال کو تو نظر انداز کر دیجئے خود جمہور کا مسلک کتنا ضعیف معلوم ہوتا ہے کیوں کہ سحر کفر میں داخل ہے اور اگر کفر میں نہ بھی داخل ہو جب بھی اس کے مذموم اور قبیح ہونے پر تو پوری امت کا اتفاق ہو چکا ہے پھر ملائکہ تو معصوم ہیں

وہ بھلا کب اس کی تعلیم و تلقین کرنے لگے اور وہ بھی اس لئے کہ خدا کی طرف سے اس پر مامور ہوں کیا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات کوئی ہو سکتی ہے اس لئے اس قول کے قائلین کی عظمت و برتری کا پورے طور پر احساس رکھتے ہوئے اور احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اختلاف کی جرأت کر رہا ہوں ہر چند کہ مجھے اپنی کم علمی اور کوتاہ نظری کا پورا پورا اعتراف ہے اور ان بزرگوں کی جلالت و عظمت کا بھی خوب احساس ہے مگر پھر بھی ع غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے نزدیک "وما انزل" کا عطف "ما تتلوا الشیاطین" پر ہے اور شیاطین جو کچھ پڑھتے تھے اس کے متعلق بھی کسی توضیح کی ضرورت نہیں کہ وہ یقیناً سحر تھا جیسا کہ کہا گیا ہے یعلمون الناس السحر اور پھر اس سحر کے کفر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا نے اس شبہ کو زائل کر دیا اب صرف یہ سوچنا ہے کہ "ما انزل علی الملکین" سے کیا چیز مراد ہو سکتی ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ کفر و سحر نہیں مراد ہے کیوں کہ عطف کرنے کا یہی مطلب ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں اور پھر "من السحر" کا اضافہ بھی یہاں نہیں کیا گیا ہے اور وہاں شیاطین کا ذکر تھا جو علوم سفلیہ (سحر و جادو) سیکھتے سکھاتے تھے اور یہاں ملائکہ کا ذکر ہے جن کے متعلق علوم سفلیہ میں مبتلا ہونے کا کوئی گمان ہی نہیں کیا جا سکتا کہیں "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم" کے مصداق نہ بن جائے اس لئے میں "ما انزل" سے علوم علویہ (دعا و تعویذ وغیرہ) مراد لیتا ہوں جس کی تعلیم و تلقین پر فرشتے مامور تھے اور جو ایک بہترین کام تھا لیکن یہود نے اپنی بدبختی سے اسے بھی کفر میں داخل کر لیا اور ان فرشتوں سے محبت و نفرت کا عمل سیکھ کر میاں بیوی کے درمیان تفریق کرنے لگے اسی لئے قرآن نے ان کی مذمت بیان کی ہے یعنی قرآن نے ان کی دنیا پرستی کا ایک راز فاش کیا ہے کہ جس طرح سحر و شعبدہ جیسے شیطانی اعمال کا ارتکاب کر کے دنیا کمانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے ٹھیک ویسے ہی انہوں نے دینی راہوں سے بھی اپنے جیب و دامن کو بھر لیا اور دعا و تعویذ میں مبتلا ہو گئے حالانکہ دعا و تعویذ سیکھنے سکھلانے میں فی نفسہ کوئی قباحت نہ تھی لیکن ان کے غلط استعمال اور نیتوں کی خامی نے اسے کفر اور نادرست بنا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نیتوں ہی کا لحاظ کیا ہے

اب چوں کہ میرے نزدیک "ما انزل" سے یہی مراد ہے اور یہ تاویل خواہ اپنی جگہ پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو مگر چوں کہ اسے جمہور کی تائید حاصل نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ لوگ اسے قبول کرنے میں تامل کریں اگرچہ میرا یہ مقصود بھی نہیں ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس ناچیز کے خیال ہی کو ترجیح دیں۔ بہرحال ان ساری باتوں سے قطع نظر میں اپنی تاویل کی درستگی کے سلسلہ میں چند دلائل پیش کر رہا ہوں۔

(۱) یہود آخرت کے تصور کو یکسر فراموش کر کے دنیا پرستی میں اس قدر مشغول اور منہمک تھے کہ جائز و ناجائز ذرائع کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے اور ان کی دیدہ دلیری دیکھو کہ اپنے عقائد و خیالات کو پیغمبروں، ولیوں اور فرشتوں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

اب غور کرو قرآن حکیم نے اس موقعہ پر کیا بتانا چاہا ہے اور کلام کا ربط اور نظمِ آیات کس بات کا مقتضی ہے یہی تو کہ علمائے یہود دینی و دنیاوی جائز و ناجائز ہر دو ذرائع سے مال و دولت کمانے میں مست تھے یعنی صرف ایک ہی ذریعہ پر اکتفار نہیں کیا تھا بلکہ دونوں ہی ذرائع عوام کو فریب دینے کے لئے استعمال کر لیتے تھے اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف علومِ سفلیہ ہی کو ماننے پر اکتفار نہ کیا جائے بلکہ علومِ علویہ کو بھی مراد لیا جائے تاکہ دونوں پہلو بے نقاب ہو سکیں یہ اور بات ہے کہ یہود نے اپنی بدبختی اور اخلاقی پستی کی بنا پر جائز کو بھی ناجائز اور صحیح کو بھی غلط بنا لیا تھا۔

(۲) جادو وغیرہ کے مذموم ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا پھر یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ فرشتوں کو اس قبیح عمل کا معلم اور خدا کی طرف سے اسی پر مامور سمجھا جائے علامہ ابن جریرؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ سحر کی تعلیم اس لئے جائز ہے کہ خدا نے خیر و شر دونوں کو پیدا کیا ہے مگر اس پر یہ معارضہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے شر کو اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرنے کے لئے کب کہا ہے؟

(۳) "وما انزل" کا عطف بھی اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ دونوں دو جدا جدا چیزیں ہیں۔

(۴) اگر سحر ہی مراد ہوتا تو پھر آیت یوں ہوتی کہ وما انزل علی الملکین من السحر مگر جب ایسا نہیں ہے تو پھر سحر کی طرف کوئی خیال ہی نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کو ماننے میں عقل و نقل دونوں اعتبار سے بیشمار

دقیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۵) لفظ انزال سے تو ہماری تاویل کے علاوہ کوئی اور تاویل کھنچی ہوئی معلوم ہی نہیں ہوتی کیوں کہ یہ ایک الہامی ہی نہیں بلکہ خدا کی طرف سے وحی معلوم ہوتی ہے اور اوّل الذکر جو ایک من گھڑت امر تھا اسے ماتتلوا الشیاطین کہا گیا ہے پس اگر قرآن مجید کے اسالیب و استعمالات ہی پر غور کرو تو اس تاویل کے علاوہ اور کوئی تاویل جچتی ہوئی نظر نہ آئے گی۔

(۶) یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے جمہور کے مسلک کو ترک کر دیا ہے چنانچہ مشہور تابعی مفسر مجاہد رح اس سے، یفرقون بہ بین المرء وزوجہ کو مراد لیتے ہیں حالاں کہ یہ ایک ضمنی چیز ہے اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رح کے ترجمہ سے تو میری ہی تائید معلوم ہوتی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"اور اس علم کو جو اترا دو فرشتوں پر"

یہاں شاہ صاحب نے "اس علم" کہہ کر جمہور کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔

(۷) امام رازی صاحب وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے کہ اس سے وہ سحر مراد ہے جو کفر نہیں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ سحر کفر اور مذموم نہیں ہے تو پھر اس کے سیکھنے اور سکھانے میں قباحت کیا تھی جس پر انھوں نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔

ان وجوہ سے اس عاجز کو اپنا خیال ہی ارجح اور انسب معلوم ہوتا ہے۔

(۸) ملکین سے جمہور علماء کے نزدیک دو فرشتے مراد ہیں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور یہی صحیح بھی ہے باقی جو لوگ۔۔۔ مَلَكَيْنِ بفتح اللام کو مَلِكَيْنِ بکسر اللام پڑھتے ہیں اور اس سے رجلین صالحین (دو صالح آدمی) یا "ملکین من ملوک الدنیا" (دنیا کے دو بادشاہ مراد لیتے ہیں تو وہ تو کسی طرح درست ہی نہیں ہے اس لئے کہ مشہور و متواتر قرأت پر شاذ قرآتوں کو کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔

اور جو لوگ حضرت جبرائیل و میکائیل کو مراد لیتے ہیں وہ بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے کیوں کہ قرآن نے ہاروت و ماروت عطف بیان یا بدل لا کر خود ہی اس خیال کی تردید کر دی ہے۔

باقی لوگوں نے فرشتوں کے سببِ نزول وغیرہ پر جو روایتیں نقل کی ہیں وہ سراسر خرافات ہیں چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں

واعلم ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة لانه ليس في كتاب الله ما يدل على ذلك

اور جان لو کہ یہ روایت فاسد و نامقبول ہے اس لئے کہ کتاب اللہ سے اس کی تائید ہونا تو درکنار

اس کے بعد امام صاحب نے اپنا پورا زورِ قلم اس بات کے لئے صرف کیا ہے کہ فرشتے کیوں سحر کی تعلیم دیتے تھے لیکن ان کے دلائل اس قدر پھُس پھُسے ہیں کہ ہمیں اس پر اطمینان نہیں ہوسکا باقی ہمارے نزدیک تو سحر کے بجائے علومِ علویہ مراد ہیں اس لئے ان کے سیکھنے سکھانے میں کوئی قباحت نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔

باقی رہا یہ سوال کہ فرشتے یہ سب کچھ سکھانے کے لئے کیوں بھیجے گئے تو میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں غور و فکر کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کا نہ تو یہ منشا ہی ہے کہ ہم ان ساری باتوں کو معلوم کرنے کے درپے ہوں - اور پھر اسے معلوم کرنے میں ہماری عقل و فکر درماندہ ہوجائیں گے اصل چیز قرآن کے منشاء و مراد کو سمجھنے کی کوشش ہے کیونکہ یہی فہمِ قرآن کی اصل ہے - باقی اس طرح کی تحقیقات کرنے سے نہ تو کوئی فائدہ ہی ہے اور نہ اس طرح قرآن کا مقصد استدلال و تذکیر حاصل ہوسکتا ہے۔

(۵) آخری سوال جو قرآن پاک کے اس فقرہ سے متعلق ہے کہ وما یعلمان من احد الخ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاروت و ماروت علومِ علویہ کی تلقین کرتے تھے - مگر یہ کہہ کر ہم تمہارے لئے ابتلاء و آزمائش ہیں اور ہماری باتوں کو اگر غلط طور پر حاصل کیا گیا اور خلوصِ نیت سے کام نہ لیا گیا تو کفر و شرک میں پڑجانے کا اندیشہ ہے اس لئے اس علم کو اچھی طرح خلوصِ نیت کے ساتھ سیکھو اور کفر سے محفوظ رہو لیکن یہودنے اس علم کو غلط طور پر استعمال کیا اور اسے اپنے لئے دنیا کمانے کا ایک ذریعہ بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح بات کو سیکھ کر بھی وہ اپنے آپ کو کفر سے نہ بچا سکے اور جب محبت و نفرت کا عمل سکھا تو میاں بیوی کے درمیان جدائی کا ایک طریقہ اسے بنالیا اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال دیا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی برباد کیا - یہی مفہوم اس فقرہ کا معلوم ہوتا ہے۔

مفتاح الصلوۃ

از

جناب پروفیسر شیخ فرید صاحب برہان پوری ایم۔اے
لکچرار رابرٹس کالج جبلپور

مفتاح الصلوۃ کے مصنف ــــ شاہ فتح محمد محدث ــــ حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ کے خلفِ اصغر اپنے زمانہ کے فاضلِ اجل، حافظ قاری، محدث، مفسر اور فقیہ تھے۔ عبد الرحمٰن نام، فتح محمد لقب تھا مگر عام طور سے بابا فتح محمد محدث کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

برہان پور ان کا مولد و منشاء ہے۔ اپنے والدِ بزرگوار شاہ عیسیٰ جند اللہ سے علومِ شریعت و طریقت کی تعلیم پائی۔ علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور اُن ہی سے خرقۂ خلافت پایا۔ طریقۂ شطاریہ میں منسلک تھے۔

عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے۔ علومِ فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ علمِ حدیث میں اعلیٰ فضیلت کی بنا پر محدث کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

برہان پور میں ۶۰ سال کی عمر تک علومِ دین کی ترویج و اشاعت اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔

عشقِ رسول میں سرشار اور حضرت رسالت مآب کے نام کے شیدائی اور فدائی تھے۔ ان کی زندگی اتباعِ سنتِ رسول کا مکمل نمونہ تھی۔ عشقِ سرورِ کائنات کی سرشاریاں ان کی تمام تصانیف میں جاری و ساری ہیں۔

مرکز نے انھیں اپنی طرف کھینچا اور زیارتِ کعبۃ اللہ کے شوق میں برہان پور سے ۱۰۶۴ھ ۱۶۵۳ء میں مدینہ روانہ ہوتے۔ مراسمِ حج کی ادائیگی کے بعد وہیں سکونت اختیار کرلی اور وہیں کے ہوکر رہ گئے ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء میں مدینہ منورہ میں بیمار ہوئے۔ بیماری میں اس سرائے فانی سے عالمِ جاودانی

کی طرف رحلت کی۔ جنت البقیع میں ان کا مزار ہے۔

علم تصوف اور فقہ میں کئی بلند پایہ تصانیف کے مالک ہیں۔ علم شعر سے بھی بہرہ یاب تھے۔ آپ کا ایک وصیت نامہ اور دیگر تصانیف کے خوشخط نسخے درگاہ برہان الدین راز الٰہی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ جناب سید اکرام الدین صاحب (سجادہ نشین) کا کرم ہے۔ کہ انھوں نے نایاب نسخے مطالعہ کے لئے عنایت کئے۔

ان میں سے چند یہ ہیں ـــ

فتوح الاوراد۔ فتوح العقائد۔ مفتاح الصلوٰۃ۔ فتح المذاہب الاربعہ۔ فتح الطریقہ۔ مراتب عوالم خمسہ۔ رسالہ تحقیق نسب سیادت۔ رسالہ تحقیق وحدت الوجود وغیرہ وغیرہ۔

سطور ذیل میں مفتاح الصلوٰۃ کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مفتاح الصلوٰۃ فتح محمد محدث کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ ارکان نماز کے فرائض، سنن اور واجبات کی تفصیل پر مبنی ہے۔ خدا کی حمد و ثنا اور نعت نبی اکرم کے بعد مصنفین کی عادت جاریہ کے مطابق بزرگ محدث نے دعائیہ کلمات ـــ

"بداں تا نیک بخت کند ترا خدائے تعالیٰ"

کے الفاظ سے کتاب کی ابتداء کی ہے۔ اس کی بنیاد حروف مرموز کے تین اشعار پر رکھی گئی ہے۔ جو کسی سندھی بزرگ نے موزوں فرمائے تھے۔ حضرت مسیح الاولیاء اکثر ان کی تعلیم اپنے فرزندوں کو دیتے تھے۔

"بزرگے از علماء سندھ فرائض و واجبات و سنن را دریں سہ بیت بحروف اشارت نظم کردہ است کہ اکثر اوقات بہ فرزندان حضرت شاہ عیسیٰ تعلیم می فرمودند آں ابیات این ست

ابیات

فرائض ندانی شوی در قلق مُجبِسِ نُوتِ تقِق رَسَقَ

چو واجب ندانی شوی در خطر قُضَتِ تعنّت لُقتّ جَبَرَ

چو سنّت ندانی شوی مقتدا ردّث ثلثٍ قسّت ذَدَا

زیرِ نظر کتاب ان اشعار کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے شعر میں تیرہ[۱۳] فرائض۔ دوسرے میں بارہ[۱۲] واجبات اور تیسرے میں بارہ[۱۲] سنن کی طرف اِشارہ ہے۔

فرائض ــــــ

الف ــــ اندام پاک کردن

جیم ــــ جامہ پاک کردن

جیم ــــ جائے پاک کردن

سین ــــ سترِ عورت کردن

نون ــــ نیت کردن

واؤ ــــ وقت شناختن

قاف ــــ مقابل قبلہ استادن

تے ــــ تکبیرِ اولیٰ گفتن

قاف ــــ قرأت خواندن

قاف ــــ قیام کردن

ر ــــ رکوع کردن

سین ــــ سجدہ کردن

قاف ــــ قعدۂ آخرین نمودن

واجبات ــــــ

فے ــــ فاتحہ خواندن

ضاد ــــ ضمِ سورہ نمودن

تے ــــ تعینِ قرأتِ دو رکعت نمودن

تے ــــ تشہدِ در ہر دو قعدہ خواندن

قاف ــــ در قعدۂ اولیٰ نشستن

تے ــــ تعدیلِ ارکان نمودن

لام ــــ لفظِ سلام آخرین گفتن

قاف ــــ قنوتِ وتر خواندن

تے ــــ تکبیر در ہر دو عیدین گفتن

جیم ــــ جہر خواندن

سین ــــ سر خواندن قرأت در عصر و ظہر

رے ــــ رعایت ترتیب نمودن

سنن ــــــ

رے ــــ رفع یدین

واؤ ــــ وضع یمین و یسار

ثے ــــ ثنا یعنی سبحانک اللّٰھم خواندن

تے ــــ تعوذ خواندن

بے ــــ بسم اللہ گفتن

تے ــــ تکبیر انتقالات گفتن

تے ــــ تسبیح رکوع و سجود گفتن

سین ــــ سمع اللہ خواندن

تے ـــــ توقف در قومہ وجلسہ نمودن　　　دال ـــــ دعا خواندن

دال ـــــ درود خواندن　　　الف ـــــ آمین گفتن

مختلف فصول کے ضمن میں عنوانات بالا پر حدیث و قرآن کی روشنی میں کتب معتبرہ۔ مستند احادیث۔ اور ائمہ کبار کے مستند اقوال سے تسلی بخش حد تک سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ٹھوس اور جامع تبصرہ لائق مصنف کی عربی دانی اور فقہ و حدیث میں اعلیٰ دستگاہ پر دلالت کرتا ہے۔

مختلف مصنفین کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد مسائل کی بڑی سنجیدگی سے تفہیم کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر مصنف کی رائے اجتہادی شان لئے ہوئے ہے۔ بعض مبسوط مسائل کے بیان میں یہ کہہ کر کہ "ایں مختصر گنجائش تفصیل نہ دارد" اختصار سے کام لیا ہے مگر اس اختصار میں بھی تشنگی نہیں۔ ہر پہلو سے بحث کر لی ہے۔

تعین اوقات نماز کے ذیل میں جہاں سایہ کا ذکر ہے۔ وہاں چھ اشعار پر مشتمل ایک بے نظیر اور معنی خیز قطعہ ہے۔ اس کے آخری شعر میں عیسوی تخلص ہے۔

نی از حمل دو نیم پا سوی شمالست دائما　　　وز ثور گردد یک قدم جوزا بود در استوا

از نصف سرطاں یک قدم سوئے جنوبی می شود　　　تا آخرش آں محو شد۔ گشت از اسد آں سایہا

از سنبلہ گردد قدم دو نیم از میزاں شود　　　از عقرب آں سہ نیم شد وز قوس پنج و نیم پا

در نصف جدی آں ہفت شد طرف شمالی بیش نہ　　　از دلو آں شد شش قدم تا نیمہ اش بیں پنج را

در پانزدہ یک ناقص است۔ در حوت چار است بار من　　　تا آخرش نقصان بداں اے جان من یک نیم پا

باز از حمل دو نیم ہست گر عاقلی عاقل بشو　　　بہر خدا گفتم بہ تو اے عیسوی ایں نظم را

اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موسموں کے تغیرات کے باعث سایہ کس مقدار سے گھٹتا۔ بڑھتا اور سمت تبدیل کرتا رہتا ہے۔

اقدار سایہ کے متعلق ایک جدول دیا گیا ہے۔ قلمی کتاب میں یہ جدول نہیں ہے۔ دو تین ورق خالی چھوڑ دئے گئے ہیں۔

تبلایا ہے۔ کہ سایہ کا مدار شمسی مہینوں پر ہے۔

بیت ————

لا و لا لب و لا لا شش مہ است لل کط و کط لل شہور کوتہ است

تبلایا ہے۔ کہ برجِ حمل میں نزولِ آفتاب کہ عبارت فروردی ہے تحقیق کرے۔ بعد کہ تمام سال کا حساب آسان ہو جائے گا۔

اس مقام پر ایک قطعہ مندرج ہے۔

قطعہ

زفروردی چو بگزشتی مہ اردی بہشت آید بود فرداد تیر آنگہ امرداد ہمی آید
پس از شہریور و از مہر و آبان آذر و دی دان کہ بہمن جز اسفندیار یک ماہی نیفزاید

کتاب کے حاشیہ پر مذکورہ بیت کی تشریح یوں کی گئی ہے

صیف ———— لل کـــــ طـــ شتا

لا	لا	لب	میزان	عقرب	قوس
حمل	ثور	جوزا	۳۰	۳۰	۳۱
۳۱	۳۱	۳۲	ربیـــــــع		

خریف ———— کـــــ طـــ لل

لا	لا	لا	حوت	دلو	حوت
سرطان	اسد	سنبلہ	۲۹	۳۰	۳۰
۳۱	۳۱	۳۱			

وجہ تالیف | یہ رسالہ مصنف نے اپنے خواہر زادے شیخ احمد بن سلیمان کے لئے لکھا ہے۔

"این رسالہ بجہت احمد بن سلیمان کہ یکے از خواہر زادگانِ این فقیر است بواسطۂ صلۃ الرحم تالیف نمودہ شد"

سنِ تالیف | ترقیمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کتاب ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء میں تصنیف کی گئی

"واللہ الموافق والمعین الوافی قال المولف تم مفتاح الصلوٰۃ بید المؤلف عنہ لحمدی وستین بعد الالف من الہجرۃ النبویہ علی صاحبہا افضل التحیات فی سلخ الشہر الحرام ذی الحجہ ....

ماخذات | مستند ائمہ کبار کی معتبر تصانیف کے جابجا حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے بڑی دقتِ نظر سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔

ان میں سے چند یہ ہیں:۔

السراج الوہاج۔ المجتبیٰ۔ الذخیرہ۔ ظہیریہ۔ بدائع۔ شرح الہدایہ۔ فتح التقدیر۔ قاضی خاں۔ الفتاوی الولوالجیہ۔ بحر الرائق۔ الہدایہ۔ خلاصہ۔ عیون۔ المختار الزیلعی۔ صلوٰۃ المسعودی۔ جمع الجوامع۔ صحۃ القدوری۔ البغدادی۔ شرح المنیہ۔ معراج الدرایۃ۔ المحیط۔ عوارف المعارف۔ فتوح الاوراد۔ فتح المذاہب۔ عین المعانی۔ حاشیہ کنز۔ کفایۃ المومنین۔ جواہر الفتاوی۔ کنز۔ القنیہ المختار۔ قاموس۔ البرجندی۔ شرح الوقایہ۔ معارج النبوۃ۔ کشف الاسرار۔ کتاب اسرار۔

مصحح نے بعد میں چند کتابوں کا اضافہ کردیا ہے۔

مندرجہ بالا اور دیگر کتب فقہ کے حوالجات اور اقتباسات مصنف کے وسعتِ مطالعہ اور علمی تبحر کے شاہد ہیں۔

مصنف کے ذاتی کتب خانے میں اکثر بیش بہا کتابیں تھیں۔ مکروہات کے ذیل میں حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "صاحب مناسکِ کبیر" شیخ رحمت اللہ کا رسالہ جو تذکرہ سنن و استحباب پر مشتمل ہے ان کے کتب خانہ میں تھا۔

"در تحقیق ایں شیخ رحمت اللہ صاحب مناسکِ کبیر رسالہ جداگانہ نوشتہ اند وسنت و استحباب ایں مقرر نمودہ چنانچہ رسالۂ مذکور در کتب خانہ کاتب موجود است"[1]

فاضل مصنف نے ضمنی طور پر اپنی دوسری تصانیف ——— فتوح الاوراد فتح المذاہب

---

[1] مفتاح الصلوٰۃ مطبوعہ ص۱۰۴

الاربعہ۔ رسالہ سایۂ اصلی برہان پور و اطراف اور رسالہ فی الزوال کا بھی ذکر کیا ہے اور حوالے دئے ہیں۔
وضو کے باب میں وضو کے بعد آیۃ الکرسی اور انا انزلنا پڑھنے کے ثواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ "فتوح الاوراد" میں اس کا ذکر دوسری دعاؤں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"کاتب با ادعیہ دیگر در فتوح الاوراد آوردہ"[1]

دوسری جگہ ص۵۷ پر یہی عبارت "ایزاد نمودہ" فعل کے ساتھ درج ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ
مفتاح الصلوٰۃ میں مقدماتِ نماز کا مختصر ذکر کیا گیا ہے تفصیل فتح المذاہب لاربعہ میں ملاحظہ کیجیے۔

"در مسائل ...... از مقدماتِ نماز اختصار واقع شدہ ہر کہ خواہد مستوعبا معہ دلائلہ و مسائلہ کما یحق و تنبغی ہمہ را
مطالعہ نماید فعلیہ بملاحظہ فتح المذاہب لاربعہ للکاتب فانہ کاف فی المسائل التفصیلیۃ و داف للمطالب العلمیۃ"[2]

سایہ کے بیان کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ "سایۂ اصلی برہان پور و اطراف" ایک علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے

"در تحقیق سایۂ اصلی برہان پور و اطراف داین فقیر در رسالۂ جداگانہ بیان نمودہ است"[3]

اس رسالہ کا حاصل وہ ابیات (قطعہ) ہیں جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ صبح صادق، اور صبح کاذب کے بیان
کے ذیل میں ایک رسالہ زوال کا ذکر آیا ہے۔

"در رسالہ فی الزوال بتفصیل مؤلف معہ ذیل مذکورہ گردد"[4]

ایک مقام پر مکروہات شمردن آیات و سورۃ کے بیان میں حضرت شیخ طاہر کی حاشیہ کنز کے اقتباس
سے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ جو صاحب بحر الرائق اور فتح القدیر میں محل اختلاف تھا۔[5]
دوسری جگہ فصل نماز میں جہاں رکوع و سجود کا بیان ہے۔ اس امر کی وضاحت کہ صلوٰۃ مومن
کی معراج ہے۔ حضرت شیخ الاولیاء کی گرانمایہ تصنیف عین المعانی کے ایک طویل اقتباس سے کی ہے

هندی الفاظ کا استعمال | عربی اور فارسی کے اس متبحر عالم نے دو تین جگہ اس کتاب میں گھڑی۔ گجر اور بازہم
کا بلا تکلف استعمال کیا ہے۔ بزرگ محدث نے ایک ہندی یعنی زبانِ اردو لکھا ہے[6]
مختصر یہ کہ مفتاح الصلوٰۃ مصنف کا شاہکار ہے۔

---

[1] مفتاح الصلوٰۃ مطبوعہ ص۹ بھ۔ [2] ایضاً ص۲۳ [3] ایضاً ص۲۸ [4] ایضاً ص۳۳ [5] ایضاً ص۱۱۳
[6] ایضاً ص۱۳۴

جامعہ ازہر

(ایک سرسری جائزہ)

ترجمہ

(جناب محبیب الرحمن صاحب عثمانی بی اے)

(جامعہ نگر دہلی)

جامعہ ازہر مشرق کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ ذیل میں ان مختلف دوروں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے جن سے ہو کر یہ یونیورسٹی گزری ہے اور ایک ہزار سال کے بعد آج اس عظیم مرتبے تک پہنچی ہے۔

فاطمیوں کے دورِ حکومت (۹۷۲ء تا ۱۱۷۲ء) میں جامعہ ازہر

جامعہ ازہر کا سنگِ بنیاد ۹۷۰ء میں فاطمیوں کے سسلی کے کمانڈر جوہر القائد نے رکھا۔ دو سال میں یونیورسٹی کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ شروع میں اس کو مندرجہ ذیل کاموں کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔

۱۔ فاطمی خلافت کی جامع مسجد۔

۲۔ اسماعیلی فرقے کی مجلس اعلیٰ (Supreme Council) کا مقام۔

۳۔ واعظ اعلیٰ (داعی الضحیٰ) کا دفتر

۴۔ قاضی القضاۃ کی عدالت۔

اگرچہ تمام دفاتر کے لئے علیحدہ علیحدہ عملہ رکھا جاتا تھا لیکن حقیقتاً خلیفہ ان سب کا سرچشمہ تھا۔ اس لئے سپریم کونسل کے صدر اور امام کی حیثیت سے خلفاء شروع ہی سے الازہر میں اکثر جاتے تھے۔

شبستی کا کہنا ہے کہ ۹۸۹ء میں ایک نومسلم یہودی درویزہ یعقوب ابن کلس کو الازہر کی جانب سے یہ کام سپرد ہوا کہ اس عمارت میں ایک تعلیمی شعبہ قائم کرے اور وقت کے بہترین علماء کو کسی بھی قیمت پر اس میں بلائے چنانچہ سلامیہ، شمالی ایران، بصرہ، کوفہ، یمن، مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، یروشلم، قیروان اور ایتھنز وغیرہ سے علماء

کو بلا لیا گیا اور ایک اکاڈمی قائم کی گئی۔ مشہور علم دوست خلیفہ العزیز (۹۷۵ء تا ۹۹۶ء) اس کے صدر تھے۔ اس میں فاطمی فلسفہ مذہب کی بنیادی باتوں پر مناظرے ہوئے، اور رفتہ رفتہ فلسفہ، اور پھر سائنس پر بحثیں ہونے لگیں اور اس طرح غالباً ان مفکرین کے بحث و مباحثے سے یونانی اور فاطمی فلسفے کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوا ہوگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یونانی اور فاطمی فلسفوں کے درمیان سمجھوتے اور ترکیب باہمی کی وہی شکل ہوئی ہوگی جیسی یہودی اور یونانی مفکرین نے ان دونوں فلسفوں کے سلسلے میں کی تھی۔ یہ بات اس حقیقت سے اور بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ سابق یہودی مدبرین کی اکثریت فاطمیوں کے دور میں سرکاری علماء میں شامل تھی۔

العزیز نے الازہر کی جانب سب سے زیادہ توجہ دی اور انھی کے دورِ خلافت میں بہت سے کام اس کی ترقی کے سلسلے میں ہوئے۔ حالاں کہ الحاکم (۹۹۶ء تا ۱۰۲۰ء) کے طوائف الملوکی کے دور میں الازہر نے کافی نقصانات اٹھائے۔ تاہم اس کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی رہی اور اس حد تک بڑھی کہ کتب خانے کے قیام کے بعد خاص طور پر کافی ہجوم رہنے لگا۔ لائبریری میں نہ صرف کتابوں بلکہ معقول روشنی، کاغذ اور روشنائی کا بھی مفت انتظام کیا جاتا تھا۔ دوسری وجوہات کے ساتھ اس کتب خانے کی وجہ سے بھی "دار الحکمۃ" کے قیام کے خیال کو تقویت پہنچی۔ فاطمی فرقے کے مخفی اصولوں کا تقاضا یہ تھا کہ الازہر اور دار الحکمۃ کو الگ رکھا جائے۔ دار الحکمۃ وہ جگہ تھی جہاں تمام فرقوں کے عالموں اور سائنس دانوں کو معامل (Laboratrias) میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی اجازت اور مواقع حاصل تھے۔ الازہر کو المستنصر (۱۰۳۶ء تا ۱۰۹۴ء) کے عہدِ حکومت کے وسط میں بہت نقصانات برداشت کرنا پڑے حالاں کہ اسی زمانے میں ایران کے ناصر خسرو جیسے جید عالم یہاں بحیثیت واعظ اور استاد آئے۔ ان کے سفرنامے سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور کے وزیر اعلیٰ بدر الجمالی نے آخر میں علم کے بہت سے مرکز کھول دیئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ الازہر کی ترقی پر برا اثر پڑا۔

ایوبی عہد حکومت (۱۱۷۲ء تا ۱۲۵۰ء) میں الازہر

ایوبی دور کے ابتدائی زمانے میں الازہر کو اس کے اصل مقام سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی وجہ شیعہ سنی اختلافات تھے لیکن صلاح الدین ایوبی (۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) کے ایک سرکاری رکن نور الدین زنگی نے الازہر کی اہمیت کو محسوس کیا اور کچھ سنی علماء کو شیعہ علماء کی جگہ رکھا۔ یہ لوگ شیعہ علماء سے باعتبار معیار بھی کم تھے اور کام کا جذبہ

بھی زیادہ نہ تھا۔ صلاح الدین کے بعد تمام ہی خلفاء ناکارہ قسم کے آئے۔ وہ تو حکومت کا کام چلانے ہی کے اہل نہ تھے الازہر کی ترقی اور دوسرے ثقافتی کام تو در کنار۔

مملوکوں کے عہد (۱۲۵۲ء تا ۱۵۱۷ء) میں الازہر

اسی دور میں بغداد اور اسپین کے بہت سے جید علماء نے مصر اور بالخصوص الازہر میں پناہ لی۔ نتیجتاً الازہر پھر نمایاں ہوا۔ اور اس کو وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو پہلے تھا۔ اسی دور میں اسلامی تاریخ کے لئے کچھ فیصلہ کن واقعات ہوئے، حملہ آوروں کی شکست ہوئی۔ منگولوں کے حملے رک گئے۔ اور مغرب میں مسلمانوں کا زوال ہوا۔ لیکن مصر کے لئے یہ سنہری دور تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ الازہر کے لئے۔ اس لئے کہ خلیفہ بغداد اور دوسرے بڑے علماء کو اس نے پناہ دی، ان حضرات نے بارہا الازہر کے منبر سے خطبات دیئے۔ اس دور کی حکایات نے اسلامی تاریخ کے واقعات کو مالا مال کیا ہے

عثمانیوں کے دور (۱۵۱۷ء تا ۱۸۰۵ء) میں الازہر

عتیق نے لکھا ہے مصر پر عثمانیوں کی فتح مصر کی آزادی اور تہذیب کے خاتمے کا پیغام لائی۔ الازہر اور دوسرے ادارے اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ حالاں کہ احمد گر الازہر کے مداحوں میں سے تھا اور اس نے سائنس کو پھر داخل نصاب کیا۔ لیکن یہ کوشش محض انفرادی تھی ورنہ عثمانی حکومت کی عام پالیسی میں الازہر کے احیا کا کوئی اشارہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس عثمانی حکمرانوں نے اس کو رجعت پسند درس گاہ بنادیا تھا تاکہ والیوں کی مطلق العنانی بلا روک ٹوک چل سکے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ازہری عثمانیوں کے خلاف جان توڑ کر لڑے۔ سیدی نے اس کو مشرق میں الازہر کی پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا ہے۔ سید عمر مکرم اور شیخ عبداللہ شرقوی نے عثمانیوں کے ظلموں کو ختم کرنے اور محمد علی کو تخت نشین کرانے میں لوگوں کی رہنمائی کی۔ خلیفہ بننے کے بعد محمد علی کو الازہر کا روایتی لباس بھی دونوں نے پہنایا تھا۔

علوی خاندان کے دورِ حکومت (۱۸۰۵ء تا ۱۹۴۵ء) میں الازہر

محمد علی (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء) کی طرف داری میں الازہر کے اساتذہ نے پہل کی اور انھی کی بدولت مئی ۱۸۰۵ء میں وہ والسرائے ہوئے محمد علی ازہر یونیورسٹی کی بہتری اور ترقی کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے، وہ وہاں کے اساتذہ کی ہمت افزائی کرتے اور ان کے مشوروں کو مانتے تھے انھوں نے الازہر کے طلبا ہی میں سے پہلا گروہ چن کر طب اور قانون کے شعبے قائم کئے۔ ۱۸۲۶ء میں محمد علی نے ایک تعلیمی مشن پیرس بھیجا۔ اس میں ازہری علماء بھی

کو بلایا گیا اور ایک اکاڈمی قائم کی گئی۔ مشہور علم دوست خلیفہ العزیز (۹۷۵ء تا ۹۹۶ء) اس کے صدر تھے۔ اس میں فاطمی فلسفہ مذہب کی بنیادی باتوں پر مناظرے ہوئے، اور رفتہ رفتہ فلسفہ، اور پھر سائنس پر بحثیں ہونے لگیں اور اِس طرح غالباً ان مفکرین کے بحث و مباحثے سے یونانی اور فاطمی فلسفے کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوا ہوگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یونانی اور فاطمی فلسفوں کے درمیان سمجھوتے اور ترکیب باہمی کی وہی شکل ہوئی ہوگی جیسی یہودی اور یونانی مفکرین نے ان دونوں فلسفوں کے سلسلے میں کی تھی۔ یہ بات اس حقیقت سے اور بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ سابق یہودی مدبرین کی اکثریت فاطمیوں کے دور میں سرکاری علماء میں شامل تھی۔

العزیز نے الازہر کی جانب سب سے زیادہ توجہ دی اور انہی کے دورِ خلافت میں بہت سے کام اس کی ترقی کے سلسلے میں ہوئے۔ حالاں کہ الحاکم (۹۹۶ء تا ۱۰۲۰ء) کے طوائف الملوکی کے دور میں الازہر نے کافی نقصانات اٹھائے۔ تاہم اس کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی رہی اور اس حد تک بڑھی کہ کتب خانے کے قیام کے بعد خاص طور پر کافی ہجوم رہنے لگا۔ لائبریری میں نہ صرف کتابوں بلکہ معقول روشنی، کاغذ اور روشنائی کا بھی مفت انتظام کیا جاتا تھا، دوسری وجوہات کے ساتھ اس کتب خانے کی وجہ سے بھی "دار الحکمۃ" کے قیام کے خیال کو تقویت پہنچی۔ فاطمی فرقے کے مخفی اصولوں کا تقاضا یہ تھا کہ الازہر اور دار الحکمۃ کو الگ رکھا جائے۔ دار الحکمۃ وہ جگہ تھی جہاں تمام فرقوں کے عالموں اور سائنس دانوں کو معامل (Laboratrias) میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی اجازت اور مواقع حاصل تھے۔ الازہر کو المستنصر (۱۰۳۵ء تا ۱۰۹۴ء) کے عہدِ حکومت کے وسط میں بہت نقصانات برداشت کرنا پڑے حالاں کہ اسی زمانے میں ایران کے ناصر خسرو جیسے جید عالم یہاں بحیثیت واعظ اور استاد آئے، ان کے سفرنامے سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور کے وزیرِ اعلیٰ بدر الجمالی نے آخر میں علم کے بہت سے مرکز کھول دیئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ الازہر کی ترقی پر برا اثر پڑا۔

ایوبی عہدِ حکومت (۱۱۷۲ء تا ۱۲۵۰ء) میں الازہر

ایوبی دور کے ابتدائی زمانے میں الازہر کو اس کے اصل مقام سے محروم کر دیا گیا اس کی وجہ شیعہ سنی اختلافات تھے لیکن صلاح الدین ایوبی (۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) کے ایک سرکاری کارکن نور الدین زنگی نے الازہر کی اہمیت کو محسوس کیا اور کچھ سنی علماء کو شیعہ علماء کی جگہ رکھا۔ یہ لوگ شیعہ علماء سے باعتبار معیار بھی کم تھے اور ان کے کام کا جذبہ

بھی زیادہ نہ تھا۔ صلاح الدین کے بعد تمام ہی خلفار ناکارہ قسم کے آئے۔ وہ تو حکومت کا کام چلانے ہی کے اہل نہ تھے الازہر کی ترقی اور دوسرے ثقافتی کام تو در کنار۔

مملوکوں کے عہد (۱۲۵۲ء تا ۱۵۱۷ء) میں الازہر

اسی دور میں بغداد اور اسپین کے بہت سے جید علموں نے مصر میں اور بالخصوص الازہر میں پناہ لی۔ نتیجتاً الازہر پھر نمایاں ہوا۔ اور اس کو وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو پہلے تھا۔ اسی دور میں اسلامی تاریخ کے لئے کچھ فیصلہ کن واقعات ہوئے، حملہ آوروں کی شکست ہوئی۔ منگولوں کے حملے رک گئے۔ اور مغرب میں مسلمانوں کا زوال ہوا۔ لیکن مصر کے لئے یہ سنہری دور تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ الازہر کے لئے۔ اس لئے کہ خلیفہ بغداد اور دوسرے بڑے علمار کو اس نے پناہ دی، ان حضرات نے بارہا الازہر کے منبر سے خطبات دیئے۔ اس دور کی حکایات نے اسلامی تاریخ کے واقعات کو مالا مال کیا ہے

عثمانیوں کے دور (۱۵۱۷ء تا ۱۸۰۵ء) میں الازہر

عتیق نے لکھا ہے مصر پر عثمانیوں کی فتح مصر کی آزادی اور تہذیب کے خاتمے کا پیغام لائی۔ الازہر اور دوسرے ادارے اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ حالاں کہ احمد گر الازہر کے مداحوں میں سے تھا اور اس نے سائنس کو پھر داخل نصاب کیا۔ لیکن یہ کوشش محض انفرادی تھی۔ ورنہ عثمانی حکومت کی علم پالیسی میں الازہر کے احیا کا کوئی اشارہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس عثمانی حکمرانوں نے اس کو رجعت پسند درس گاہ بنا دیا تھا تاکہ والیوں کی مطلق العنانی بلا روک ٹوک چل سکے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ازہری عثمانیوں کے خلاف جان توڑ کر لڑے۔ سیدی نے اس کو مشرق میں الازہر کی پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا ہے۔ سید عمر مکرم اور شیخ عبداللہ شرقوی نے عثمانیوں کے ظلموں کو ختم کرنے اور محمد علی کو تخت نشین کرانے میں لوگوں کی رہنمائی کی۔ خلیفہ بننے کے بعد محمد علی کو الازہر کا روایتی لباس انھی دونوں نے پہنایا تھا۔

علوی خاندان کے دورِ حکومت (۱۸۰۵ء تا ۱۹۴۵ء) میں الازہر

محمد علی (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء) کی طرف داری میں الازہر کے اساتذہ نے پہل کی اور انھی کی بدولت مئی ۱۸۰۵ء میں وہ والی ہوئے۔ محمد علی ازہر یونیورسٹی کی بہتری اور ترقی کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے، وہ وہاں کے اساتذہ کی ہمت افزائی کرتے اور ان کے مشوروں کو مانتے تھے انھوں نے الازہر کے طلبا ہی میں سے پہلا گروہ چن کر طب اور قانون کے شعبے قائم کئے۔ ۱۸۲۶ء میں محمد علی نے ایک تعلیمی مشن پیرس بھیجا۔ اس میں ازہری علمار بھی

شامل تھے۔ مصر اور پورے مشرق میں سائنسی علوم کا مرکز قائم کرنے میں الازہر کے علماء کا بڑا ہاتھ تھا۔ ازہری علماء ہی نے انیسویں صدی میں جمہوری طرزِ حکومت کے لئے ایک مجلس قانون ساز بنائی۔ محمد علی نے ان میں سے دس کو پہلی مجلس کا رکن نامزد کیا۔

اسماعیل خدیو (۱۸۶۳ء تا ۱۸۸۲ء) نے مصر کو یورپین اثرات سے متاثر کرنے کی خواہش میں الازہر کے اندر بہت سی اصلاحات کر ڈالیں، مثلاً باقاعدہ نصابِ تعلیم مجلس ممتحنین اور امتحانات کے باقاعدہ طریقوں کی ابتدا۔ یہ اصلاحات ۱۸۷۲ء میں کی گئیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد یہ تمام اصلاحات ناکام ہو گئیں اس کی وجہ اسماعیل کی (Banorafeias) اور شیوخ کی ناکامی تھی شیوخ اپنے فوری مفاد کی خاطر الازہر کی سیاسی جتھہ بندی سے فائدہ اٹھانے کی دھن میں اندھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ان اصلاحات پر عمل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

الازھر اور امام عبدہ (متوفی ۱۹۰۵ء)

چونکہ الازہر اسلامی دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھا اس لئے مفتی عبدہ نے خیال ظاہر کیا کہ اگر الازہر کی اصلاح کی جائے تو یہ اسلامی دنیا کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ جامعہ ازہر کی تعلیم مغربی طرزِ تعلیم کے ساتھ قدم بہ قدم چلے۔ انہوں نے (Corporate Life) طلباء کی حالت کو بہتر بنانے اور اساتذہ کا معیار بلند کرنے کی طرف بھی بہت توجہ کی۔ امام نے خدیو عباس دوم (۱۸۹۲ء تا ۱۹۰۶ء) پر دباؤ ڈال کر ۱۸۹۶ء میں ایک فرمان شائع کرایا جس کی رو سے اساتذہ کی تنخواہیں لیاقت، مدتِ ملازمت، اور اہمیت کے اعتبار سے بڑھائی گئیں۔ طلباء کو حسب ضرورت کھانے کا سامان مفت دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ صحت و صفائی کی مراعاۃ بھی بہم پہنچائی گئیں۔ طلباء کے قیام اور ان کی رہائش کے مسائل کو حل کیا گیا۔ الازہر کا بجٹ پونے چوالیس لاکھ پاؤنڈ سے ایک کروڑ مصری پاؤنڈ کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں وزارتی پیمانے پر ایک انتظامیہ کمیٹی بھی بنائی گئی جس میں الازہر کے سینیئر پروفیسر اور حکومت کے نمائندے شامل تھے۔ امام عبدہ اور شیخ عبدالکریم سلمان نے الازہر میں صحیح معنوں میں اصلاحات لانے کی عظیم کوششیں کیں۔ مجلس انتظامیہ اور ۳۰ اساتذہ کی ایک کمیٹی کے ذمے تعلیمات کے نصاب کے خاکے تیار کرنے کا کام سپرد ہوا۔ اور ریاضی، الجبرا، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین ابتدائی منزل

میں دوبارہ داخل نصاب کئے گئے۔ منزل ثانوی کے طریقے کو جدید رنگ میں تبدیل کیا گیا۔ اور آخری درجے کے امتحان کا معیار مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے جامعہ ازہر کے کتب خانوں کی بھی از سر نو تنظیم کی بعد مختلف لائبریریوں کو مختلف عمارتوں میں منتقل کیا گیا۔ ایک مرکزی کتب خانہ بھی قایم کیا گیا۔ تمام کتب خانوں کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا اور درجہ بندی کی گئی۔

امام عبدہٗ کا اصل مقصد اسلامی دنیا کو عالمانہ رنگ میں رنگنے کی تحریک کو الازہر کے ذریعے زندہ کرنا تھا۔ اسی کے پیش نظر وہ الازہر واپس آئے۔ اور وہاں اپنے اچھے شاگردوں کا ایک گروہ چھوڑ گئے۔ ۱۹۰۵ء میں امام عبدہٗ کے انتقال کے بعد الازہر کی حالت ایک بار پھر سقیم ہونے لگی لیکن ان کے احیاء پسند مقلدین کے بیدار داعیوں کو دور غلایا نہیں جاسکا۔ ان لوگوں نے حکومت پر کافی دباؤ ڈالا حتیٰ کہ حکومت اعلیٰ پیمانے کی ایک دوسری کمیٹی بنانے پر مجبور ہو گئی۔ ۱۹۱۱ء میں فتحی زاغلول پاشا، عبدالخالق، ثروت پاشا اور اسماعیل صدقی پاشا پر مشتمل یہ کمیٹی وجود میں آئی۔ اس کمیٹی کی اہمیت کا اندازہ اس کے اراکین کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص ایک سے زائد بار مصر کا وزیر اعظم رہا تھا۔ کمیٹی نے ۱۹۱۱ء کی دفعہ ۱۰ کے نام سے ایک ضابطہ بنایا جس کی رو سے تعلیم کو مختلف منزلوں میں تقسیم کیا۔ ان کے لئے مخصوص مضامین اور ضابطے بنائے اور نصاب تعلیم میں نئے مضامین شامل کئے۔ ریکٹر (Rector) کے اختیارات کا تعین کیا گیا۔ اور یونیورسٹی کے معاملات کی نگرانی کے لئے ان کے اوپر ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا اپنا دائرہ عمل تھا۔ ہر مذہبی ادارے کا ایک شیخ (Principal) نامزد کیا گیا۔ تقررات، ترقیات، نظم و ضبط، رخصت، طلبا کے داخلے، تعطیلات، امتحانات، نصاب و اسناد وغیرہ کے سلسلے میں نہایت اہتمام سے قاعدے اور ضابطے بنائے گئے۔

چوں کہ ۱۹۱۱ء کا ضابطہ الازہر کو ایک جدید رنگ کی یونیورسٹی بنانے سے قاصر رہا۔ اس لئے یونیورسٹی کے اندر اور باہر سے مختلف طبقہ ہائے خیال کے لوگوں نے مزید اصلاحات کے لئے آوازیں بلند کیں۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں مجلس قانون ساز نے ضابطہ ۴۹ نافذ کیا جس کی رو سے تین شعبے (Faculties) قایم کئے گئے یعنی شعبۂ دینیات، شعبۂ فقہ اور شعبۂ زبان عربی۔ درحقیقت اس قانون سے جامعہ ازہر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور اسی کو ہم جامع ازہر کو جدید اور سائنٹیفک یونیورسٹی بنانے کی پہلی سرکاری کوشش کا نام دے سکتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں اس قانون پر نظر ثانی کر کے قانون ۳۷ کا نفاذ ہوا تھا۔

الازہر اور شیخ المراغی (متوفی ۱۹۴۶ء)

شیخ المراغی مفتی عبدہٗ کے شاگرد تھے جو بہت ہی معزز اور بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹۳۹ء میں الازہر

کے ریکٹر مقرر کئے گئے۔ حقیقت میں جامعہ ازہر کو ایک مکمل جدید یونیورسٹی بنانے کا اصل سہرا الظفی کے سر ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں قانون ۲۶ کے ذریعے الازہر میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرایا۔ الازہر سے طلبا کے وفود تعلیم، فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور دوسرے مقبول جدید مضامین میں مخصوص مطالعے کی غرض سے یورپی یونیورسٹیوں کو بھیجے گئے۔

۱۹۳۶ء کے اسی قانون کے مطابق الازہر کا موجودہ نصاب تعلیم چل رہا ہے۔ ذیل میں اس کا خاکہ پیش ہے:۔

منزل ابتدائی | اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

عربی زبان، گرامر، قرآن کے (Phonetics) شریعت کے ابتدائی اصول، جغرافیہ، ریاضی، اصول صحت ڈرائنگ اور خوش خطی، ابتدائی مدرسے میں داخلے کے لئے ایک امتحان داخلہ پاس کرنا ضروری ہے۔ اس میں عربی کہانیوں کو صحیح پڑھنا، خوش خطی اور علم ہندسہ کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کا حفظ یاد ہونا بھی ضروری ہے۔ ابتدائی مدرسے میں چار سالہ کا کورس ہے۔ ہر سال کے اختتام پر زبانی اور تحریری امتحانات ہوتے ہیں اور چوتھے سال کے ختم پر ایک عام امتحان ہوتا ہے۔

منزل ثانوی | اس میں پانچ سال کی تعلیم ہے۔ داخلے کے لئے ابتدائی مدرسے کا سرٹیفکیٹ ہونا لازمی ہے۔ سالانہ امتحانات اور پھر آخری علم امتحان مدرسہ ابتدائی ہی کی طرح ہوتے ہیں ۔۔۔۔ نصاب میں اصول شریعت، تفسیر، روایت، قرآن کا متن اور اصطلاحیات، سیاسیات، عربی ادب، عروض، گرامر، مناظرہ، عددیات، فن خطابت، انشاء، منطق، فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی اور جغرافیہ شامل ہیں۔ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد طالب علم کو سندی کے کسی بھی شعبے میں داخلے کی اجازت ہوتی ہے۔

منزل سندی (بی۔ اے آرز) | اس منزل میں چار سالہ نصاب۔ اور تین الگ الگ شعبے ہیں۔ تحریری اور زبانی امتحانات سالانہ بھی ہوتے ہیں اور چوتھے سال کے آخر میں علم امتحان ہوتا ہے پرچوں کو دو الگ ممتحن جانچتے ہیں۔ اور زبانی امتحان کے وقت کئی پروفیسر موجود ہوتے ہیں۔ شعبہ دینیات کے نصاب میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں:۔

علم توحید، تفسیر، قرآن کریم کا تنقیدی مطالعہ، علم سلسلہ نسب، منطق، علم مناظرہ، اخلاقیات، فلسفہ، اسلامی قانون کے اصول، تاریخ اسلام، نفسیات اور انگریزی اور فرانسیسی میں سے کوئی ایک زبان۔

شعبۂ قانون اسلامی کا نصاب | علم تفسیر، روایت کا تنقیدی مطالعہ، اسلامی قانون کے اصول، اصول دیان، مسلم

فلسفہ قانون کی تاریخ، منطق، فلسفہ اور انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں سے کوئی ایک اختیاری طور پر۔

شعبۂ زبانِ عربی کا نصاب | صوریات، قواعد، فلسفہ، انشاء، عربی ادب، تاریخ ادب عربی، عروض، علم قافیہ بیانی اور ادبی تنقید، فقہ کے اصول، تفسیر منطق، سماجیات، سیاسی تاریخ اور جغرافیہ ان مضامین کے علاوہ ان میں سے کوئی ایک غیر ملکی زبان (انگریزی، فرانسیسی، ہبرو، فارسی، اور ترکی)

اعلیٰ درجہ (پوسٹ گریجویٹ منزل) کا نصاب | اعلیٰ منازل کی تعلیم کو ہر شعبے میں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ Professional degree Course اور ۲۔ Subjective degree Course 2

پہلے حصہ کی مدت تعلیم دو سال ہے۔ سالانہ امتحانات تحریری اور زبانی ہوتے ہیں۔ دوسرے سال کے آخر میں پبلک امتحان ہوتا ہے۔

دوسرے حصے کی مدتِ تعلیم تین سے سات سال تک ہے۔ اس میں سالانہ یعنی میعادی امتحانات نہیں ہوتے بلکہ ہر تیسرے سال تحریری اور زبانی عام امتحان ہوتا ہے۔ جو طلباء امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں صرف ان کو اس کا اہل قرار دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص موضوع پر مقالہ لکھیں۔ ایسے نئے موضوع پر جس پر پہلے نہ لکھا گیا ہو ممتحنین کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ مقالہ پروفیسروں کی ایک جماعت کے سامنے زیر بحث آتا ہے امیدوار کو مقالہ کا خلاصہ اور اس کی تیاری کے سلسلہ میں تمام ضروری اقدامات سب کے سامنے بیان کرنا ہوتے ہیں۔ مجلس ممتحنین امیدوار کی قابلیت کو کھلے طور پر جانچتی ہے۔

شعبۂ دینیات میں پہلے حصے یعنی Professional degree Course کا نصاب:

علم قرآن، علم حدیث، مسلم فرقوں کی تاریخ، فن تقریر و مباحثہ، تاریخ اسلام اور ان کے علاوہ ایک یوروپی اور ایک مشرقی زبان

شعبۂ دینیات میں دوسرے حصے یعنی Subjective degree Course کا نصاب:

علم وحدانیت کا تشریحی مطالعہ، منطق، فلسفہ اور اخلاقیات یا تفسیر میں سے کوئی ایک مضمون۔

شعبۂ قانونِ اسلامی میں پہلے حصے کا نصاب:

مسلم عدالتوں کے قانون اور اصولِ وقف اور وراثت کے قانون اور ان کے ساتھ بین الاقوامی قانون۔ ریاست کا تعینی قانون۔ اسلام کے منصف اور منصفی کے نظام۔ اصولِ معاشیات۔ علم طب اور علم نجوم کا خاکہ۔ اور انگریزی یا فرانسیسی میں سے اختیاری طور پر کوئی ایک زبان۔

شعبۂ قانون اسلامی میں دوسرے حصہ کا نصاب :

مسلم قانون کا تجزیاتی مطالعہ۔ اور اس کے ساتھ مسلم قانون کا فلسفہ۔ اسلام کے نظام عدالت کی تاریخ۔

شعبۂ زبان عربی میں پہلے حصہ کا نصاب :

عام نفسیات، تعلیمی نفسیات، اصول تعلیم، تاریخ تعلیم، مدرسہ کی تنظیم، تدریس کے طریقے، صحت و صفائی، ڈرائینگ، مضمون نگاری، جسمانی تعلیم اور اختیاری طور پر ایک غیر ملکی زبان۔

شعبۂ زبان عربی میں دوسرے حصے کا نصاب :

قواعد، صوریات، علم صرف، علم اللسان، عروض، ابتدائی ہبرو اور شامی زبان، فن خطابت، عربی ادب، تاریخ عربی ادب اور عروض ۔

۱۹۳۵ء کے قانون ۲۶ کے مطابق الازہر کا پرانا حصہ جو مسجد میں ہے ان طلبار کے لئے حاصل کر لیا گیا تھا جو مذہب اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس حصہ میں عمر، نصاب اور وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ بہرحال آخر میں اہلیۃ الغربار، اور علیمات الغربار کے نام سے دو امتحان رائج کئے گئے اور مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ سات سال مقرر کی گئی۔ درحقیقت یہ حصہ Extension lecturer صحر کے مقصد کو پورا کرتا تھا سینکڑوں طلبا ان اسباق میں محض سامع کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے تھے اور اس طرح یونیورسٹی کی تعلیم کا ایک حصہ حاصل کر لیتے تھے۔

پچھلے ایک ہزار سال میں لکھی گئی الازہر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ روحانی اور جسمانی دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا اور یہی دونوں اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اسلام ریاست اور مذہب میں کسی حد فاصل کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ مذہب کو ریاست کی تکمیل کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اسلام کے اسی نظریۂ زندگی کو سامنے رکھ کر الازہر کی تعلیم کا تعین کیا گیا۔ اگر الازہر کے نصاب تعلیم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی اور حال دونوں زمانوں میں اس کی تعلیم کا مقصد یہی رہا ہے کہ اچھے عالم، مفکر اور منتظم اور رہنما پیدا کئے جائیں۔ ابتدا ہی سے اور خاص طور پر امام عبدہٗ کی اصلاحات کے بعد سے الازہر کا پورا انتظام ان چار اصولوں پر مبنی رہا ہے تزکیۂ نفس، عمدہ سماجی زندگی، معاشی خود کفالتی، اور خدمت و ایثار۔

اگرچہ الازہر کے تمام نصاب ہائے تعلیم قرآن کی تعلیمات کی بنیاد پر تیار کئے گئے تھے تاہم وہاں کا نظام تعلیم کبھی بھی مولوی پیدا کرنے کے مقصد پر مبنی نہیں رہا ہے۔ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، ہر فرد اپنے اعمال کا ذاتی طور سے ذمے دار سمجھا گیا ہے، اور محض کے

نزدیک خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے شخص کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے تو اسلام ایک سیکولر نظام کا حامی ہے۔ معلوم ہوتا ہے الازہر کی متعین پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اسلامی اصولوں کی اصل روح کی پیروی کی جائے۔ یہ ضرور ہے کہ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے کبھی کبھی اس راستے سے اسے ہٹنا پڑا ہے۔ امام عبدہٗ سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے دور تک الازہر نے اول درجے کے رہنما، منتظم اور مفکر مصر کو عطا کئے ہیں۔ اور جہاں تک مشرق قریب اور عرب ممالک کا تعلق ہے وہاں کے ملکی معاملات میں بھی بہت سے ازہر کے فارغ شدہ لوگ داخل رہے ہیں۔ گویہ صورت حال اسی وقت تک تھی جب تک ان ممالک کو سامراجی ریشہ دوانیوں نے اپنے شکنجے میں نہیں لیا تھا۔ مشرق کی ایک جدید جمہوریہ انڈونیشیا کی حکومت اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر الازہر ہی کے فارغ شدہ ہیں۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے بانی اور علی گڑھ کالج کے معماروں میں سے ایک معمار مولانا شبلی نعمانی جامعہ ازہر ہی کے فارغ التحصیل[1] تھے۔ زندہ شخصیتوں میں ہندوستان میں مولانا ابوالکلام کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں[2]۔

چوں کہ اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ رہا ہے کہ اچھے اور کارآمد شہری پیدا کئے جائیں اس لئے الازہر نے ہمیشہ اس بنیادی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ازہر کا طالب علم یا تو سیاست داں بن کر نکلتا ہے یا ماہر تعلیم۔ البتہ خود مصر میں یہ صورت حال نہیں ہے اس لئے کہ ازہری طلباء کی ایک بڑی تعداد کو حکومت کی ملازمتوں یا سفارتی کاموں پر مامور کیا جاتا ہے۔

جامعہ ازہر نے سائنٹفک تعلیم کے سلسلہ میں بھی کافی کام کیا ہے۔ ریاضی، علم طبیعات و کیمیا، اور علم نجوم کے سلسلہ میں، بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اس یونیورسٹی سے نہ صرف مشرقی ممالک بلکہ یورپ کے مختلف ممالک کے بہت سے طالب علم بھی بے قاعدہ طور سے مختلف شکلوں میں جامعہ ازہر کی کلاسوں میں بیٹھتے ہیں۔

جامعہ ازہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونیورسٹی کے ماحول کے اعلیٰ ترین معیار کو ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ یعنی مختلف مدرسہ ہائے خیال کو بیک وقت اور ہر زمانہ میں برداشت کیا ہے۔ شیخ المراغی نے مسلم فرقوں کے اتحاد کے پیش نظر "فرقوں کے اتحاد کی تحریک" کے نام سے ایک تحریک چلائی تھی جو دنیا بھر میں بہت پسند کی گئی۔

اسلامی دنیا کے مدبرین عموماً اور مصر کے خصوصاً الازہر کی ہیئت اور نوعیت کے سلسلہ میں اس وقت

---

[1] یہ درست نہیں ہے (مصحح) [2] یہ بھی درست نہیں

شعبۂ قانون اسلامی میں دوسرے حصہ کا نصاب :

مسلم قانون کا تجزیاتی مطالعہ۔ اور اس کے ساتھ مسلم قانون کا فلسفہ۔ اسلام کے نظام عدالت کی تاریخ۔

شعبۂ زبان عربی میں پہلے حصہ کا نصاب :

عام نفسیات، تعلیمی نفسیات، اصول تعلیم، تاریخ تعلیم، مدرسہ کی تنظیم، تدریس کے طریقے، صحت و صفائی، ڈرائینگ، مضمون نگاری، جسمانی تعلیم اور اختیاری طور پر ایک غیر ملکی زبان۔

شعبۂ زبان عربی میں دوسرے حصے کا نصاب :

قواعد، صوریات، علم صرف، علم اللسان، عروض، ابتدائی عبرانی اور شامی زبان، فن خطابت، عربی ادب، تاریخ عربی ادب اور عروض ۔

سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون نمبر ۲۶ کے مطابق الازہر کا پرانا حصہ جو مسجد ہے ان طلباء کے لئے حاصل کر لیا گیا تھا جو مذہب اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس حصہ میں عمر، نصاب اور وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ بہر حال آخر میں اہلیۃ الغرباء اور علمیات الغرباء کے نام سے دو امتحان رائج کئے گئے اور مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ سات سال مقرر کی گئی۔ درحقیقت یہ حصہ Extension lectures کے مقصد کو پورا کرتا تھا۔ سینکڑوں طلباء ان اسباق میں محض سامع کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے تھے اور اس طرح یونیورسٹی کی تعلیم کا ایک حصہ حاصل کر لیتے تھے۔

پچھلے ایک ہزار سال میں لکھی گئی الازہر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ روحانی اور جسمانی دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا اور یہی دونوں اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اسلام ریاست اور مذہب میں کسی حد فاصل کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ مذہب کو ریاست کی تکمیل کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اسلام کے اسی نظریۂ زندگی کو سامنے رکھ کر الازہر کی تعلیم کا تعین کیا گیا۔ اگر الازہر کے نصاب تعلیم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی اور حال دونوں زمانوں میں اس کی تعلیم کا مقصد یہی رہا ہے کہ اچھے عالم، مفکر اور منتظم اور رہنما پیدا کئے جائیں۔ ابتدا ہی سے اور خاص طور پر امام عبدہٗ کی اصلاحات کے بعد سے الازہر کا پورا نظام ان چار اصولوں پر مبنی رہا ہے: تزکیۂ نفس، عمدہ سماجی زندگی، معاشی خود کفالتی، اور خدمت و ایثار۔

اگرچہ الازہر کے تمام نصاب ہائے تعلیم قرآن کی تعلیمات کی بنیاد پر تیار کئے گئے تھے تاہم وہاں کا نظام تعلیم کبھی بھی مولوی پیدا کرنے کے مقصد پر مبنی نہیں رہا ہے۔ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، ہر فرد اپنے اعمال کا ذاتی طور سے ذمے دار سمجھا گیا ہے، اور محض کے

نزدیک خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے شخص کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے تو اسلام ایک سیکیولر نظام کا حامی ہے۔ معلوم ہوتا ہے الازہر کی متعین پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اسلامی اصولوں کی اصل روح کی پیروی کی جائے۔ یہ ضرور ہے کہ حالات کی ناساعدت کی وجہ سے کبھی کبھی اس راستے سے اسے ہٹنا پڑا ہے۔ امام عبدہٗ سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے دور تک الازہر نے اول درجہ کے رہنما، منتظم اور مفکر مصر کو عطا کئے ہیں۔ اور جہاں تک مشرق قریب اور عرب ممالک کا تعلق ہے وہاں کے ملکی معاملات میں بھی بہت سے ازہر کے فارغ شدہ لوگ داخل رہے ہیں۔ گویہ صورت حال اسی وقت تک تھی جب تک ان ممالک کو سامراجی ریشہ دوانیوں نے اپنے شکنجے میں نہیں لیا تھا۔ مشرق کی ایک جدید جمہوریہ انڈونیشیا کی حکومت اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر الازہر ہی کے فارغ شدہ ہیں۔ ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کے بانی اور علی گڈھ کالج کے معماروں میں سے ایک معمار مولانا شبلی نعمانی جامعہ ازہر ہی کے فارغ التحصیل تھے[۱]۔ زندہ شخصیتوں میں ہندوستان میں مولانا ابوالکلام کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں[۲]۔

چوں کہ اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ رہا ہے کہ اچھے اور کارآمد شہری پیدا کئے جائیں اس لئے الازہر نے ہمیشہ اس بنیادی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ازہر کا طالب علم یا تو سیاست داں بن کر نکلتا ہے یا ماہرِ تعلیم۔ البتہ خود مصر میں یہ صورت حال نہیں ہے اس لئے کہ ازہری طلباء کی ایک بڑی تعداد کو حکومت کی ملازمتوں یا سفارتی کاموں پر مامور کیا جاتا ہے۔

جامعہ ازہر نے سائنٹفک تعلیم کے سلسلہ میں بھی کافی کام کیا ہے۔ ریاضی، علم طبیعات وکیمیا، اور علم نجوم کے سلسلہ میں، بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اس یونیورسٹی سے نہ صرف مشرقی ممالک بلکہ یورپ کے مختلف ممالک کے بہت سے طالب علم بھی بے قاعدہ طور سے مختلف شکلوں میں جامعہ ازہر کی کلاسوں میں بیٹھتے ہیں۔

جامعہ ازہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونیورسٹی کے ماحول کے اعلیٰ ترین معیار کو ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ یعنی مختلف مدرسہ ہائے خیال کو بیک وقت اور ہر زمانہ میں برداشت کیا ہے۔ شیخ المراغی نے مسلم فرقوں کے اتحاد کے پیش نظر "فرقوں کے اتحاد کی تحریک" کے نام سے ایک تحریک چلائی تھی جو دنیا بھر میں بہت پسند کی گئی۔

اسلامی دنیا کے مدبرین عموماً اور مصر کے خصوصاً الازہر کی ہیئت اور نوعیت کے سلسلہ میں اس وقت

---

[۱] یہ درست نہیں ہے (مصحح) [۲] یہ بھی درست نہیں

دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ایک گروہ کے رہ نما ہیں جن کی مخلصانہ رائے یہ ہے کہ الازہر میں مختلف النوع نصابِ تعلیم کو رائج کر کے اس کے تاریخی کردار کو برقرار رکھنا چاہئے۔ اس طبقۂ فکر نے اصل میں اس خیال کی تائید کی ہے کہ الازہر عہدِ وسطیٰ میں ایک نمونہ کی یونیورسٹی تھی اور مغرب میں یونیورسٹی تعلیم کے پیشواؤں نے الازہر ہی کی نقل کی تھی۔ بلکہ یہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مغرب میں یونیورسٹی کا خیال ہی الازہر کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اس گروہ کی رائے یہ ہے کہ الازہر کو علم کی سچی لگن کے کلاسیکی معیار کو قائم رکھنا چاہئے۔ اور یونیورسٹی کے جدید تصور سے دور رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ آج تعلیم مختلف پیشوں vocations میں مہارت کے حصول کی غرض سے لی جارہی ہے اور یونیورسٹیوں سے مختلف کام جاننے والے احمق پیدا ہو رہے ہیں۔

عبد المتعال السعیدی جدید خیال رکھنے والے گروہ کے رہ نما ہیں۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ الازہر کو جدید یونیورسٹیوں کے نمونے پر از سرِ نو تشکیل دیا جائے تاکہ آج کے زمانے کے ساتھ قدم بہ قدم چلا جاسکے۔

موجودہ جامعہ ازہر کے معمار شیخ المراغی نے مختلف خصوصیتوں پر مبنی ایک بہت ہی عمدہ خاکہ تیار کیا۔ اور یونیورسٹی کو پختہ بنیادوں پر کھڑا کیا۔ شیخ نے عہدِ قدیم کی قابلِ قدر خوبیوں کو بھی برقرار رکھا اور جدید زمانے کی روح کو بھی سمویا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۹ء تک ان کی تیار کی ہوئی اس اسکیم نے الازہر کی زندگی میں ایک معجزے کا کام کیا۔ اس عرصہ میں الازہر کا بنیادی مقصد پورا کرنے کے لئے مغرب و مشرق میں وفود بھی بھیجے گئے۔

آج کل الازہر کا انتظام ایک اعلیٰ مجلس انتظامیہ چلاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علماء کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی ہے اور ان دونوں مجالس کے صدر ریکٹر (شیخ الجامعہ) ہیں۔ اول الذکر مجلس میں ریکٹر، نائب ریکٹر، شعبوں کے صدر، مفتی اعظم، مالیات قانون اور وقف کے نائب معتمدین اور کچھ معزز شہری ہوتے ہیں۔ مشاورتی کمیٹی میں تیس ۳۰ اراکین ہوتے ہیں۔ ان میں عملے کے بڑے اور پرانے کارکن، دیوان الافتاء کے عملے کے سینیر ممبر، اور عدالت قانون ذاتی کے عملے کے سینیر ممبر شامل ہوتے ہیں۔

تصحیح بابت مضمون تصانیف اشعری - ۱- برہان بابت دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۳۶۲ سطر ۱ میں راجپوری کے بجائے رامپوری پڑھا جائے۔ ۲- برہان دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۳۶۶ سطر ۶ میں خوطی کے بجائے دوطی، یعنی خ کے بجائے ف ہونا چاہئے۔ ۳- برہان دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۳۷۴ سطر ۱ میں دو جگہ ارجا ہے۔ دوسرے لفظ میں الف ہونا چاہئے۔ یعنی ارجان۔ ۴- برہان جنوری ۱۹۵۷ء ص ۵۲ سطر ۴ میں محمد بن عبد لفیمری، کی بجائے محمد بن عمر الفیمری ہونا چاہئے۔ اسی طرح سطر ۷ میں محمد بن عبد، کی جگہ محمد بن عمر ہے

ادبیات

غزل

(جناب آلم مظفرنگری)

ہر پردۂ مجاز کہ جلوا کہیں جسے — دھوکا ہے ایک وہم تماشا کہیں جسے
ہے ربطِ حسن و عشق کا در پردہ ایک راز — کہنے کو صرف جذبِ تمنا کہیں جسے
رکھتی ہے غرقِ مے کدہ دنیائے عشق کو — وہ اک ادا کہ جنبشِ مینا کہیں جسے
پروانے گردِ شمع لگن ڈھونڈتے رہے — اس سوزِ غم کو انجمن آرا کہیں جسے
لے آئیں مجھ کو آپ ہی طوفاں کی شورشیں — اس موج تک کہ ساحلِ دریا کہیں جسے
یوں تو ہیں اس میں پہلوئے تسکیں کئی مگر — ہے اک فریبِ وعدۂ فردا کہیں جسے
دل کو نہیں حقیقتِ دل کو بغور دیکھ — یہ ہی تو ہے وہ قطرہ کہ دریا کہیں جسے
اٹھتا ہے دشتِ نجد سے کیوں آج بار بار — ایسا غبار محملِ لیلا کہیں جسے
ہر برگِ گل پہ موجۂ شبنم ہے یوں عیاں — بہتی ہوئی سی مستیٔ صہبا کہیں جسے
دیکھے تو کوئی حاصلِ ناکامیٔ وفا — رشکِ چمن ہے داغِ تمنا کہیں جسے
دو گام بھی نہ خضر مرے ساتھ چل سکے — اس دشتِ بے پناہ میں دنیا کہیں جسے
وحشت نواز آنکھ نے دیکھا ہے بارہا — ذرے میں بھی ہے وسعتِ صحرا کہیں جسے

کیا مرتبہ ہے گنبدِ خضریٰ کا اے آلم
پرتو ہے اس کا گنبدِ مینا کہیں جسے

غزل

(جناب شمس تنویر)

فنا کے خوف میں ذوقِ ثبات بھی تو نہیں — حیات کیسی شعورِ حیات بھی تو نہیں
کمالِ فکر و نظر کائنات ساز بھی ہے — مآلِ فکر و نظر کائنات بھی تو نہیں!
شبِ سیاہ سے مغرور کارواں والو! — سحر کی عمر حسیں ایک رات بھی تو نہیں
ترے حصول کی حسرت جنوں سہی اے دوست — ترے بغیر سکونِ حیات بھی تو نہیں
مزاجِ حسن پہ الزام ہے تغافل کا — طلب میں خاص غمِ التفات بھی تو نہیں!

مرے فسانہ کی ٹوٹی ہوئی سی کڑیاں ہیں
کہ جن میں سلسلۂ واقعات بھی تو نہیں

"گزارشِ مجبور"

جناب فضا ابن فیضی

گدازِ قلب دے، سوزِ جگر دے
مرا ساغر تہی ہے اس کو بھر دے

اُٹھا دے جہل و نادانی کے پردے
مذاقِ امتیازِ خیر و شر دے

الٰہی ! نالہائے نیم شب میں
دعائے صبح گاہی کا اثر دے

اسے دے وسعتیں دو نو جہاں کی
مرے سینے میں اپنا راز بھر دے

ترا فیضِ کرم اور شبنم آسا
میں قطرہ ہوں سمندر مجھ کو کر دے

خرد مجھ کو جنوں شیوہ عطا کر
جنوں مجھ کو خرد آشوب تر دے

ترے سرِّ نہاں کو فاش دیکھوں
وہ چشمِ نکتہ بیں و نکتہ ور دے

رہینِ کُرّۂ خاکی کو اپنے
سرِ گردوں مجالِ رہ گزر دے

زیاں پرور ہے سودِ زندگانی
خیالِ سود و نقصاں محو کر دے

جگر کو مخزنِ سوزِ نفس کر
نظر کو جلوہ ہائے معتبر دے

مرا دل ہو چراغِ لالۂ طور
خودی کی آگ سے سینے کو بھر دے

جنوں کو جیب و پیراہن عطا کر
مری ویرانہ سامانی کو گھر دے

مراحل سب جہاں بینی کے طے ہوں
جو پہنچے لامکاں تک وہ نظر دے

یہ دنیا ہو چکی آئینہ مجھ پر
جہاں تو ہے وہاں کی اب خبر دے

مجھے رہتا ہے مثلِ بو پریشاں
چمن سے اب مجھے اذنِ سفر دے

یہی سامانِ جمعیّت ہے مجھ کو
مجھے مثلِ گریباں چاک کر دے

زمانے میں ہوں میں اک جنسِ نایاب
پھر اس نایاب کو تو عام کر دے

دعا یہ ہے کہ مثلِ نکہتِ گُل
مجھے اہلِ چمن پر فاش کر دے

تبصرے

ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع ابن ماجہ از مولانا عبدالرشید نعمانی تقطیع کلاں ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب. آرام باغ - کراچی -

یہ رسالہ عربی زبان میں ہے - جیساکہ نام سے ظاہر ہے اس میں سنن ابن ماجہ جو حدیث کی مشہور کتاب ہے اُس سے متعلق مختلف مباحث مثلاً صاحب کتاب کا ترجمہ اور محدثین میں اُن کا مقام، محدثین کے نزدیک کتاب کی روایات کی حیثیت - کن کن محدثین نے کتاب کی کن روایات کو مجروح یا ضعیف قرار دیا ہے - کن حضرات نے اُس کی شرح یا اُس پر تعلیقات لکھی ہیں - اِن سب پر محققانہ کلام کیا گیا ہے - شروع میں حدیث سے متعلق مختلف مباحث - حجیت حدیث - قرونِ ثلاثہ میں حدیث کی کتابت اور تدوین - محدثین کے طبقات - ائمۂ اربعہ اور اصحابِ صحاح کے شروطِ قبولِ روایت اُن پر بھی گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں مفید اور ٹھوس معلومات جو علم حدیث کے طلبار اور اساتذہ کے لئے ضروری ہیں یکجا ہو گئی ہیں اس حیثیت سے یہ رسالہ قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے - لیکن افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جگہ جگہ امام ابوحنیفہ اور ان کے مخالفین کی بحث اٹھا کر کتاب کو جدل و مناظرہ کا رنگ دے کر اُس کی علمی حیثیت کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ خود حدیث کو معرضِ شک وارتیاب میں لا کھڑا کیا ہے - اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض محدثین نے امام اعظم کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے لیکن اس کا جواب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان محدثین پر اس طرح کے رکیک وسخیف حملے کئے جائیں جن سے اُن کا کمالِ فن ہی داغ دار ہو جائے اس سلسلہ میں امام بخاری - حافظ ابن حجر - اور حافظ ذہبی کی نسبت جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے - حد یہ ہے کہ امام بخاری کے متعلق یہاں تک نقل کر دیا گیا ہے کہ وہ بربنائے بغض وعناد امام ابوحنیفہ سے روایت نہیں کرتے لیکن اس کے برخلاف ایسے مستورالحال

لوگوں سے روایت کر دیتے ہیں جن کے متعلق بخاری جانتے بھی نہیں کہ کون تھے اور کون نہیں تھے (صفحہ ۲۸)
اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوشِ انتقام میں صحیح بخاری کے راویوں کی عدالت اور اُس کے امت کی طرف سے
تلقی بالقبول کو متکلم فیہ قرار دے دیا ہے۔ فاضل مصنف خود سوچیں کہ کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو منکرین
حدیث کہتے ہیں اور کیا امام بخاری کی عدالت، ثقاہت، تقویٰ و طہارت اور اُن کی صحیح کی صحت کو
مجروح کر دینے کے بعد بھی کسی اور کتاب حدیث پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
بعض متقدمین حنفیہ نے مجادلانہ طور پر امام بخاری، حافظ ابن حجر۔ ابن عدی۔ اور حافظ ذہبی وغیرہم کے
متعلق اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ علمی امانت و دیانت کا سر رشتہ
کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے اور غیظ و غضب میں کوئی بات ایسی نہ کہے جس سے دین کی اصل بنیاد میں
ہی رخنہ پڑ جائے۔ اگر امام بخاری بھی روایتِ حدیث ایسے اہم دینی معاملہ میں شخصی رضامندی یا نا رضامندی
کو دخل دینے سے محفوظ نہیں رہ سکتے تو پھر اس باب میں کسی اور پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ہاں
امام اعظم پر بعض ظاہر پرستوں نے حدیث سے ناواقفیت کا جو الزام لگایا ہے اُس کے جواب میں لائق
مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اُس میں بھی غلو پایا جاتا ہے تاہم بڑی حد تک صحیح اور معلومات افزا ہے۔ بہر
حال مجموعی حیثیت سے رسالہ علماء اور طلباء کے لئے مطالعہ کے لائق اور قابل قدر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے
مکتوبات و معاہدات

شاہانِ عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں کے نام دربارِ رسالت کی دینی، تبلیغی
سیاسی خط و کتابت اور معاہدات کو اُن کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ دعوت و تبلیغ کی تاریخ مکتوباتِ نبوی کی روشنی میں مرتب
کی گئی ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس و شگفتہ اور دل نشین ہے، اصل مکتوباتِ نبوی کے تین فوٹو
بھی کتاب میں شامل ہیں۔ مرتبہ سید محبوب رضوی صاحب، قیمت عہ علمی کتاب خانہ جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۳۸ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۵۷ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

گذشتہ مہینہ کے نظرات پڑھ کر محب دیرینہ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب نے جو علوم جدیدہ اور اسلامیات دونوں کے نامور اور متعارف فاضل ہیں ایک بہت طویل خط لکھا ہے جو "اسلام اور سائنس" پر ایک اچھا خاصہ مقالہ ہے ہم ذیل میں اس خط کے صرف چیدہ چیدہ ٹکڑے نقل کرتے ہیں جو متعلقہ نظرات پر حاشیہ یا منہیہ کی حیثیت رکھتے ہیں قارئین برہان کے لئے وہ دلچسپ بھی ہوں گے اور مفید بھی۔

موصوف لکھتے ہیں "برہان ملا۔ نظرات پڑھے۔ طبیعت پھڑک کر رہ گئی۔ سبحان اللہ! آپ نے کیا عمدہ بات لکھی ہے اس براعظم میں کتنے علامہ ہیں جو اس انداز سے فکر کرنے کے عادی ہیں۔ جس طرح آپ نے اس اہم پہلو پر غور فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں اس وقت مضمون لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں البتہ چند سطریں آپ کی تائید میں لکھتا ہوں۔ عنایت اللہ صاحب مشرقی (بانی تحریک خاکسار) اس صدی کے اوائل میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور سر جیمز جینز کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ میں مادیت کا دور دورہ تھا اور سر جیمز خود بہت بڑا مادہ پرست تھا۔ ایک مرتبہ اتوار کے دن مشرقی صاحب نے دیکھا کہ سر جیمز انجیل بغل میں دبائے گرجا جا رہے ہیں۔ مشرقی صاحب نے پوچھا "تعلیم اور عمل میں یہ تضاد کیسا؟" سر جیمز نے کہا "شام کو چائے پر آؤ تو میں سمجھا دوں گا" مشرقی صاحب حسب قرارداد پہنچے سر جیمز نے کہا "مشرقی! تم تصور کرو کہ چھ گولے ہوا میں معلق ہیں۔ جو فضا میں ایک دوسرے کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور آپس میں ٹکراتے نہیں۔ پھر یہ بھی تصور کرو کہ ان گولوں میں سے ہر ایک گولہ کے ارد گرد اسی طرح کے اور چھ گولے ہیں جو اسی طرح ایک دوسرے کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور اسی تصور کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جاؤ۔ پھر یہ بھی تصور کرو کہ ان میں کا ہر گولہ کرۂ ارض سے بڑا ہے۔ اب میں ان تمام باتوں پر غور کرتا ہوں تو پھر یہ کس طرح باور کر سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ یوں ہی ہو گیا اور ان کا کوئی صانع

اور خالق نہیں ہے " مشرقی صاحب بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ بولے " یہ بات جو آپ نے کہی قرآن بھی تو یہی کہتا ہے " پوچھا " وہ کس طرح " جواب دیا " دیکھئے قرآن کہتا ہے۔ " ومن الجبال جُدَدٌ بِیضٌ وحمرٌ مختلف الوانہا وغرابیب سودٌ = الآیہ۔ سر جینز نے سن کر کہا کہ مشرقی! اگر یہ آیت قرآن میں ہے تو پھر میں بھی مسلمان ہوں " (مشرقی صاحب نے غالباً یہ آیت اختلاف و تعدد اوضاع اور اتحادِ نوع کی مناسبت سے پڑھی ورنہ جینز نے جو بات کہی تھی اُسی مضمون کی قرآن میں دوسری آیتیں ہیں) (برہان)

یہ واقعہ بالکل سچا ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیے حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے اب انسان کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں خدا کو ماننے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ ابھی چند روز ہوئے میں ایک کتاب Immanuel Velikovsky جو Worlds in collision کی تصنیف ہے پڑھ رہا تھا مصنف نے اس میں تخلیقِ کائنات کی مذہبی روایات پر سائنس کے نقطۂ نظر سے بڑی عمدہ بحث کی ہے اور تاریخ میں ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ آپ نے نظرات میں قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ الکسس کیرل کی کتاب Man the unknown آپ نے پڑھی ہے آپ نے دیکھا ہوگا وہ کس خوبی سے ثابت کرتا ہے کہ اگرچہ ہمارے اعمال کا اثر بظاہر زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ ہمارے بدن اور ذہن پر اپنے ایسے اثرات اور نشانات چھوڑ جاتے ہیں جو قیامت تک فنا نہیں ہوتے۔

آپ نے ازجی کا ذکر کیا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ایٹم کی ایجاد کے بعد پرانا نظریہ بالکل بدل گیا ہے۔ اب مادہ اور ازجی دو متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ ازجی مادہ بنتی رہتی ہے اور مادہ ازجی۔ پہلے لوگ پوچھتے تھے کہ مادہ کہاں سے آیا اور کہتے تھے کہ مادہ کی حرکت سے ازجی پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ مادہ میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مادہ کی

حرکت سے نہ صرف انرجی پیدا ہوتی ہے بلکہ انرجی بھی ساتھ ساتھ مادہ بنتی چلی جاتی ہے - گویا مادیت کا خاتمہ خود مادیت کے ہاتوں ہوگیا -

اب جو چیز رہ گئی وہ صرف انرجی ہی انرجی ہے یعنی روحانیت !

آپ نے ایٹم کے ذکر میں ایک مصرعہ "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں" لکھا ہے تو یہ مصرعہ اقبال کا ہے حال میں ایٹم کا جو پہلا فوٹو لیا گیا ہے وہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک کائنات ہے جو شمس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - ذرہ کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے - مرزا عبدالقادر بیدل نے اس حقیقت کو پہلے ہی پالیا ہے - غور کیجئے کیا خوب لکھتے ہیں :-

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان ست ۔۔۔ نہاں در ہر کفِ ذرہ جہان ست

ایں دل حیرت سرا از نقش قدر تہا پر ست ۔۔۔ ذرہ از سامانِ مہر و قطرہ از دریا پر ست

اللہ اکبر! ایٹم تو اب معکوس ہوا حقیقت پہلے ہی بیدل بیان کر گیا

لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السمٰوٰت ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین ہ

آخر میں پھر ایک مرتبہ میں اظہار مسرت کرتا ہوں اور آپ کے نظرات کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے اہم معاملہ کی طرف توجہ دلائی -"

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک جدید علم الکلام کی کتنی شدید ضرورت ہے جس میں سائنس اور دوسرے علومِ جدیدہ کی روشنی میں قدیم علم الکلام کی طرح صرف اسلام کے مابعد الطبیعاتی مسائل سے بحث نہ ہو - بلکہ اُس کی عملی - اخلاقی اور معاشرتی و معاشی تعلیمات سے بھی بحث ہو فرمایا گیا تھا "کلموا الناس حسب عقولھم" اس پر گلوں نے اس طرح عمل کیا کہ فلسفہ قدیم کی زبان میں گفتگو کی - لیکن اب یہ زبان بدل گئی ہے اور اس کی جگہ سائنس اور علومِ جدیدہ نے لے لی ہے تو ضرورت ہے کہ اس نئی زبان میں گفتگو کا سلیقہ پیدا کیا جائے اور یہ وہی کرسکتا ہے جو علومِ اسلامیہ اور علومِ جدیدہ دونوں سے واقف ہو -

اسماعیل فرحی

از

جناب شیخ فرید برہان پوری

(لکچرار - رابرٹسن کالج - جبل پور)

"بزرگانِ دین اور اولیائے عظام کے ملفوظات کی جہاں دینی برکت اور مذہبی اہمیت مسلّم ہے - وہاں اُن کی تاریخی عظمت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ان ملفوظات سے صاحبانِ ملفوظ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے - خاص خاص اوقات میں ان روشن ضمیروں پر جو کیفیات طاری ہوئی ہیں - اُن کا ذکر و مطالعہ ہمارے لئے باعثِ خیر و برکت اور موعظت و روحانیت کا موجب ہوتا ہے - اِن کی زبان فیض ترجمان سے جو کلمات وقتاً فوقتاً صادر ہوئے ہیں - وہ ہماری زبان کے ارتقائی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں"[1]

ان بزرگوں کا طریق یہ تھا - کہ مسندِ درس پر یا غیر اوقات میں زبانِ خوارق بیان سے سیر و سلوک کے نکتہ ہائے عجیب اور اشاراتِ غریب - آیات اور احادیث کی تفسیر و تشریح - مختلف آیات کا شانِ نزول مقاماتِ عروج و نزولِ صوفیہ اور اُن کے اسرار و عقاید بیان کرتے تھے اور کسی بڑے عقیدت کیش کو اُن کی ترتیب و تبویب اور تہذیب و تدوین کی سعادت حاصل ہوجاتی تھی -

ایک سندھی الاصل ———— ایلچ پوری المولد ———— اور برہان پوری الوطن والمدفن ———— بزرگ ———— حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ ———— (مسیح الاولیاء)[2] کے ملفوظات اُن کے ایک مُرید ———— اسماعیل ابن محمود سندھی القادری الشطاری الفرحی نے ترتیب دئے ہیں - اور کشف الحقایق[3] نام رکھا ہے -

---

[1] ماخوذ از بزم صوفیہ [2] مسیح الاولیاء کے حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے ———— "شاہ عیسیٰ جند اللہ" معارف ستمبر ۵۶ء اور "فارسی ادب کے ارتقا میں برہان پور کا حصہ"، کل ہند تعلیمی کانفرنس ۵۳ء ناگپور -

[3] کشف الحقایق کا ایک ناقص الآخر نسخہ حضرت مولوی سید احکام اللہ صاحب (برہان پور) کے نادر ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ ہے حضرت موصوف نے ازراہِ لطف و کرم اصل نسخہ اور اس کی ایک خوش خط نقل عنایت کی ہے -

کشف الحقایق سے صاحب ملفوظ اور جامع ملفوظ ——— دونوں کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ضمناً صاحب ملفوظ ——— حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہؒ کے پیر و مرشد ——— حضرت شاہ لشکر محمد عارف اور ان کے دو بھائیوں ——— شیخ سلیمان سیفی اور شیخ محمد عثمان کا بھی ذکر آجاتا ہے[1]

سطور ذیل میں جامع ملفوظ کے مختصر حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ جو کشف الحقایق کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔

برار کے حاکم ——— تفادل خاں ——— کے انتقال کے بعد جب مسیح الاولیار کا خاندان برہان پور آکر سکونت پذیر ہوا تو شیخ محمود سندھی۔ فرحی کے والد بھی اُن کے قرب میں آکر بس گئے، فرحی برہان پور میں پیدا ہوئے۔

فرحی کی پیدائش کی صحیح تاریخ نہ معلوم ہو سکی۔ قیاساً گیارہویں صدی ہجری کے اول عشرہ کا پہلا حصہ ہوگا۔ کشف الحقایق میں فرحی نے لکھا ہے۔ کہ وہ مرید ہونے کے بعد بیس[2] سال تک روزانہ فجر اور عصر کی نماز کے بعد حضرت مسیح کی خدمت میں بلاناغہ حاضر ہوتا رہا۔

"ایں فقیر بست سال بعد از مرید شدن ہر روز گاہے قبلہ گاہی بعد نماز فجر و عصر مشرف در ملازمت می شد و لحیاناً ناغہ می گشت"[1]

اور فرحی کی حاضری کا یہ دستور ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء تک جاری رہا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جب ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء میں اسماعیل تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہوگا۔ اُسے حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کیا گیا ہوگا ———

اُس زمانہ میں آغاز تحصیل علوم کی عمر عموماً پانچ یا چھ سال کی ہوتی تھی۔ اکثر تسمیہ کے بعد تعلیم شروع کر دی جاتی تھی۔ اس حساب سے ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء یا ۱۰۰۶ھ / ۱۵۹۶ء فرحی کا سال پیدائش قرار دیا جا سکتا ہے۔

مستند مواد کی عدم موجودگی میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ——— فرحی جب

---

[1] کشف الحقایق ورق ۸۹ [2] تاریخ وفات حضرت شاہ عیسیٰ۔ کشف الحقایق ورق ۹۶ ب۔

حضرت مسیح الاولیار کے حلقۂ درس میں شامل ہوا تو حضرت نے کمال توجہ اور محبت سے اس کی تعلیم و تربیت کی۔ مختصر عرصہ میں اُس نے علوم ظاہری میں کمال حاصل کرلیا۔ حضرت نے اس کو فنِ شعر میں علم قافیہ۔ عروض اور دیگر نکاتِ شعری سے باخبر کردیا۔ فرحیؔ تخلص اور ابوالفرح لقب عطا کیا۔

اِس "لطفِ خاص" کے سلسلہ میں فرحیؔ نے کشف الحقائق میں لکھا ہے ـــــــ

"بریں ضعیف بسیار لطف وکرم نمودہ کتابِ رشحات از خانہ طلبیدہ درگوشۂ آں بہ خطِ مبارک خود کتبہ....

.... بنام باکنیت ولقب بایں عبارت نوشتہ عنایت فرمودند........

باسمہ سبحان الذی ھو الصلاۃ یبلی من استحقھا ھذا الکتاب الرشحات الالھیہ من المشائخ الربانیہ قد وھبت الولد العزیز ابی الفرح سراج الدین اسماعیل بن محمود صانہ اللہ شانہ وصلہ سبحانہ الی ما دائہ عن غیرتہ بحق النبی والہ وصحبہ ومن تبعہ الی یوم الدین:۔

مورخا ۲ ء شہر شوال ۱۰۲۵ھ [۱]

یہ واقعہ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء کا ہے۔ غالباً فرحیؔ کے عنفوانِ شباب کا زمانہ ہوگا۔

اس کنیت کی رعایت سے اس نے اپنا تخلص فرحیؔ رکھ لیا۔ فرحیؔ کی خوش نصیبی تھی۔ کہ اُسے حضرت موصوف سے مستفیض ہونے کے لئے بیس سال کی طولانی صحبت اور مدت نصیب ہوئی اِس "عمر عزیز" کا ایک لمحہ تلف کئے بغیر اس نے اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی تہذیب و تربیت میں کوتاہی نہیں کی۔ اور آخر کار علوم ظاہر و باطن کا فاضل اجل۔ صاحبِ دل صوفی اور شعر و ادب میں بلند پایہ ناظم ونثار بن گیا۔

اس قطرہ کو گہر بننے تک جو کچھ گذرا۔ اس کی تفصیلات کشف الحقائق میں مرقوم ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ "مدرسۂ کلاں" [۲] کی تعمیر کے دوران میں فرحیؔ نے چاہا۔ کہ درویشوں

---

[۱] ایضاً ورق ۱۱۶ ۲ شوال ۱۰۲۵ھ / ۳ اکتوبر ۱۶۱۶ء جمعرات [۲] حضرت مسیح الاولیار خانقاہ اور مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ جب طلبار کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو دوسرے مدرسہ کی تعمیر شروع کی گئی۔ اس مدرسہ کی تعمیر میں تمام طالب علموں نے حصہ لیا۔

کی اعانت کرے۔ حضرت مسیح نے جو اس وقت شیخ محمد صدیق (کابلی) عین المعانی[۱] کا درس دے رہے تھے۔ "ازرہِ لطف و کرم" ہاتھ کے اشارہ سے بلا کر کہا۔ کہ

"شما باین کار مشغول شوید یعنی بہ سماعِ سبق شیخ محمد صدیق"[۲]

عین المعانی کے درس کے دوران میں تمام نکاتِ حقیقت و معرفت نہایت توجہ سے فرحیؔ کو سمجھاتے رہے۔

ایک روز عین المعانی کا درس دے رہے تھے۔ جب مسئلہ تجدّدِ امثال کی بحث شروع کی تو فرحیؔ نے عرض کیا۔ کہ اس ضعیف پر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ حضرت موصوف نے کہا اس میں کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ اولیار کو بھی اس کیفیت کی اطلاع نہیں مگر فرحیؔ کے چہرے پر حزن و مایوسی کے آثار دیکھ کر ایک "نظرِ کیمیا اثر" میں اس کیفیت سے آگاہی بخشی[۳]۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ حضرت مسیح نے عالم متبحّر ملا عبد العزیز (لاہوری) کو اُن کے وطن بھیجنا چاہا۔ جب اُن کو بلا کر خاص طور سے نصیحت کی۔ تو اس وقت صرف فرحیؔ کو شریک صحبت رکھا۔ پیر و مرشد کے تعلقات اور مسئلہ وحدت کے علاوہ دیگر "اسرارِ غامض"[۴] بیان کر کے رخصت کیا۔

ہم یہاں صرف اِن دو تین واقعات پر اکتفا کرتے ہیں۔

فرحیؔ نے پہلی مرتبہ ذی الحجہ کے تیسرے ہفتہ میں ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء میں سفر کیا۔ اور دو سال تک شمالی ہند اور پنجاب وغیرہ کی سیر کی۔ اور لوٹ آیا۔ اور پھر جلد ہی عازمِ سفر ہوا اور سات سال تک اطرافِ ہند کی سیر کرتا رہا۔ اور کشمیر و کانگڑہ تک پہنچا۔ ہر جگہ کے باکمال صوفیار۔ علمار اور شعرار سے ملاقات کی سیر و سفر کے جستہ جستہ واقعات بھی لکھے ہیں۔ دورانِ سفر میں مخزنِ دعوت لکھی۔

کشف الحقایق میں مسطور ہے کہ

"وقتے کہ بعد از وصالِ حضرت پیر دستگیر یک سال دو ماہ بگذشت کہ ایں فقیر بحکم "قل سیروا فی

---

[۱] حضرت مسیح الاولیار کی ایک نادر روزگار تصنیف ــــــ اسمائے جلالی و جمالی کی لبسیط شرح ہے۔
[۲] کشف الحقایق ورق ۱۰۷ [۳] ایضاً ورق ۱۱۰ [۴] ایضاً ورق ۹۴ تا ۹۶ [۵] حضرت مسیح کا انتقال ۱۵ شوال ۱۰۳۱ھ کو ہوا اور ایک سال دو ماہ بعد یعنی ۱۵ ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ بمطابق منگل ۳۰ ستمبر ۱۶۲۳ء کے بعد یہ سفر شروع کیا۔

الارض فانظروکیف بدا لخلق" برائے دیدن مظاہرِ حق وملاقاتِ درویشاں بزادِ بوم کہ خود شہر برہان پور است۔ مرتبۂ اول دو سال دمرتبۂ ثانی ہفت سال در ہندوستان و پنجاب وکانگڑہ وکشمیر در زمانۂ جہانگیر بادشاہ شہر بہ شہر گرفتید و مشائخ آں شہر را بدید۔

دریں اثناء چوں عبور و مرورِ فقیر بہ شہر کشمیر واقع شد دریں جا حبیب را بسیار تحقیق نمود د آخرش نیافت و بعد از مراجعتِ کشمیر وقتے کہ در قصبۂ بجوارہ سیر نمودہ شد۔ آنجا محمد یوسف کشمیری خبر تحقیق یافت کہ حبیب در کشمیر بود و در قصبۂ آں بود و او بعد از آمدن از خدمتِ حضرت مسیح مرشد صاحبِ تصرف و خوارقِ عادات شد۔ خانقاہ بنا کرد و مردم بسیار ازو فیض گرفتہ اند و نامِ خود را بنامِ مرشدِ خود بدل کردہ بود و در آں وصال شد"[1]

ایک اور مقام پر پنجاب اور کشمیر کی صعوبت گذار مسافرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ مریدوں میں عین المعانی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا۔ کہ وہ حوالہ (Referencl) کی کتاب بن گئی تھی۔ مسیح الاولیاء کے "وصال" کے بعد فرحی تیس[۳۰] سال تک زندہ رہا۔ اُس نے ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء میں وفات پائی۔

حضرت مسیح کی صحبت میں فرحی نے علم شعر وادب میں کافی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اس کے ذہنی کارناموں میں سے صرف دو کا ہم کو علم ہے۔

(۱) کشف الحقایق

(۲) مخزنِ دعوت

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ نظم ونثر کے دوسرے جواہرات زمانہ کے بے رحم ہاتھوں برباد ہوگئے۔ کشف الحقایق میں جو نظمیں اور جستہ جستہ اشعار ہیں سطورِ ذیل میں ان کو پیش کیا جارہا ہے۔

کشف الحقائق کی ابتدا صوفیانہ عربی آمیز مسجع اور مرصع عبارت سے ہوتی ہے۔ حمد میں ذیل کا شعر ہے

یقیں می داں کہ ایں چندیں عجائب ز بہرِ یک دلِ بینا نہادند

---

[1] ایضاً ورق ۱۲۳

نعت میں بیس۲۰ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی کہی ہے۔

مثنوی

محمد کہ بدرِ منیر آمدہ — بہر دو جہاں بے نظیر آمدہ
چہ بدرے کہ از نورِ او آفتاب — بود ہر چہارم فلک نوریاب
نہ بل آفتاب و مہ ہر چہ ہست — ز نورِ لطیفش ہمہ نقش بست
بنازم بداں شاہِ دنیا و دیں — کہ دارد دو عالم بہ زیرِ نگیں
شریعت کہ فرمان (آں) شہ بود — بجا آرد آں کس کہ آگہ بود
طریقت کہ آئینِ آن سرور است — بود شمعِ راہِ دلِ حق پرست
حقیقت کہ آں عینِ احوالِ اوست — نگنجد درو ہیچ جز وصلِ دوست
ہمو کارسازِ دل و دینِ ماست — ہمو مونسِ جانِ غمگینِ ماست
سزد گر نداریم خوف از جحیم — چو او بر سرِ ماست مارا چہ بیم
بہر قریہ و شہر غوغائے اوست — کہ روحِ مجسم سراپائے اوست
تنِ او نبودے اگر روحِ پاک — فتادے ازو سایہ بر روئے خاک
چہ سایہ نماند از و جمع را — چو روشن کند نورِ او شمع را
چوں آں مہ ز نورِ خدائیست وبس — چساں بر تنِ او نشیند مگس
ملامت بہ بختِ خود آورد نیش — بمالد ہمی دستِ حسرت بخویش
شدہ خوں ازیں حسرت اورا جگر — ازاں می زند دست ہرجا بہ سر
چو او بہترینِ خلایق بود — جز او نامِ او را کہ لایق بود
دگر مرحبائیش زحرفِ فضول — کجا فکرتِ تو و نعتِ رسول
رسولے کہ مدحش بگوید خدا — کجا نعت گفتن توانی درا
تو و نعتِ او ایں چہ حرفے بود — کہ دریا نہ در خوردِ ظرفے بود

بیانِ نعت رسول میں اپنی درماندگی اور عجز کے اعتراف کے بعد اپنے پیر و مرشد کی منقبت میں ایک مثنوی کہی ہے۔ جو بائیس ابیات پر مشتمل ہے۔

مدحِ پیرِ دستگیر

زہے غوثِ اعظم کہ از فیضِ رحماں — زند جوشِ ہر دم بہ ایجادِ امکاں

ز بدرِ جبینش چنیں نورِ احمد — ز لطفِ کلامش عیاں سرِّ قرآں

ز بارانِ فیضش دلِ ہر مریدے — صدف وار پُر شد ز لولوئے عرفاں

بہ گل زارِ عالم دلِ اوست دائم — ز فیضِ حقیقی چو فوّارہ جوشاں

بہ طوفش چہ گویم کہ بحر بسیت مطلق — منزّہ ز وصفِ اضافاتِ امکاں

ظہورش چہ گویم کہ در ہر دو عالم — ہمون است ... کس ورایائے اعیان (؟)

ز کنہِ کمالش دلِ من چہ یابد — حبابے چہ گوید ز دریائے عمّان

زہے آفتابے حقیقے کہ دائم — بتابد بذراتِ کونین یکساں

شب و روز روئش چو گل بر شگفتہ — فدائیش بہ ہر سو چو بلبل ہزاراں

زہے رہنمائے کہ در راہِ وحدت — شدہ پیشوائے ہمہ پیشوایاں

حقایق پناہا! بہ صدرِ حقیقت — بجز تو نزیبد ز افرادِ انساں

ز نیمے نگاہے تو افسردہ زاہد — بجذبِ انا الحق زند جوشِ افغاں

مرید تو ہر یک بہ بزمِ مشائخ — چو در دیدہ بینش چو در قلب ایماں [1]

بہ سوزِ فراقِ تو جنّت جہنّم — بہوئے وصالِ تو گلخن گلستاں

کسے را کہ بارِ فراقِ تو خستہ — مساوی بود تلخ و شیرینِ دوراں

باسمِ مسیحاہ کردند زاں رو — کہ احیائے دل ہا بود بر تو آساں

بپائے تو از دیدہ نعلین سازم — شراکش بہ بندم ۔ ز نم دیدہ رنجاں

مگر گاہے از لطف پوشیدہ آئی — بہ صحنِ دلِ من خراماں خراماں

---

[1] تشبیہ کی ندرت ملاحظ کیجئے۔

بیابد دلے گو خیالے تو دارد | کہ چوں قلبِ مومن بود عرشِ رحماں
چہ داند ترا آنکہ محبوسِ ماند | تو بند سہ پنج و ایں چار ارکاں
کسے کو ازینہا بروں خرامد | تواند ترا دید اے جانِ جاناں
تو آنی کہ وقتِ تکلّم ز فرحی | کنی آشکارا چنیں سرِ پنہاں

یہ ایک خدا رسیدہ صوفی۔ عالم متبحر بزرگ کی مدح ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں عارفانہ اشارات۔ کمالِ محبت۔ ادب و سلیقہ سے نظم کئے گئے ہیں۔

کشف الحقایق کی تالیف کے سلسلہ میں اپنے معاملات خدا کے سپرد کرتے ہوئے نثری مناجات کے بعد شاعر یوں التجا کرتا ہے:۔

اے کہ زمامِ ہمہ در دستِ تو | اُشترِ ہر دل شیفتہ دل مستِ تو
ہست امیدم کہ توئی رہنما | تا دمِ آخر برہِ مصطفٰے
چارہ بکن۔ چارہ کہ آوارہ ام | وائے اگر تو نہ کنی چارہ ام
آمدہ ام از خودئ خود بہ جاں | بنیم نگہ کن زخودی و ارماں
ساز فتیلہ زرگ و ریشہ ام | شمع فروز از دلِ غم پیشہ ام
چاشنئ لذتِ دیدار بخش | بے من و ما قوتِ گفتار بخش
از ہمہ سو ساز دلم سوئے خویش | در رُخ ہر ذرہ نما روئے خویش
دلِ فرحی تو از نور کن | محو خود ساز و زخود دور کن

ان طویل منظوماتِ نعت و منقبت اور مناجات کے علاوہ فرحی کی اور کوئی طویل نظم زیرِ نظر مخطوط میں نہیں ہے۔

اُس مشہور زمین کے قصیدہ کے صرف دو شعر ملتے ہیں۔ جس میں خاقانی، نظامی، خسرو اور دیگر مشاہیر شعرا نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔

دلے کو را تو در جان ہمیشہ ذوقِ دین داری | نہ ناقص آید از چیزے چو کامل ہست ایمانش
چو آدم راز عصیاں ہر دو چشمش جوئبار آمد | شگفتہ انبیا و اولیا در صحنِ بستانش

فرحیؔ نے یہ اشعار اُس موقعہ پر نقل کئے ہیں۔ جہاں اُس نے یہ لکھا ہے۔ کہ خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ حضرتِ آدمؑ کے جنت سے نکلنے میں انبیاء۔ اولیاء اور مومنین کے ظہور و آفرینش کا رازِ پنہاں تھا۔

ذیل میں وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ جو جستہ جستہ مقامات پر شاعر نے موقع محل کی مناسبت سے چسپاں کر دئے ہیں۔ اور وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اُسی موقع کے لئے کہے گئے ہیں۔

نگارشِ ملفوظ کی اہمیت کے پیشِ نظر انکساری کے طور پر اپنی کوتاہ قلمی کے اعتراف میں لکھا ہے۔

خیالِ حوصلۂ بحر می بَرم ہیہات   چہاست در سرِ ایں قطرۂ محال اندیش

اب اس قطرۂ محال اندیش کی جسارت دیکھئے۔ کہ جب کام شروع کر دیا تو فرشتہ کو مخاطب کرکے احتیاط کی تاکید کرتا ہے۔

ملک! بہ عرصۂ معشوق پا منہ گستاخ   کہ زلفِ حور دراں جلوہ گاہ جاروب است

اِس احتیاط کے بعد تالیف کے سلسلہ میں تمام معاملات خدا کے سپرد کر دئے ہیں۔

وادیٔ سلوک و مجاہدہ کو "بادیۂ خون آشام اور بیابانِ پُر دد و دام" سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ رہنما کے بغیر اس وادی پُر خطر سے گذر کر منزلِ مقصود تک رسائی ناممکن ہے۔

ہادیٔ جو کہ دریں بادیۂ خوں آشام   رہ بہ منزل نہ بَرد ہیچ کسے بے رہبر

"سلوک و طریقت" کی منزل میں رہ روی کی تجربہ کاری دیکھئے۔ سالک کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ جب وہ رہبرِ کامل کی تلاش میں نکلے تو "مختصر ترین" زادِ سفر لے۔ اور وہ کیا ہو سکتا ہے؟

رُو بہ غربت دارم و داغِ تو بر دل می بَرم   بارِ ہجرانِ ترا منزل بہ منزل می برم

"تواضع اور رغبت" کے فرق کو سمجھاتے ہوئے "طمع" کے حروف کے اشارے سے ایک نادر مثال پیش کی ہے۔ اور "طمع را سہ حرف و ہر سہ تہی" کی عام راہ سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔

طمع شوم از نقط خالی   چوں درختے ست بے گل و بار

دوسری جگہ کیا عمدہ بات کہی ہے:-

نقطہ را نیرنگ. می آید کہ بگردِ طمع نمی گردد

بے ثباتیِ دنیا کتنا پامال مضمون ہے۔ اس موضوع پر ہمارے شاعروں نے مضامین کے انبار لگا دئے ہیں۔ فرحی کا اسلوبِ بیان دیکھئے ——— کہ تمثیل کی ندرت اور اندازِ بیان کی بے ساختگی نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی ہے ؎

ایں جہاں بر مثالِ آں کہ فتد بر بدن از حصیر نقش و نگار

بعد یک چند در نظر آید نہ ازو بیخ بود و نے آثار

دنیا کو جو "باغِ سیمیا" ہے۔ زمین پر چٹائی کے نشانات سے تشبیہ دی ہے۔

تصوّف کی دنیا میں کامل و ناقص کا فرق۔ جذبِ منصوری اور کلمۂ انا الحق عام ہیں۔ فرحی نے اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ جذبِ منصوری اس کو عطا ہوتا ہے جس کا دین کامل ہو ——

شود چوں اہلِ دیں کامل دہندش جذبِ منصوری

ولے در ہر دلِ ناقص ازاں انکار می روید

عارفوں کا قبلہ دیکھئے:-

فرحیا! ہر سو کہ بینی روئے او را سجدہ کن کیں عبادت را بہ یک سو در جہاں محرابے نیست

شعرِ بالا میں "شہود ما رأیت شیاء الا رایت اللہ فیہ" کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:-

احسان کرنے کے بعد اس کو جتلانا برا ہے۔ کیوں کہ اس سے انسان کو ایذا پہنچتی ہے۔

چوں مروت می کنی۔ با کس۔ بر و منت منہ زاں کہ کارِ نیکو آں حسبۃً للہ نیست

کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھنے والے کی شان میں لکھا ہے۔ کہ عارف کو چاہیئے کہ سیعت و دعوت کے دوران میں بے بصیرت نہ ہو "دعوت بصیرت" عام نہیں۔

داعی کو چاہیئے۔ کہ کثرت سے وحدت کی طرف دعوت دے۔ اور یہ مقام عارفِ منتہی کو حاصل ہوتا ہے۔

جلوۂ وحدت بہ کثرت ہر کہ بیند در جہاں | عارف باللہ گشت وعاشق جانگاہ نیست

دنیا کے ذرّے ذرّے سے خدا کا جلوہ ظاہر ہے۔ "خارجی تعینات" کی صورت میں "اسرار الٰہی" ہویدا ہیں:۔

چوں صفات ذات اور اہر یکے جلوہ نمود | پس چرا آگہ نباشی۔ زانچہ داری نقد خویش

"وحدت وجود" کی تشریح ملاحظہ کیجئے۔

ماسوا گر نہ تجلّی ظہور شش نگری | ایں وآں جلوہ کند پیش تو اصنامے چند

ایک اور جگہ لکھا ہے

آفتاب بہ بیں بہ چشم شہود | تا بدانی کہ آفتاب است ایں

"دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند" والی بات فرحی پر بھی گذری۔ ابتدائے احوال سلوک میں دل میں "خطرات بے ہودہ" کے ہجوم کی وجہ سے فرحی پر "قبض" کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رمضان میں ایک رات کے آخر حصّہ میں ——— (جب کہ حضرت مسیح الاولیاء اعتکاف میں تھے) ——— اُن کے حجرے میں داخل ہوکر "دل تنگی" کا ماجرا بیان کیا۔ "مرشدانہ کرم" کی ایک نظر نے اُس کے دل سے "قبض" کو دور کر دیا۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس رات کی تعریف فرحی نے ذیل کے شعر میں بیان کی ہے:۔

بود آں شب۔ شبے قدرے نزد من عزیز | زان کہ زردے فیض پیرم[1] ساخت اہل نسبتم

مندرجہ بالا منظومات اور اشعار کے علاوہ ہمیں فرحی کا اور کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

زیر نظر مخطوطہ ——— "کشف الحقایق" کے باب سوم کے درمیانی حصّے کے نو ورق غائب ہیں۔ آخری حصّہ بھی ناقص ہے۔ ممکن ہے اُن اوراق میں چند اشعار ہوں۔ فرحی کی دوسری تصنیف۔ مخزنِ دعوت میں اشعار ہوں گے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے کی "فہرستِ کتب فارسی" سے مخزنِ دعوت کے متعلق حسبِ ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

---

[1] فیض پیر کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے کشف الحقایق ورق ۱۱۹ ب

مخزنِ دعوت :-

مخزنِ دعوت شطاری اذکار پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔ فرحیؔ نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں طویل سفر کے بعد ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں یہ کتاب لکھی۔

یہ کتاب حضرت شاہ عیسےٰ مسیح الاولیا، کے نام معنون ہے کتاب میں غوث گوالیاری کا بھی ذکر ہے۔ یہ رسالہ "حصن الحصین" کشف الانوار، اسرار الدعوت۔ اورادِ صوفیہ پر مبنی ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے :-

۱۔ اذان و استنجاء و وضو و غسل۔

۲۔ استخارہ و فالِ مصحف۔

۳۔ دعوتِ اسماء عظام۔

۴۔ ضبطِ اعرابِ اسمار اصول و بعضے ادعیہ۔

۵۔ اذکار۔

۶۔ مراقبات۔

۷۔ بیعت کردن و کلاہ و خرقہ دادن و اوصافِ پیر و مرید تعریفِ خلوت و عزلت و فوائد و آدابِ آں۔

کشف الحقایق :-

"کشف الحقایق" حضرت شاہ عیسےٰ جند اللہ کا ملفوظ ہے۔ اس کتاب سے جامع ملفوظ ــــ فرحیؔ ــــ کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ضمناً حضرت موصوف کے مرشد ــــ حضرت شاہ لشکر محمد عارف ــــ ان کے دو بھائیوں شیخ محمد عثمان[۱] اور شیخ سلیمان سیفی ــــ درویشوں۔ مریدوں۔ عقیدت مندوں

---

[۱] حالات و تصانیف کے لئے ملاحظہ کیجئے راقم السطور کا مقالہ ــــ فارسی ادب کے ارتقا میں برہان پور کا حصہ (کل ہند تعلیمی کانفرنس ۵۶ء ناگپور)

[ــــــ (جن میں عوام اور خواص) ــــــ دونوں شامل ہیں] کا ذکر ہے۔

"کشف الحقایق" میں اُن معاملات۔ مکاشفات اور تصرفات کا بیان ہے جو صحت کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ یا جامع ملفوظ کی موجودگی میں واقع ہوئے ہیں۔ حضرت مسیح الاولیاؒ ــــــ صاحبِ ملفوظ ــــــ کے مرید ہونے سے قبل اور بعد کے روحانی کیفیات کا بیان ہے۔ ان کے خوارق عادات۔ طریقِ بیعت اور درس کا تفصیلی ذکر ہے۔ پیری مریدی کے آداب مرشد کا ادب۔ اس کی ضرورت۔ طلبِ صادق اور طالبِ صادق۔ عارف۔ عبادت۔ صوفی۔ فنا و بقا۔ باطن کی جلا وغیرہ رموزِ تصوف کی نہایت عمدگی سے وضاحت کی گئی ہے۔

صوفی۔ عبادت۔ مخلوقات۔ انسان۔ صراطِ مستقیم۔ توکل۔ فقر وغیرہ کی بالکل اچھوتے انداز میں تعریف کی گئی ہے۔

ہر بیان اور اس کے مفہوم کو آسان اور اثر خیز تمثیلات سے واضح کیا گیا ہے۔

مسجد و مدرسہ میں طریقِ درس کی تفصیلات کے علاوہ خانقاہ اور اُس کے طریقِ زندگی کی جھلکیاں بھی اس میں نظر آتی ہیں۔ وہ بے فکر فقراء کا مرکز نہ تھی۔ جن پر ذیل کا شعر صادق آتا ہے ؎

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں ‏ ‏ ‏ ‏ کنجے گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت

بلکہ وہ ایک تعلیمی اور کلچرل ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جہاں کا ہر فرد دینی اور دنیوی زندگی کے ہر نیک پہلو پر عمل پیرا تھا۔

زیر نظر ناقص الآخر مخطوطہ کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔

"سپاس بلا غایت و ستائش بلا نہایت سزائے ذاتے کہ بحکم مشیتش مشاطۂ فیض را مطلق مخدراۃ شیون ذاتے را کہ بخلوتِ خانۂ غیب ہویت را در شبستان سرائے فیضِ اقدس در آوردہ و شکل و شمائل نازنین ایشاں را بوجہ اجمال و تفصیل مشاہدہ نمودہ"

اس کے بعد حمد۔ حمد کے بعد بیس۲ اشعار پر مشتمل ایک نعتیہ مثنوی اور اس کے بعد پیر و مرشد کی منقبت میں ایک مثنوی کہی ہے۔

منقبتِ پیر کے بعد سببِ تالیف یوں بیان کیا ہے۔

"اسماعیل ابن محمود سندھی القادری الشطاری الغرحی کہ از حضرت دستگیر مسکینے باب الفرح ملقب بہ سراج ست می گوید کہ چوں ایشاں در اکثر اوقات بر مسند درس وغیر آں از زبان خوارق بیان نکتہ ہائے عجیب و اشارات غریب در اطوارِ سیر و سلوک و مقاماتِ عروج و نزولِ صوفیہ قدس اللہ تعالےٰ سرہم عنایت می فرمودند و در اغلب بہ غلبۂ اتصاف و معیتِ حق سبحانہٗ و تعالےٰ تصرفاتِ حقیقی و مکاشفاتِ تحقیقی از وجودِ شریف حضرت ارشاد پناہی بوقوع آمدند۔ بنا بریں خاطرِ فاترِ ایں ضعیف خطور می کرد۔ کہ کاشکے از مریدانِ فاضل و خلفائے مکمل ایں جواہرِ پُر صفا و دُرِ بے بہا بدستِ شوقِ ارادت فراہم آوردہ۔ برشتۂ قلم در کشد تا طالبِ علمانِ عقل و دانش و آرائے اربابِ حقیقت گردد۔ چوں مدتِ مدید و عہد بعید بریں آمد و ہیچ یکے از توفیق رفیق نشدہ۔ متصدی ایں کار گشتہ بانصرام رسانید و امورِ یکہ از حضرت بہ وقوع می آمدند چوں مرقوم و مسطور نمی گشتند۔ اکثر از یاد می رفتند۔ چنانچہ گفتہ اند ؎

سخن را بہ نوکِ قلم بند کن ۔۔۔ کہ از یادِ مردم گریزد سخن

لاجرم در دلِ ایں فقیر گذشت کہ ہر چند مرا لیاقتِ آں نیست چنانچہ باید و شاید۔ ایں را تو انم بجا آورد۔ اما بارے بہر نوع کہ میسر آید۔ غنیمت باید شمرد۔ پس با وجودِ قلتِ بضاعت و ضعفِ استطاعت در سنہ ہزار و بستم متصدی ایں کار گشتہ۔ نام ایں ملفوظ را "کشف الحقایق" نہادم"۔

اقتباسِ بالا سے ظاہر ہے۔ کہ جامع ملفوظ کے ذہن میں ایک عرصہ سے یہ خیال تھا۔ کہ کوئی مرید حضرت مسیح الاولیاء کے "تصرفاتِ حقیقی اور مکاشفاتِ تحقیقی کو طالبانِ عقل و دانش" کی ہدایت کے لئے ضبطِ تحریر میں لائے۔ مدتِ مدید تک یہ خواہش عمل کی صورت اختیار نہ کر سکی اور ضعیف الاستطاعت فرحی نے ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں اس کام کو شروع کیا۔

اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اِن ملفوظات کی ترتیب اور تحفظ میں ارادت اور عقیدت کے نیک اور سعادت مند ہاتھوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ملفوظات کے جامع حضرات نے اپنے مرشد کے اقوال و گفتار کو جس طرح دیکھا اور سُنا اُسی طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اِس احتیاط

سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اشعار اور فقرات محفوظ ہو گئے۔ جو گاہے گاہے ان بزرگوں کی زبانِ فیض ترجمان سے ادا ہوتے تھے اور آج ہماری زبان کے ارتقائی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اُن سے صاحبانِ ملفوظ کی زندگی کے جزئیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ملفوظ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ بابِ اول۔

"دربیانِ زاد بوم آبائی معظم واجدادِ مکرم حضرت قبلہ گاہی وانتقالِ ایشاں از وطنِ خود زمولد و مبعث وتحصیلِ علم پیر دستگیر"

۲۔ باب دوم۔

"در طلبِ حق وجستجو نمودن حضرت ایشاں مر پیر اکسیر پُر تاثیر را و دریافتن وے"

۳۔ باب سوم۔

"در اشارات ونکات کہ بلسانِ معجز بیان حضرت شیخ منقبت بہ صدور پیوستہ"

۴۔ باب چہارم۔

"در معاملات ومکاشفات وتصرفاتِ حضرت ارشاد پناہی"

۵۔ باب پنجم۔

"در بیانِ ایں کہ حضرت سبحانہ وتعالےٰ بر سرِ ہر صد سالے کہ یکے از کملائے اولیا مجددِ دین می گرداند"

جامعِ ملفوظ نے حضرت پیر و مرشد سے اعانت طلب کرنے کے بعد نگارشِ ملفوظ کی اہمیت اور بطور انکساری اپنی کوتاہ قلمی کے اعتراف کو یوں بیان کیا ہے:۔

"بو العجب کاریست کہ کجا حوصلۂ ایں فقیر سرگشتہ وآوارہ وکجا نوادرِ معلوماتِ ہادیٔ ہر بے چارہ۔

خیالِ حوصلۂ بحر می پُزم ہیہات | چہاست در سرِ ایں قطرۂ محال اندیش

اور جب کام شروع کر دیا۔ تو ناظرین سے اغلاط کی چشم پوشی کی استدعا کی ہے اور دیباچہ مناجات پر ختم ہو جاتا ہے۔

تالیف کے سلسلہ میں فرشتہ کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

ملک بہ عرصۂ معشوق پامنہ گستاخ
کہ زلفِ حور دراں جلوہ گاہ جاروب است

اس کے بعد مرتب نے کمال احترام و ادب سے "عرصۂ معشوق" کو سر کے بل طے کیا ہے۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ کسی آئندہ فرصت میں پیش کی جائیں گی۔

زیر نظر مخطوطہ ذیل کے واقعہ پر ختم ہوتا ہے۔

"اے عزیز! روزے حضرت بابا عبدالستار بہ حضرت پیر دستگیر عرض نمودند کہ امروز در بیداری حضرت اسد اللہ الغالب و مطلوبِ کل طالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ در حجرۂ من تشریف فرمودہ ۔۔۔۔"

(۲۱۱ ۔ ۲۱۲ ب)

شعرِ عربی کی مختصر تاریخ

دورِ اسلامی

از

جناب پروفیسر سید رغیب حسین ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی

(صدر شعبۂ فارسی۔ بریلی کالج۔ بریلی)

شہر مکہ میں عام الفیل میں ۹ ربیع اول (مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء) روز دوشنبہ کو حق تعالےٰ کی رحمت مجسم ہو کر خواجہ عبدالمطلب کے محبوب ترین فرزند حضرت عبداللہ کے گھر حضرت سیدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہوئی، وہ رحمت اگرچہ ساری دنیا کی دائمی اصلاح کے لئے آئی تھی لیکن اصالۃً اور مقصوداً اہلِ عرب کی اصلاح کے لئے اور پھر ان کے واسطے سے ساری دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجی گئی تھی۔

ہم چونکہ شعر العرب کی کتاب لکھ رہے ہیں اور اس میں بھی اختصار ملحوظ ہے اس لئے ہم سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہاں صرف اتنا جزو بضرورت بیان کریں گے جس کا اثر عربی شعر و ادب پر پڑا۔

اسلام نے عربوں سے ان کے بڑے محبوب مشاغل مثل شراب خواری۔ قمار بازی۔ اور اُن کے دیرینہ عقائد مثل بت پرستی۔ کاہنوں کی تعظیم۔ کواکب کے سعد و نحس ہونے کا اعتقاد۔ نیز ان کے جاہلانہ رسوم، مثل لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا۔ مُردوں پر نوحہ و ماتم اور ان کے فواحش مثل سوتیلی ماؤں سے نکاح کرنا۔ اور ان کے وحشیانہ اطوار مثل لوٹ مار۔ حرام جانوروں کو کھا جانا وغیرہ وغیرہ۔ بے شمار بُری عادتیں یکسر چھڑا دیں۔ باہم خانہ جنگیاں۔ برسہا برس تک کینہ کی پرورش وغیرہ بداخلاقیوں سے ان کو نفرت دلا دی اس کے مقابل عمدہ اخلاق۔ دوسرے کے مال کا

احترام بلکہ حفاظت۔ اخلاص وللہیت۔ صبر و قناعت۔ ایثار و تواضع وغیرہ ان کے اندر پیدا کردئے۔ ان تمام تعلیمات کی اصل و بنیاد قرآنِ پاک تھا۔ قرآن جو خدائے ذوالجلال کا پُر جلال کلام تھا اس کے نظم و عبارت میں عربوں کے ذوقِ شعری کو وہ تمام چیزیں مل گئیں اور معجزانہ طور پر یک جا مل گئیں جس کے وہ لوگ شیدائی تھے۔ کلمات کی فصاحت و لطافت۔ معانی کی جزالت و جلالت شعر کی رنگینی اور سحر کی سنگینی۔ نغمہ و شراب کی مستی اور ملکوتی حق پرستی غرض یہ سب ان کو اچانک جو ملا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئے ان کے زباں دانی کے دعوے سرد پڑ گئے ان کی فصاحت اور گویائی کا سرِ پُر غرور اس کے سامنے جھک گیا گویا ان کے ذوقِ شعر و ادب نے قرآن کے پردہ میں شعر و ادب کے خداوند کا نظارہ کیا تو اس کی تجلّی کے آگے سجدہ ریز ہو گیا ؎

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا (حضرت صفی مرحوم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کوئی شعر قصد کر کے نہیں فرمایا۔ بلکہ بعض کلمات اگر بلا قصد محض آپ کے غایت لطافت شعور کے باعث اتفاقاً کسی وزن میں موزوں ہوتا نظر بھی آیا تو آپ نے اُسے ادا اس انداز سے کیا گویا وہ نثر کا ایک جملہ ہے آپ اسلام کی تعلیم لے کر تشریف لائے تھے جو یکسر دعوتِ سعی و عمل ہے اس لئے آپ نے لغو اور لایعنی امور سے جن میں شعر بھی داخل ہے قوم کو روکا کہ اس سے قوائے عمل زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ پھر چوں کہ شعر کا مایۂ خمیر جھوٹ ہے اور اسلام میں جھوٹ کی گنجائش نہیں اس لئے وہ شعر جس کے عرب دل دادہ تھے اسلام کے ساتھ میل ہی نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ آپ نے شعر کے متعلق یہ زرّیں ارشاد فرمایا کہ "الشعر کلام فحسنہٗ حسنٌ و قبیحہٗ قبیحٌ" یعنی شعر بھی ایک قسم کا کلام ہے۔ اگر کلام اس میں اچھا کہا گیا ہے تو شعر بھی اچھا ہے اور اگر کلام خراب ہے، تو شعر بھی خراب ہے۔ اسی نظریے کے مطابق آپ نے اچھے اشعار سنے۔ ان کو پسند فرمایا ان کے کہنے کی اور سنانے کی فرمائش کی۔ مسجد میں منبر رکھوا کر اس پر اچھے اشعار پڑھواتے اور سنتے اور سنواتے۔ بعض میں اصلاح دی۔ کبھی شعر سن کر انعام عطا فرمایا۔ ان حالات میں اسلام قبول کرنے والوں نے یا تو شعر کہنا ہی بند کر دیا یا بہت کم کر دیا اور اگر جاری رکھا تو اس کا رخ اور دھارا بدل دیا۔ جاہلیت کا شعر

اکثر و بیشتر طبیعت کی اپج اور فطری جولانی دکھانے کی ایک چیز تھی وہ اسے کسب کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ جاہل شعرا میں پہلے صرف ایک زُہیر نے البتہ شعر کی بدولت بہت کچھ انعامات وہدایا پائے مگر انصاف یہ ہے کہ اس نے انعام پانے کے قصد سے اشعار و قصائد نہیں کہے تھے مگر اس کے بعد نابغہ ذبیانی۔ اعشیٰ متنخل وغیرہ نے تو شعر کو مستقلاً ذریعۂ معاش بنالیا۔ آزاد فطرت اور قناعت پسند بدویوں نے اس بدعت کو اپنی جبینِ بے نیازی پر ایک داغ سمجھا اور اسے بہت بُری نگاہ سے دیکھا۔ نتیجہ بھی یہ ہوا کہ شعر عربی اپنی قدرتی بلندیوں سے صنعتی پستیوں کی جانب اور بے باک حق گوئی سے اپنے ہی جیسے انسانوں کی خوشامد اور جا بے جا مداحی کے گڑھے میں جا پڑی۔ ٹھیک اسی موقع پر اسلام نے بر وقت آکر ان کے افکار ان کے اطوار۔ ان کے عقائد ان کے ذاتی منافع وفوائد۔ ان کے اعمال اور ان کے احوال واقوال کی یک لخت کایا ہی پلٹ دی اور اپنے برکاتِ عمومی سے شعر و ادب کو بھی مالا مال کر دیا۔ اسلام کے بعد شعر کا عام مصرف حسب ذیل امور ہو گئے:۔

نیکیوں کی ترغیب۔ کار آمد مخلصانہ نصیحت۔ حضورؐ کی نعت ومدح اور آپ کے صحابہؓ کی تعریف۔ کفار کے مطاعن اور ہجو گوئی کا جواب۔ اسلام کے محاسن کی اشاعت۔ جہاد کی ترغیب۔ اسلامی جنگوں کے تذکرے۔ شہادت کا شوق۔ شہدا رحق کا مرثیہ اور ان کے درجات کا ذکر۔ مکارمِ اخلاق کا بیان۔ اسلام پر فخر۔ کفر سے نجات پر مسرت۔ بے جا فخر نسب کی خرابی وغیرہ۔

شخصی مدائح میں اگرچہ محبت کی نگاہ مبالغہ کرنا چاہتی ہے مگر اس میں ایک تو ابتدا ر اسلام میں خلفار راشدین اور ان کے کچھ بعد تک لوگوں نے اپنی مدح پسند ہی نہیں کی۔ دوسرے شعرا بھی اسلام کی تعلیم کے باعث صرف واقعی صفات کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اسلام کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور شخصی مدائح آخر مبالغہ۔ بیجا خوشامد۔ افراطِ محبت کے باعث کذبِ محض بن کر رہیں۔ اسی طرح ہجو گوئی ابتدا میں تو کفار کے لئے بضرورت شروع کی گئی لیکن رفتہ رفتہ اس میں بھی کذب ومبالغہ نے راہ پالی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد مسلمانوں نے مسلمانوں ہی کی ہجو کہنی شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسم بد سب سے پہلے عہدِ فاروقؓ میں حُطیئۂ عبسی نام ایک مجہول النسب اور ضعیف الاسلام شخص نے مسلمانوں میں پھیلائی۔ ورنہ مسلمانوں

نے تو ہجو گوئی کفار کے مطاعن کا جواب دینے کے لئے حضورؐ کے اس ارشاد پر شروع کی تھی کہ

"اے جوانانِ انصار! جن لوگوں نے ہتھیاروں سے اسلام کی مدد کی وہ زبان سے بھی اس کی مدد کیوں نہیں کرتے"

یہ سن کر مسلمانوں میں سے حضرت حسان بن ثابت۔ کعب۔ عبداللہ بن رواحہ نے دین کی اس خدمت اور اسلام کی اس مدافعت کا بیڑا اٹھایا

چوں کہ ہر دور کا ادب اس عہد کے تمام عوامل و مؤثرات کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے ہم ذیل میں ذرا تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں کہ دورِ اسلامی کا شعرِ عربی اپنے دور کے عوامل و مؤثرات سے کس حد تک متاثر ہوا یعنی بہ الفاظِ دیگر دورِ اسلامی کا عربی شعر، دورِ جاہلی کے شعر سے کن کن باتوں میں ممتاز ہے اور دونوں ادوار کے فروق اور ممیزات کیا ہیں:۔

۱۔ دورِ نبوی میں بلکہ کسی حد تک خلفاء راشدین کے دور میں شعر اپنے بنیادی ڈھانچے میں جاہلی دور ہی کی تمام خصوصیات کا حامل رہا۔ وہی سادگی، وہی جوش، وہی فطری جذبات، وہی مناظر کی عکاسی، وہی بیباکی اور آزاد منشی جو دورِ جاہلی کے اشعار میں تھی اب بھی باقی رہی۔ اگر فرق تھا تو صرف یہ کہ شعر پھر بادیہ نشینوں میں جا پہنچا کیوں کہ متمدن شہروں کے لوگ اسلام کی برکات سے اب شعر کی محض خیال آرائیوں سے کنارہ کش ہو کر حفظِ قرآن۔ روایتِ حدیث۔ جہاد بالشرک۔ مقابلۂ کفار۔ ریاضت و شب بیداری ذکر اللہ جیسے فضائل میں لگ گئے۔ چنانچہ حضرت حسانؓ کی بعد اسلام والی شاعری میں بھی وہ زور نہ رہ گیا جو قبل اسلام کے اشعار میں تھا۔ کیوں کہ اب شعر کی طرف ان کی توجہ محض ثانوی درجہ کی رہ گئی تھی

۲۔ اسلام کے آجانے پر ان کی شاعری کے موضوعات بجائے تخریبی ہونے کے تعمیری ہونے لگے اور ظاہر ہے کہ تعمیر میں تخریب کا سا زور و جوش۔ ہیجان و طوفان نہیں بلکہ متانت و سکون ہوا کرتا ہے۔

۳۔ اسلام کے پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحیفۂ اعظم کی بدولت عربی شعر و ادب کو بہت سے جدید اندازِ فکر۔ جدید الفاظ و معانی۔ جدید اسالیبِ بیان حاصل ہو گئے۔ فنائے نفس۔ رضائے حق۔ اخروی ثواب و عذاب۔ جنت و جہنم۔ صلوٰۃ و صیام۔ ذکر و فکر۔ انبیاء و رسل۔ ذات و صفاتِ حق۔ قرآن و حدیث۔ کتاب و سنت۔ مومن و کافر۔ فاسق و منافق۔ رکوع و سجود۔ تہلیل و تکبیر

خلیفہ و امیر المومنین ۔ بیت المال و اوقات ۔ زکوٰۃ و عُشر وغیرہ کے شرعی مفاہیم و اصطلاحات عام طور سے نظم و نثر ۔ تقریر و تحریر ۔ قول و عمل میں آنے اور رہنے لگے ۔ اسلام سے قبل امیۃ ابن الصلت جیسے شعرا جو آخرت کا ذکر کرتے تھے محض خال خال تھے مگر اسلام کے آنے پر تو یہ تخیل یہ الفاظ اوڑھنا بچھونا ہو گئے ۔ اندازِ بیان میں عِم صباحًا اور عِم ظلامًا (صبح و شام کے جاہلی سلام) کی بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ) ۔ وعدہ کے موقع پر انشاء اللہ خوشی کے موقع پر ماشاء اللہ و سبحان اللہ احسان مندی کے موقع پر جزاک اللہ ۔ مرباعُ (چوتھ ۔ ٹیکس) کی جگہ پر خُمس ۔ عُشر ۔ زکات ۔ نشیطہ اور فضول (فاضل اور خاص مالِ غنیمت) کے لئے صفیہ کے الفاظ اسلام کے خزانے سے ملے ۔ اخلاق اور معاملات کے بدل جانے سے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی ۔ خود غرضی خیانت وغیرہ کی جگہ ایثار ۔ خدمتِ خلق ۔ قناعت و امانت نے ان کے اندازِ فکر ہی کو بدل دیا ۔

۴ ۔ اسلامی دور سے قبل ہر قبیلہ اپنے یہاں کے لب و لہجہ ۔ کلمات کے مخصوص تلفظات اور صوتی تصرفات کو دانتوں سے مضبوط پکڑے بیٹھا تھا اور کسی قیمت پر ان کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ وہ باوجود اس کے کہ حج یا دیگر قومی و ملکی میلوں (عکاظ ۔ ذو المجنہ وغیرہ) میں قریش تمیم ۔ سعد و دیگر قبائل سے ملتے رہتے تھے مگر اپنے تلفظی خصوصیات میں کسی قسم کی اصلاح یا دوسرے قبیلہ کے لب و لہجہ سے کوئی قلم یا پیوند لگانا نہیں پسند کرتے تھے گویا وہ اپنے تلفظ وغیرہ کو قصداً سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے اور اس لحاظ سے ملک عرب میں بہت سے عربی لہجے قبائل کے تلفظی تعصب کی وجہ سے پائے جاتے تھے ہم اس کا بیان ذرا تفصیل و وضاحت سے لکھنا چاہتے ہیں :-

اسلام سے قبل ملک عرب اپنے صوتی لہجوں اور صرفی و نحوی قاعدوں کے جزوی اختلافات و فرق کے باعث کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا (گویا لسانی صوبے اس میں کئی تھے)

(الف) اہلِ حمیر کا لہجہ طمطمانیہ تھا ۔ وہ لوگ لام تعریف (اَل) کو م سے بدل کر بولا کرتے مثلاً طاب الہواءُ اگر انھیں کہنا ہوتا تو وہ طاب امْہواءُ (ہوا اچھی ہے) کہتے ۔ حضورؐ نے ایک حدیث بھی (شاید ان کی دل جوئی یا بقیہ صحابہ کی تفریح کے لئے) انھیں کی بولی میں فرمائی جو مشہور ہے " لیس

من امبر امصیام فی امسفر" (لیس من البر الصیام فی السفر) یعنی سفر میں (بوڑھے کا) روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں۔

(ب) بنو ہذیل کا لہجہ فحفحہ کہلاتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ وہ لوگ حا حُطّی کی جگہ عین کہتے حُسَین کو عُسَین کہتے۔

(ج) بنو قضاعہ کا لہجہ عجعجہ تھا۔ وہ لوگ اسم منقوص (راعی۔ قاضی وغیرہ) اور اسم منسوب (تُریٌّ وغیرہ) میں ی کو ج سے بدل کر بولتے چنانچہ معی کو معج۔ راعی قاضی کو راعج۔ قاضج۔ تری کو ترج کہتے۔

(د) اہل یمن کا لہجہ عمغمہ یا شنشنہ تھا وہ لوگ حرف س کو ت سے بدل دیتے اور الناس کو النات کہتے

(ہ) بنو بہراء کا لہجہ تلتلہ کہلاتا تھا ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مضارع کی علامات (ی۔ ت۔ ا۔ ن) کو زیر سے ادا کرتے اور تعلمون۔ تِعلمون کہتے۔

(و) بنو تمیم کا لہجہ عنعنہ تھا وہ لفظ کے شروع والے ہمزہ کو ع سے بدل کر بولتے اَمن کو عَمنٌ۔ امانٌ کو عمانٌ۔ اَبٌ کو عَبٌ۔ اُمٌّ کو عُمٌّ۔

(ز) بنو اسد اور بنو ربیعہ کا لہجہ کشکشہ کہا جاتا کیوں کہ وہ لوگ ک کی جگہ ہمیشہ ش کو تلفظ کرتے لبّیک اور کلمۃٌ کو لبّیش اور شلمۃٌ کہتے۔

(ح) بنو کلب کا لہجہ وہم کہلاتا ان کی تلفظی خصوصیت یہ تھی کہ جمع مذکر غائب کی ضمیر (ھُم) کو ہمیشہ ہم کاف کے زیر سے کہتے۔ منہِم بینہِم

(ط) بنو ربیعہ کے لہجہ کو وکم کہتے وہ لوگ جمع مذکر حاضر کی ضمیر (کُم) کو ہمیشہ کاف کے زیر کے ساتھ کِم کہتے علیکِم۔ بکِم۔

(ی) بنو شجر وعمان کے لہجہ کا نام لخلخانیہ تھا وہ لوگ ما موصولہ کو ہمیشہ الف گرا کر بولتے ماشاء اللہ کو مشاء اللہ اور ماجری کو مجری کہتے۔

(ک) بنو طے کا لہجہ قطعہ یہ تھا کہ وہ ہر لفظ کا آخری حرف کھا جاتے اور گرا دیتے ابو الحکم کہنا ہوتا تو صرف ابو الحک کہتے۔

(ل) بنو سعد و انصار کا لہجہ استنطار کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ وہ عین ساکن کو نون سے بدل کر بولتے اعطی معطی کو انطی اور منطی کہتے۔

(م) بنو مازن کے لہجہ میں ہر ب میم سے بدل جاتی بُکر کو وہ لوگ مُکر کہتے۔

(ن) بنو تمیم کی بولی میں لیس کی خبر بھی مرفوع ہی رہتی لیس طیبٌ الّا مسکٌ خوشبو تو بس ایک مُشک ہے۔ نیز وہ مضاعف مجزوم میں بھی ادغام کرتے مثلاً غضّ۔

(س) بنو مالک کے یہاں یا اَیُّھا النّاس کو یا اَیُّہُ النّاس بولا جاتا

(ع) بنو طے کے یہاں شاید سَمِعَ اور عَلِمَ کا باب ہی نہ تھا وہ رَضِیَ کو رضیٰ کہتے۔

(ف) بنو خثعم اور بنو زبید کی بولی میں لام تعریف سے قبل اگر ن آتا تو گر جاتا جیسے مِنَ البیتِ اور بنی العنبر کو مِلبیتِ اور بلعنبر غرض لہجات اور تصرفات کی اتنی رنگارنگی کو قرآن پاک نے لغت قریش میں نازل ہو کر یک لخت ہباءً منثوراً کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ قریشی تھے اس لئے قریش کی زبان سرکاری اور دفتری زبان بن کر سب پر غالب آگئی اور اس کے دبدبہ کے سامنے تمام لہجات کا طنطنہ دب کر رہ گیا۔ لہٰذا شعر عربی میں اسلام کے بعد صرف لغت قریش جاری و ساری ہو گئی۔

۵۔ اسلام سے پہلے عرب لوگ عرب سے باہر تجارت کے لئے جاتے ضرور تھے مگر رحلۃ الشتاء والصیف سے زیادہ غالباً نہیں جاتے تھے۔ سیر فی الارض کا اتفاق عرب سے باہر ان کو کم پڑتا تھا اس لئے عربی زبان عرب کے باہر مطلق نہ پھیلی تھی کیوں کہ اس وقت عربی زبان کو کوئی اقتدارِ اعلیٰ دوسرے ملکوں کے لئے حاصل نہ تھا۔ اسلام کے بعد چوں کہ عربی زبان کی پشت پر پیغام الٰہی اور ارشادِ حضرت رسالت پناہی کا اقتدارِ اعلیٰ کار فرما تھا اس لئے عرب کی قریشی زبان اپنی فطری فصاحت کے ساتھ ملک سے باہر اقتدار و اعتبار۔ رعب اور وزن بھی لے کر پہنچی اور اب دنیا کو اس کی عزت کرنی پڑی۔

۶۔ قرآن میں کلمات کی بندش و تراکیب۔ قرآن و حدیث کے اسالیب بیان عربوں کو ملے۔

دورِ اسلامی کی شاعری کے سلسلہ میں ان ممیزات اور فروق کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ممیزات شعر عربی کے ظواہر (لغت و ادب وغیرہ) سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ دورِ اسلامی کی

شاعری میں اور دورِ جاہلی کی شاعری میں کوئی اساسی فرق اور بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا اس لئے کہ اہلِ عرب اب تک اپنی قدیم روایاتی سادگی۔ بے باکی۔ آزادی وغیرہ اوصاف کے بدستور حامل تھے اپنے تمدن اور کلچر کے عاشق تھے غیر قوموں سے نہ تو زیادہ اختلاط کا موقع آنے پایا تھا اور نہ انھوں نے اپنا تمدن چھوڑنا پسند کیا۔

ان تمہیدی گزارشوں کے بعد اب ہم دورِ اسلامی کے شعراء عرب کا تذکرہ کرتے ہیں اگرچہ دورِ اسلامی میں دو قسم کے شعراء کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے ایک وہ جن کو مُخضرم کہا جاتا ہے یعنی جنہوں نے جاہلیت کا بھی زمانہ پایا اور اس میں شعر کہے اور اسلام کی دولت بھی پائی اور بحالتِ اسلام بھی شعر کہے۔ دوسرے وہ جنہوں نے اسلام کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ موخرالذکر شعراء کو اُموی دور کے شعرا میں شمار کیا جائے۔

پس ہم ذیل میں صرف مخضرم شعراء کا ذکر کریں گے:۔

۱۔ (الف) حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ (وفات ۱۳ھ / ۶۳۴ء) آپ کے حالات مشہور ہیں۔ آپ کی شاعری کے سلسلہ میں ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں آپ کا ایک طویل قصیدہ نقل کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

أَمِنْ طَيْفِ لَيْلَى بِالْبِطَاحِ الدَّمَائِثِ أَرِقْتُ وَأَمْرٍ فِي الْعَشِيرَةِ حَادِثِ

اگرچہ اکثر علماء ادب کہتے ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت صدیق رضؓ ہی کا ہے مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کی طرف محض منسوب ہے حقیقتہً ان کا نہیں۔ بہرحال اس امر پر سب علماء ادب متفق اللفظ ہیں کہ آپ نے اسلام لانے کے بعد کوئی شعر نہیں کہا۔

(ب) حضرت سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ عنہ (شہادت ۲۳ھ / ۶۴۴ء) آپ کے حالات بھی مشہور ہیں۔ کتاب "حسن الصحابہ" میں آپ کے چند ایسے اشعار لکھے ہیں جو آپ نے اسلام لانے کے بعد کہے ہیں۔

الم تر ان الله اظهر دينه على كل دينٍ قبل ذالك حائد

فامسى رسول الله قد عز نصره وامسى عداه من قتيل و شارد

(ج) حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ (شہادت ۲۰ رمضان ۴۰ھ / ۶۵۹ء) آپ کے حالات بھی

مشہور ہیں۔ آپ کے نام سے خطبات بھی نہج البلاغۃ میں جمع کئے گئے ہیں اور اسی طرح آپ کے نام سے اشعار بھی ایک کتاب میں جمع کئے گئے جو "دیوانِ علی" کے نام سے مشہور ہے مگر جس طرح نہج البلاغۃ کے تمام خطبات آپ کے نہیں ہیں بلکہ اکثر ان میں الحاقی ہیں اسی طرح آپ کی طرف منسوب شدہ اشعار بھی سب آپ کے نہیں ہیں ان میں بہت سے الحاقی ہیں علامہ زمخشری اور مازنی کا خیال ہے کہ حضرت سیدنا علیؓ کے صرف دو شعر ان کے اپنے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

تِلکم قُرَیشٌ تمنّانی لِتَقتُلَنی   فلا وربک ما برّوا ولا ظفروا

فان ھَلکتُ فَرھنٌ ذِمّتی لَھُم   بذاتِ ودقین لا تعفولھا اثر

ان کے علاوہ بعض علما نے دیوان کے ان اشعار کو بھی آپ ہی کے اشعار بتایا ہے جن میں عمرو بن عبدودّ کے قتل کا ذکر ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

اَعَلَیَّ یقتحم الفوارس ھکذا   عنّی وعنہ اُخّروا اصحابی

لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے روح فرسا صدمہ کے موقع پر بھی کچھ اشعار۔ مرثیہ بھی ضرور کہا ہوگا اس لئے میرے نزدیک یہ تو صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ آپ نے صرف دو ہی اشعار کہے ہوں۔ پس گو سارا دیوان آپ کا کہا ہوا نہ ہو تو نہ سہی مگر آپ کے اشعار یقیناً دو سے زائد ہوں گے۔

۲۔ نابغہ جعدی: نام عبداللہ والد کا نام قیس۔ قبیلہ بنو جعدہ۔ کنیت ابو لیلیٰ۔ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ شخص شراب۔ جوئے اور بت پرستی کو برا جانتا تھا۔ ظہورِ اسلام پر یہ بھی اسلام لے آئے۔ انھوں نے حضورؐ کے سامنے اپنا ایک نعتیہ قصیدہ پڑھا اس پر آپ نے خوش ہو کر تحسین اور دعا میں فرمایا: "لا فُضَّ فوک" تیرا منہ شکستہ نہ ہو۔

ان کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی۔ مگر مرتے دم تک ان کے تمام دانت سالم تھے۔ نابغہ ذبیانی اور منخّل ان کے ہم عصر تھے ان کے قصائد بہت مشہور ہیں۔ ان کے کلام کے متعلق کسی نقاد کا یہ جملہ بہت مشہور ہو گیا ہے کہ "خمارٌ بواف ومطرفٌ بآلاف" (اوڑھنی تو ٹکے کی مگر چادر ہزاروں کی)

یعنی اندز کا مضمون تو معمولی مگر لفظوں کی پالش اور جلا غضب کی۔ یا یہ کہ بعضے اشعار معمولی مگر بعضے بڑے غضب کے۔

(۳) حُطیئہ: نام جرول۔ باپ کا نام اوس۔ قبیلہ بنو عبس۔ کنیت ابو مُلیلہ۔ لقب حُطیئہ کیوں کہ یہ بڑا بدرو، پستہ قد اور کنجوس تھا۔

یہ نہایت کم نسب بلکہ مجہول النسب تھا۔ اصمعی نے لکھا ہے کہ یہ نہایت کمینہ۔ بددین۔ بدطینت بدصورت۔ بھک منگا۔ کنجوس اور لالچی تھا کم نسبی سے اس کا کوئی سرپرست نہ تھا سو سائٹی میں لوگ اسے ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تو اس نے چاہا کہ اپنی ذہانت، جودتِ طبع اور شاعری ہی کے سہارے سوسائٹی میں ابھر کر اپنے لئے اچھا مقام بنالے۔ لوگوں نے جب اُسے بُرا کہا تو اس نے بھی جواب میں سخت سُست کہنا شروع کر دیا اس وجہ سے اس کی شاعری کی اٹھان ہی ہجو اور بدگوئی میں ہوتی اور اسی میں یہ شخص شیطان کی طرح مشہور ہو گیا۔ اس کی بدگوئی اور بدزبانی کا یہ حال تھا کہ اس کی بدگوئی سے کوئی شخص نہ بچ سکا۔ اس کی ماں اس کا باپ۔ اس کا بیٹا۔ خود اس کی اپنی ذات اس نے سب کو برا کہا۔ اسلام کے ظاہر ہونے پر پہلے تو اسلام لایا پھر یہودی فطرت کے باعث مرتد ہو گیا۔ پھر کسی موقع پر اسلام قبول کر لیا مگر نہایت مذبذب اور ڈھلمل یقین بن کر زندہ رہا۔ مسلمانوں کی بھی ہجو کہتا اور در پردہ مسلمانوں کی بدگوئی کرتا یہاں تک کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت زبرقان کی بھی ہجو کہی۔ کہتے ہیں کہ اس نے نہایت عیاری اور منافقت سے حضرت زبرقان کی ہجو کہی کہ اسے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی پہلے نہ سمجھ سکے مگر جب حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف توجہ دلائی اور اس کی شرارت کی نشان دہی کی تب آپ کو اس کی بدباطنی اور منافقت کا علم ہوا اور آپ نے اسے قید کر دیا۔ تب اس نے قید خانہ سے شعر کہہ کر حضرت عمر کی خدمت میں بھیجے جن میں رہائی کی درخواست کی تھی آپ نے فرمایا کہ اس شرط پر رہائی مل سکتی ہے کہ آئندہ کسی شخص کی بھی ہجو نہ کرے۔ تو اس نے کہلایا کہ حضور یہی میرا ذریعہ رزق ہے۔ اسے بند کر دوں تو میرے اہل و عیال پھر کھائیں گے کیا؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو خبردار کسی مسلمان کی ہجو نہ کرنا۔ اس نے عرض کیا کہ اس کا کچھ معاوضہ مجھے ملے تو میں اس کا عہد کروں آپ نے اس کا منہ تین ہزار درہم کا بھاری لقمہ دے کر بند کر دیا کہ پھر وہ مسلمانوں پر نہ کھُلے۔ مگر بھلا طبعی خباثت کہاں جا سکتی تھی ادھر حضرت عمرؓ کی

شہادت ہوئی اور اُدھر اس نے اپنی بد معاشی اور بد طینتی پھر ظاہر کرنی شروع کر دی۔ یہ شخص ۵۹ھ ۶۷۹ء میں مرا۔

علماء نقد کا قول ہے کہ اگر اس کی ذات میں خباثت نسب میں کمزوری۔ طبیعت میں چھچھور اپن نہ ہوتا تو مخضرم شعراء میں کوئی شخص اس کے ٹکر کا نہ تھا۔ کلام میں زور۔ الفاظ کی بندش پختہ اور سلیس جیسی اس کے یہاں ہے دوسرے مخضرم شعراء میں نہیں ہے۔ باوجود ہجو گوئی کے اس کے کلام میں فحش اور شرمناک باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

۴۔ حضرت سیدنا حسان بن ثابتؓ: نام حسان۔ والد کا نام ثابت قبیلہ خزرج جو انصار مدینہ میں ممتاز قبیلہ تھا۔ کنیت ابو الولید۔ آپ کی ولادت حضورؐ کی ولادت سے آٹھ سال قبل مدینہ میں ہوئی حضورؐ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا پھر ساٹھ ہی برس اسلام میں بھی زندگی پائی اور ایک سو بیس سال کی عمر پا کر ۵۴ھ ۶۷۴ء میں مدینہ میں انتقال فرمایا،

اسلام سے قبل آپ نے منذر خاندان اور غسان خاندان کے بادشاہوں کی اور بالخصوص خاندان جفنہ کی مدح میں بہت سے قصائد کہے اور انھوں نے آپ کی قدر دانی میں آپ کو انعام واکرام بھی دیے مگر اسلام لانے کے بعد آپ نے اپنے آپ کو حضورؐ کی نعت۔ مدح (اور بعد وفات حضورؐ کے آپ کے مرثیہ) کے لئے اور اسلام کی مدافعت کے لئے وقف کر دیا اور حسب ارشادِ نبوی زبان سے اسلام کی نصرت کی۔ آپ کو بیت المال سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ آپ کی نظمیں جو کفار کی ہجو میں تھیں انھیں سُن کر حضورؐ نے خوش ہو کر فرمایا "اھجُھُم ومعک روح القدس" "یعنی بس تم ان کفار کی ہجو برابر کرتے رہو روح القدس تمھارے ساتھ ہے"

چنانچہ آپ کے اشعار کفار کے دلوں میں تیر کی طرح لگتے اور کانٹے کی طرح کھٹکتے اور وہ لوگ رو رو دیتے۔ آپ کا قلب بہت کمزور تھا جہاد میں آپ نے شرکت نہیں کی۔ آخر عمر میں آپ کی آنکھیں جاتی رہی تھیں آپ کے اشعار میں۔ فخر۔ شجاعت۔ مدح۔ ہجا۔ حمد۔ نعت کے مضامین زیادہ ہیں۔ علماء نقد کی رائے ہے کہ آپ کے مدحیہ اشعار میں وہ زور و اثر نہیں جو ہجو کے اشعار میں ہے کچھ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہجو میں آپ کے کلام کی پشت پر حضرت جبرئیلؑ کی امداد ہوتی تھی جو مدح میں نہ ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ مدح کے اشعار دل

کی گہرائی سے نہیں اوپری دل سے بغیر اخلاص کے محض ضرورت کے سبب سے ہوتی تھی۔ البتہ حضورؐ کی نعت اور مرثیہ میں چوں کہ دل کا جذبہ خلوص بھی ساتھ ہوتا تھا اس لئے اس میں زور و اثر بہت کافی ہے۔ بہرحال اسلام لانے کے بعد آپ نے مدح میں اشعار کم کہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار خبر ملی کہ کسی نے حضرت ابو بکرؓ کو کچھ برا کہہ دیا۔ تو آپ نے فوراً منبر پر تشریف لے جا کر ایک تقریر فرمائی اور اس میں ابو بکرؓ کے فضائل و مناقب دیر تک بیان فرمانے کے بعد فرمایا۔ "کیا تم میری خاطر بھی میرے دوست ابو بکرؓ کو برا کہنے سے باز نہ رہو گے؟" اس کے بعد حضرت حسان سے کہا ایسے اشعار سناؤ جن میں تم نے میری اور ابو بکر کی تعریف کی ہو تو آپ نے ایک قصیدہ پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

اذا تذکرت شجواً من اخی ثقۃٍ فاذکر اخاک ابا بکر بما فعلا

التالی الثانی المحمود شیمتہ واول الناس طراً صدق الرسلا

الثانی اثنین فی الغار المنیف وقد طاف العدو بہ اذ صعد الجبلا

(۵) حضرت سیدنا کعب رضی اللہ عنہ: نام کعب والد کا نام زہیر ابن ابی سلمٰی صاحب المعلقہ قبیلہ مزینہ۔ کئی پشت سے ان کے خاندان میں شاعری چلی آتی تھی اور ان کے گھرانہ میں متعدد نامور شعرا گزرے۔ ان کے بھائی بجیرؓ ان سے پہلے اسلام لائے۔ انھوں نے سنا تو انھوں نے حضورؐ کی (معاذ اللہ) ہجو میں زبان آلودہ کی۔ حضورؐ نے بدگوئی کی خبر سنی تو پہلے تو آپ نے ادھر التفات بھی نہ فرمایا لیکن جب سنا کہ بدگوئی بڑھی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ اسے جہاں پاؤ قتل کر دو۔ یہ خبر جب کعب کو لگی تو خدا کی طرف سے ایک عجیب رعب اور ہیبت دل میں سما گئی اور ان کے ہوش اڑ گئے۔ دل سے توبہ و ندامت کر کے چھپتے چھپاتے مدینہ کی طرف چلے راستہ میں حضورؐ کی نعت اور مدح میں ایک زور دار قصیدہ کہا گویا اپنی سابقہ ہرزہ سرائی کی تلافی کی اور کفارہ ادا کیا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:-

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول متیم اثرہا لم یفد مکبول

یہ لاجواب قصیدہ اپنے ابتدائی دو لفظوں "بانت سعاد" ہی کے نام سے آج تک مشہور اور

فصحاء عالم سے خراجِ تحسین لے رہا ہے۔ غرض چھپتے چھپاتے مدینہ پہنچے اور خود سیدھے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ راستہ میں برابر یہ خبر ملی کہ میرے قتل کا اعلان ہو چکا ہے حضورؐ کے سامنے ایک اجنبی مسافر بن کر پہنچے اور عرض کیا کہ "سُنا ہے آپ نے کعب ابن زہیرؓ کے قتل کا حکم دے دیا ہے آپ نے فرمایا ہاں عرض کیا اجازت ہو تو میں اسے پکڑ لاؤں۔ ارشاد ہوا جاؤ پکڑ لاؤ۔ عرض کیا اور اگر وہ معافی کی درخواست کرے۔ دربارِ رسالت و رحمت سے ارشاد ہوا کہ اگر وہ معافی مانگے گا تو معاف بھی کر دیا جائے گا۔ پس یہ سُن کر بے تابانہ حضورؐ کے قدمِ مبارک پکڑ لئے اور رو کر عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ! وہ بدبخت میں ہی ہوں مگر اب توبہ کر کے مسلمان ہونے حاضر ہوا ہوں آپ نے خوش ہو کر ان کو کلمۂ اسلام کی تلقین فرمائی تو عرض کیا میں نے حضرت کی شان میں کچھ عرض ...... کیا ہے اجازت ہو تو سناؤں آپ نے فرمایا سناؤ تو وہ قصیدہ سنایا جس میں مذکورہ واقعات کا اپنے شاعرانہ انداز میں بڑے مزے سے ذکر کیا ہے کہتے ہیں۔

تسعی الوُشاۃُ جانبیھا و قولھُمُ — اِنّکَ یا ابن ابی سُلمیٰ لمقتولُ

اُنبئتُ اِن رسولَ اللہ اوعدنی — والعفو عند کرام الناس مقبولُ

مھلاً ھداک الذی اعطاک نافلۃ — القراٰن فیھا مواعیظ و تفصیلُ

لا تاخذنی باقوالِ لوشاۃ ولم — اُذنبُ وان کثرت فیّ الاقاویلِ

جب اس شعر پر پہنچے :-

اِنّ الرسولَ لنورٌ یستضاءُ بہ — مھنّدٌ من سیوفِ الھند مسلولُ

تو آپ کے چہرۂ مبارک پر مسرت اور بشاشت کی ایک لہر دوڑ گئی اور آپ نے ان کو دو انعامات سے نوازا ایک انعام تو ادبی تھا کہ دوسرے مصرع میں ایک اصلاح دی ارشاد ہوا کہ سیوف الھند نہ کہو سیوف اللہ کہو۔ اب اسے صرف ذوقِ سلیم ہی جان سکتا ہے کہ اس اصلاح نے کیسی کچھ جان شعر میں ڈال دی۔ مھنّد میں ہند کا لفظ تو آ ہی چکا تھا۔ پھر دوبارہ الھند لانا محض بھرتی تھا۔ حضورؐ نے اس سُقم کو الگ دُور فرمایا اور الھند کی جگہ اللہ کہہ کر شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور دوسرا

انعام مادی تھا وہ یہ کہ اپنا بُردۂ مبارک (دھاریداری چادرہ) اپنے دوشِ مبارک سے اتار کر ان کو عطا فرمادیا (اور اسی بردۂ شریفہ کے انعام کے واقعہ سے یہ قصیدہ، قصیدۂ بُردہ کے نام سے بھی موسوم ہے) وہ بُردۂ شریفہ عرصہ تک اُن کے خاندان میں رہا تا آنکہ حضرت سیدنا امیرالمومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے خاندان والوں سے ایک گرانقدر رقم کے عوض خرید لیا۔

تزکِ بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۱۱)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابتہ ماہ اکتوبر ۵۶ء)

۹۰۴ھ کے حالات

خجند میں سمرقند اور اندجان لینے کی دوبارہ کوشش کی لیکن کام نہ بنا۔ اس لئے پھر خجند چلا گیا۔

خجند چھوٹی سی جگہ ہے۔ سو دو سو آدمیوں کا سردار ہو تو وہ بھی وہاں مشکل سے گذر بسر کر سکتا ہے پھر جسے سلطنت کا دعویٰ ہو۔ اس کی گذر وہاں کس طرح ہو۔

محمد حسین مرزا سے عارضی قیام کی درخواست سمرقند لینے کے خیال سے محمد حسین گورگان دغلت کے پاس آدمی بھیجے۔ وہ اور اتیبہ میں تھا۔ یار ایلاق کے دیہات میں سے بشاغرج۔ جو پہلے حضرت خواجہ کے قبضے میں تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس سے کہلا کر بھیجا کہ جاڑے ہیں ہمیں وہاں عارضی ٹھیرنے کی اجازت دے دے۔ تاکہ وہاں سے سمرقند پر چڑھائی کی جا سکے۔ وہ راضی ہو گیا۔

رباط خواجہ پر حملے کی تیاریاں خجند سے بشاغرج چلے۔ جب زامین[2] پہنچے تو مجھے بخار آگیا۔

میں بخار میں بلبلاتا ہوا زامین سے مارا مار پہاڑی راستہ طے کر کے رباط خواجہ[3] پہنچا۔ ارادہ یہ تھا کہ چپ چپاتے سیڑھیاں لگا کر فصیل پر جا چڑھیں گے۔ اور خواجہ رباط کے قلعے کو جو شادوار کا صدر مقام ہے چھین لیں گے۔

ہم نماز کے وقت وہاں پہنچے۔ لیکن وہاں کے لوگ ہوشیار ہو گئے۔ اس لئے اُلٹے پاؤں واپس لوٹنا پڑا۔

---

[1] مطابق ۱۴۹۸ء [2] زامین [3] رباط خواجہ، سمرقند کے مغرب میں ہے۔

بخارا میں ۸۵ میل کا سفر | وہاں سے کہیں ٹھیرے بغیر لشاغرح پہنچے۔ بخارا کے سبب ۸۵[1] میل کا وہ راستہ بڑی مصیبت اور تکلیف سے طے ہوا۔

سید یوسف پر حملے | چند روز بعد ابراہیم سارو۔ شیرم طغائی۔ ولیس لاغری اور کچھ امیروں، مصاحبوں اور ملازموں کو دہارا کرنے بھیجا۔ تاکہ یار ایلاق کے قلعوں کو چھین لیں۔ خواہ وہ صلح صفائی سے حاصل ہوں یا انھیں تلوار کے زور سے لیا جائے۔

ان دنوں یار ایلاق پر سید یوسف کا قبضہ تھا۔ میں جب سمرقند سے آیا تو وہ وہیں رہ گیا۔ سلطان علی[2] مرزا نے بھی اس کے ساتھ رعایت برتی۔ اور یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے بیٹے کو یار ایلاق کے قلعوں کا انتظام سونپ دیا۔

احمد یوسف بھی جو، اب سیالکوٹ کا حاکم ہے، ان قلعوں میں تھا۔ میری فوج نے جاڑے بھر بعض قلعوں کو صلح سے بعض کو لڑ بھڑ کے اور بعض کو دھوکے اور فریب سے چھین لیا۔

ازبکوں اور مغلوں کے ڈر سے ملک میں کوئی گاؤں بھی ایسا نہ تھا جس میں قلعہ نہ ہو۔

یار ایلاق میں ناکامی | سید یوسف بیگ، اس کا چھوٹا بھائی اور اس کا لڑکا ہم سے بدگمان ہو گئے تھے۔ انھیں خراسان بھیج دیا۔

یار ایلاق میں ہمارا وقت ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گذرا اور بے کار گذرا۔

جبری صلح کرنی پڑی | گرمی آئی تو دشمنوں نے خواجہ یحییٰ کو صلح کے لئے بھیجا۔ اور خود بھی لشکر کشی کے ارادے سے شیراز اور کابر[3] کے آس پاس پہنچ گئے تھے۔

میرے پاس دو سو سے زیادہ اور تین سو سے کم سپاہی ہوں گے۔ چاروں طرف سے دشمنوں کا ہجوم تھا

---

[1] مسٹر جان لیڈی نے ۱۴ فرسنگ لکھی ہیں [2] بابر جب سمرقند چھوڑ کر اندجان چلا گیا تو علی مرزا بخارا سے چلا اور سمرقند پر قبضہ کر لیا [3] مسٹر جان لیڈی نے نوٹ میں اس کو کیدو لکھا ہے اور ایک قلمی نسخے میں کماد ہے۔

[3] مسٹر جان لیڈی نے یہ فقرہ یوں لکھا ہے کہ "موسم بہار میں جب سلطان علی مرزا اپنے لشکر کے ساتھ شیراز اور کابد کی طرف چلا تو خواجہ یحییٰ کو صلح کے لئے میرے پاس بھیجا۔

اس لئے اندجان واپس جانے میں نصیب نے یاوری نہ کی۔ اور کوئی تدبیر بن نہ پڑی۔ مجبوراً صلح کرنی پڑی اور بشاغرج واپس جانا پڑا۔

بے وطنی اور آوارہ گردی | خجند چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس میں مشکل سے کسی سردار کی گذر ہوسکتی ہے دو ڈیڑھ برس مجھے وہاں ٹھیرنا پڑا۔ وہاں کے مسلمانوں نے جہاں تک ممکن ہوا پیسہ بھی دیا اور خدمت بھی کی۔ اب دوسری دفعہ خجند کس منہ سے جاتا اور خجند جاتا بھی تو کیا کرتا اسی تردد اور پریشانی کے سبب ان ایلاق میں چلا گیا۔ جو اورا تیبہ کے جنوب میں ہیں۔ اور وہاں حیران وپریشان، بے ٹھکانے اور بے آسرا کچھ دن گذارے۔

خواجہ ابو المکارم سے ملاقات | وہیں ایک دن خواجہ ابو المکارم ملنے آیا۔ وہ بھی میری طرح جلاوطن ہو کر آوارہ گردی کررہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ یہیں ٹھیروں یا کسی طرف نکل جاؤں

آنسوؤں کی لڑیاں | اُسے بہت رنج ہوا اور وہ میری حالت زار پہ رو دیا۔ اور فاتحہ پڑھ کر چلا گیا۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ اور میں رونے لگا۔

یول جوق خوشخبری لایا | اسی دن ظہر کا کچھ وقت باقی تھا کہ یکایک پہاڑ کے درّے میں سے ایک سوار نمودار ہوا۔ وہ علی دوست طغائی کا نوکر یول جوق تھا۔ علی دوست نے اس کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔ کہ میں نے گو خطائیں کی ہیں۔ مگر امیدوار ہوں کہ خدا کے لئے میرے گناہ بخش دیجئے۔ اور یہاں تشریف لے آیئے۔ میں مرغینان نذر کرکے حقِ خدمت ادا کروں گا۔ تاکہ میرے گناہ دھل جائیں اور شرمندگی جاتی رہے۔

مرغینان کی طرف | ایسی حیرانی پریشانی میں جو یہ خوشخبری ملی۔ تو میں نے ذرا سی بھی دیر نہ کی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اسی وقت مرغینان روانہ ہوا۔

تنگ آب میں پڑاؤ | وہاں سے مرغینان کا فاصلہ ۹۶[1] میل ہوگا۔ اس ساری رات اور دوسرے دن ظہر تک کہیں نہ ٹھیرے۔ چلتے ہی رہے۔ ظہر کے وقت تنگ آب[2] نام کے گاؤں میں اُترے۔ وہ خجند کے

---

[1] مسٹر جان لیڈی نے یہ فاصلہ تقریباً ۹۶ یا ۱۰۰ میل لکھا ہے [2] تنگ آب

علاقے میں ہے۔

طوفانی سفر | گھوڑوں کو دانہ کھلایا اور ذرا سستائے۔ پھر آدھی رات کو نقارے کے وقت تنگ آب سے چل نکلے۔ اس آدھی رات کو صبح تک۔ دوسرے دن، دن بھر اور پھر دوسری رات کو صبح ہونے سے ذرا پہلے تک چلتے رہے۔

ویس بیگ کا اندیشہ | جب مرغینان چار میل رہ گیا۔ تو ویس بیگ نے عرض کیا۔ کہ علی دوست وہی تو ہے۔ جس نے بے حد برائیاں کی ہیں۔ بیچ میں نہ کوئی آدمی ایک دو دفعہ آیا گیا۔ نہ عہد و پیمان ہوئے۔ نہ بات چیت ہوئی۔ پھر کس بھروسے پر ہم وہاں جا رہے ہیں؟

اور کوئی آسرا نہ تھا | اس میں شک نہیں کہ یہ اندیشہ بے وجہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر ٹھیرے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ آخر یہی طے ہوا کہ یہ اندیشہ گو صحیح ہے مگر پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ تین چار دن تکلیف اُٹھائی کہیں دم نہ لیا۔ سو میل چل کر آ گئے۔ نہ گھوڑوں میں دم ہے۔ نہ آدمیوں میں سکت ہے۔ اس صورت میں یہاں سے کیسے پھریں۔ اور جائیں بھی تو کہاں جائیں۔ جب یہاں تک آ گئے ہیں تو اب چلنا ہی چاہیئے خدا جو چاہے گا وہی ہوگا۔

چناں چہ خدا پر توکل کر کے روانہ ہوئے۔

علی دوست سے عہد و پیمان | صبح کی نماز کا اول وقت تھا۔ جو ہم مرغینان کے قلعے کے دروازے پر پہنچے علی دوست طغائی دروازے کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند رکھا۔ اور عہد و پیمان کی التجا کی۔ عہد و پیمان کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور خدمت میں حاضر ہوا۔

اوزون اور تنبل کا ظلم و ستم | علی دوست سے ملنے کے بعد ہم قلعے کے اندر ایک مناسب مکان میں اُترے میرے ساتھ اس وقت چھوٹے بڑے دو سو چالیس آدمی تھے۔

دراصل مجھے اس لئے بلایا گیا تھا۔ کہ اوزون حسن اور احمد تنبل نے رعیت پر بہت زیادہ ظلم و ستم برپا کر رکھے تھے۔ اس لئے تمام اہلِ ملک نے مجھے بلانے کی خواہش کی تھی۔

قاسم بیگ کی یلغار | مرغینان پہنچنے کے دو تین دن بعد ان لوگوں میں سے جو بشاغرج میں نئے نئے بھرتی

کئے تھے اور علی دوست[1] بیگ کے نوکروں میں سے سو سے زیادہ آدمیوں کو قاسم بیگ کے ہمراہ اندجان کے جنوب کی طرف بھیجا۔ تاکہ وہاں اشپاریوں۔ تورروق شاریوں اور جکراکون[2] جیسی پہاڑی قوموں سے تعلق پیدا کیا جائے۔ اور دریائے خجند سے پار اتر کر وہاں کے قلعوں کو لے لیا جائے۔ اور وہاں کے بتپاری لوگوں کو جس طرح ہو سکے ہماری طرف مائل کیا جائے۔

اوزون اور تنبل کا حملہ | کچھ دن بعد اوزون حسن اور سلطان احمد تنبل نے جہانگیر مرزا سمیت جتنی فوج تھی اس کو ساتھ لیا۔ کچھ مغلوں کو اکٹھا کیا۔ اور آخشی اور اندجان سے جتنا لشکر مل سکا اس کو سمیٹا اور مرغینان پر حملہ کرنے آئے۔ اور مرغینان کی مشرقی جانب دو ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سنان[3] نامی گاؤں میں ٹھیرے وہ ایک روز ستائے۔ پھر سامان درست کر کے مرغینان کے آس پاس کے مقامات پر آدھمکے۔

میدان جنگ میں | قاسم بیگ، ابراہیم سارو اور ویس لاغری جیسے سرداروں کو دو طرف دھاوے کے لئے بھیجا جا چکا تھا۔ اور میرے پاس تھوڑی سی فوج رہ گئی تھی۔ پھر بھی میں اسی کو ٹھیک ٹھاک کر کے نکلا۔ اور میرے ساتھیوں نے دشمنوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔

خلیل چہرہ کی بہادری | اس دن خلیل چہرہ دستار پیچ خوب لڑا اور کامیاب ہوا۔ دشمن کچھ نہ بنا سکے اور دوسری دفعہ انھیں شہر کے قریب آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

قاسم بیگ کی کمک | قاسم بیگ جو اندجان کے جنوب کی طرف پہاڑی ملک میں گیا ہوا تھا اشپاریوں، تورروق شاروں، جکروں اور وہاں کی رعایا کو جن میں دیہاتی، جنگلی، پہاڑی اور خانہ بدوش قومیں تھیں اپنے ساتھ لئے ہوئے آ پہنچا۔

دشمن کے سپاہی آملے | دشمن کے سپاہیوں میں سے بھی ایک ایک دو دو آدمی بھاگ کر آنے شروع ہو گئے۔

قلعوں پر قبضہ | ابراہیم سارو اور ویس لاغری وغیرہ نے جو دریا پار کر کے آخشی کی طرف گئے تھے۔ قلعہ باب پر اور دو ایک اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

اوزون اور تنبل سے رعیت کی بیزاری | اوزون حسن اور تنبل، ظالم، فاسق اور کافر دش آدمی تھے۔ ساری رعیت ان سے

---

[1] میر دوست بیگ۔ [2] جکراگ [3] سیان یا سپان۔

ناراض تھی۔

حسن دیگچی کا کارنامہ آخشی کے امرائیں سے حسن دیگچی نے اپنے گروہ کے ساتھ کچھ غنڈوں اور لفنگوں کو ملا کر بلوے پر آمادہ کر لیا۔ اور ان سب نے ان لوگوں کو جو آخشی کے سنگین قلعے میں تھے مارتے مارتے محل شاہی کے اندر دھنسا دیا۔ اور ابراہیم سارو، ویس لاغری، سیدی قرا اور ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کو قلعے میں داخل کر لیا۔

ماموں نے کمک بھیجی سلطان محمود خاں نے بندے علی اور اپنے دودھ شریک بھائی حیدر اور حاجی غازی منغت[1] کو ہماری مدد کے لئے بھیجا۔ منغت اسی زمانے میں شیبانی خاں کے پاس سے بھاگ کر خان[2] کے پاس پہنچا تھا۔ قبیلۂ بارین[3] کے امرا بھی ان کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ یہی موقعہ تھا کہ یہ کمک آن پہنچی۔

اوزون حسن کی پریشانی اوزون حسن یہ خبر سنتے ہی گھبرا گیا۔ جن لوگوں کو اس نے بڑھایا تھا اور جو اس کو کام دے سکتے تھے۔ ان سب کو آخشی کے محل شاہی کی کمک پر متعین کر کے بھیج دیا۔ وہ لوگ صبح دریا کنارے پہنچے۔

نقشۂ جنگ ہمارے اور مغلوں کے لشکروں کو ان کا حال معلوم ہوا تو کچھ آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھوڑوں سے سامان اُتار دیں اور دریا کے پار اُتر جائیں۔

دشمن پیچھے ہٹا دشمن کی جو فوج کمک کو پہنچی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔ اور کشتی کو اوپر نہ کھینچ سکی۔ جب وہ فوج قلعے میں نہ جا سکی تو جس راستے سے آئی تھی۔ اپنی جان بچا کر اسی راستے سے پیچھے ہٹ گئی۔

زبردست حملہ ہماری اور مغلوں کی فوج میں سے جو جہاں تھا۔ وہیں سے گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوا۔

بخشی کی حیوانیت کشتی میں جو لوگ تھے وہ ذرا بھی نہ لڑ سکے۔

---

[1] منغست [2] سلطان محمود خاں کی طرف اشارہ ہے [3] بارین

قارلوغاج بخشی نے مغل بیگ کے ایک لڑکے کو بلایا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

کام پہلے ہی بگڑ چکا تھا۔ اس لئے ان باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

اوزون کے ساتھیوں کا قتل عام — کشتی والوں کی اکثریت قتل ہوئی۔

جو لوگ دریا میں تھے۔ خشکی پر لائے گئے اور ان سب کو مار ڈالا۔

اوزون حسن کے معتبر آدمیوں میں سے قارغلاج بخشی، خلیل دیوانہ اور قاضی غلام تھے ان میں سے قاضی غلام اس بہانے بچا کہ غلام تھا۔

سپاہیوں میں سے سید علی جو، اب میرے پاس بڑھا چڑھا ہوا ہے اور حیدر قلی تلکہ کاشغری وغیرہ پانچ چھ آدمی تھے جو ستر اسی آدمیوں میں سے بچے۔

اوزون اور تنبل کی پسپائی — دشمن یہ خبر بد سن کر مرغینان کے آس پاس نہ ٹھیر سکے اور بڑی بے سر و سامانی سے اندجان بھاگے۔

اوزون کا بہنوئی مجھ سے آملا — وہ اندجان میں ناصر بیگ کو چھوڑ آئے تھے۔ وہ اوزون حسن کا بہنوئی تھا اور اگر اس کا ثانی نہ تھا تو ثالث ضرور تھا۔

وہ تجربے کار آدمی تھا۔ اور بہت بہادر تھا۔ ان حالات کو سن کر اور اپنے ساتھیوں کی کمزوری محسوس کر کے اس نے اندجان کے قلعے کے دروازے ان پر بند کر دئے اور مرے پاس آدمی بھیجا۔

اوزون اور تنبل کی علیحدگی — دشمن جب اندجان پہنچے اور قلعہ بند پایا تو کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور سب تتر بتر ہو گئے۔[1]

اوزون حسن تو اپنے وطن آخشی چلا گیا اور سلطان احمد تنبل اپنے وطن اوش روانہ ہوا۔

جہانگیر، اوزون کی بجائے تنبل کے پھندے میں — جہانگیر مرزا کو اس کے حاشیے بردار اور ملازمین اوزون حسن سے علیحدہ کر کے تنبل کے پاس لے بھاگے اور تنبل اوش نہ پہنچنے پایا تھا کہ وہ لوگ اس سے جا ملے۔

اندجان پھر ہاتھ آگیا — مجھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ اندجان کی رعیت میری طرف دار ہے۔ میں تامل کئے بغیر

---

[1] دشمن جب اندجان پہنچے اور انھیں معلوم ہوا کہ قلعے والے میرے ساتھ ہیں تو کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے اور تتر بتر ہو گئے

اندجان چلا۔ سورج نکلتے ہی روانگی ہوئی۔ دن ڈھلے اندجان پہنچا۔

ناصر بیگ اور اس کے دونوں بیٹے دوست بیگ اور میرم بیگ حاضر ہوئے۔ میں ان سے ملا۔ اور ان کا حال پوچھا۔ ان پر عنایت و مہربانی کی۔ اور لطف و کرم کا امیدوار بنایا۔

تقریباً دو برس ہوتے باپ دادا کا ملک ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ خدا کے فضل سے ذیقعد[1] ۹۰۴ھ میں پھر فتح ہوا۔

تنبل اوش سے نکالا گیا | سلطان احمد تنبل، جہانگیر مرزا کو لے کے اوش گیا تھا۔ وہ جو وہاں پہنچے تو وہاں کے غنڈوں اور لفنگوں نے لاٹھیاں مار مار کے انھیں اوش سے باہر نکال دیا۔ اور قلعے کو میرے لئے بچا لیا اور میرے پاس آدمی بھیجا۔

تنبل اورکند چلا گیا | جہانگیر اور تنبل حیران و پریشان چند آدمیوں کے ساتھ اوش سے اورکند چلے گئے۔

اوزون کا تعاقب | اوزون حسن جب اندجان نہ جا سکا۔ تو آخشی چلا گیا۔ مجھے بھی خبر ملی کہ وہ آخشی پہنچ گیا۔

مفسدوں کا سرغنہ اور فساد کی جڑ وہی تھا۔ اس لئے اس کا حال سننے کے بعد میں اندجان میں چار پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھیرا اور آخشی چلا۔

اوزون کی ہار | میں آخشی پہنچا۔ تو اس سے کچھ بن نہ پڑا۔ عہد و امان کا طلب گار ہوا۔ اور قلعہ میرے حوالے کر دیا

آخشی اور کاشان پر قبضہ | میں چند روز آخشی ٹھیرا اور آخشی اور کاشان کا اچھی طرح انتظام کیا اور وہاں کے تمام کام ٹھیک ٹھاک کئے۔ پھر ان مغل مرزا کو رخصت کیا جو میری مدد کو آئے تھے۔

اوزون کی سیاسی زندگی کا خاتمہ | میں اپنے ساتھ اوزون حسن کو اس کے اہل و عیال اور متعلقین سمیت اندجان لے آیا۔ اس سے عہد کر لیا تھا۔ اس لئے اس کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اور قرانگین[3] کے

---

[1] جون ۱۴۹۹ء [2] مسز جان لیڈن کے ترجمے میں یہ فقرہ بھی درج ہے کہ قاسم ایوب کو جو ادنیٰ سرداروں میں سے تھا اور اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا تھا چند دن کے لئے آخشی کا حاکم بنا دیا۔ [3] قیر تگین یا قیر اتگین۔

راستے اُسے حصار جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ حصار چلا گیا۔

دشمنوں نے دوستی کی نقاب اوڑھی اس کے بہت سے نوکر چاکر جو باقی رہ گئے۔ وہ میرے پاس ٹھیر گئے۔ یہی وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے میرے اور خواجہ قاضی کے ساتھیوں کو لوٹا اور تباہ کیا تھا۔

لوٹ کا مال چند امیروں نے متفقہ طور پر مجھ سے کہا کہ یہی وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے ہمارے ساتھ برائیاں کی ہیں۔ اور ہمارے مسلمان ساتھیوں کو لوٹا ہے اور برباد کیا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے آقاؤں کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو اب ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے۔ ہم انھیں لوٹ لیں یا گرفتار کرلیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ہمارے کپڑے پہنتے ہیں اور ہماری ہی بکریاں کاٹ کاٹ کے کھاتے ہیں۔ ان کے یہ ستم ہم کس طرح برداشت کریں؟

رحم و کرم کے سبب انھیں تباہ و برباد نہ کیا جائے اور انھیں گرفتار نہ کیا جائے۔ تو کم از کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیئے۔ کہ جن لوگوں نے لڑائیوں اور مصیبتوں میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ انھیں اجازت دے دی جائے کہ ان کا جو سامان موجود ہے وہ اسے پہچان کر واپس لے لیں۔ اتنی سی بات میں ان کا پیچھا چھوٹ جائے۔ تو انھیں احسان مند ہونا چاہیئے۔

میرا فیصلہ حقیقت میں یہ باتیں معقول معلوم ہوئیں اور میں نے حکم دے دیا کہ جن لوگوں نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ وہ اپنا مال پہچان کر لے لیں۔

فیصلے کے بُرے نتیجے یہ فیصلہ اگرچہ ٹھیک تھا اور بے وجہ نہ تھا پھر بھی ذرا جلدی ہوئی۔ ملک گیری اور ملکداری کے سلسلے میں بعض کام بہ ظاہر معقول اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہر کام کے لئے لاکھ طرح کی اونچ نیچ دیکھنی واجب ہے میں نے جو بے سوچے سمجھے یہ حکم دے دیا۔ اس سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوئے۔ یہی وہ حکم تھا جس کے سبب ہمیں اندجان سے دوبارہ نکلنا پڑا اسی کی وجہ سے مغلوں کو اندیشے پیدا ہوئے۔ اور وہ رباطک اورچینی سے جس کو دوآبہ بھی کہتے ہیں اور کند کی طرف چل دیئے۔ اور تنبل کے پاس آدمی دوڑائے اور اُسے خبر بھیجی۔

مغلوں کی بغاوت میری والدہ کے پاس تقریباً سوا ڈیڑھ ہزار مغل تھے۔ ان کے علاوہ حصار سے حمزہ سلطان،

مہدی سلطان اور محمد دغلت کے ساتھی مغل بھی آ گئے۔ ان کی تعداد بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔

مغلوں نے ہمیشہ بغاوتیں اور برائیاں کی ہیں۔ آج تک پانچ دفعہ تو مجھ ہی سے بغاوت کر چکے ہیں۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ مجھ کو غیر سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ اپنے سرداروں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

سلطان قلی چناق | سلطان قلی چناق نے مجھے مغلوں کی اس بغاوت کی خبر پہنچائی۔ یہ وہ آدمی ہے۔ جس کے باپ ندا بیروی بوقاق کے ساتھ ہیں نے مغلوں میں سب سے زیادہ سلوک کئے تھے۔ اب وہ مر چکا تھا۔ سلطان قلی خود بھی مغلوں کے ساتھ تھا۔ اس نے بڑا کام کیا۔ کہ اپنی قوم اور گروہ سے جدا ہو کر مجھے یہ خبر پہنچائی۔

اس موقع پر اگرچہ اس نے کام دیا۔ لیکن آخر میں اس نے ایسی ایسی برائیاں کیں۔ کہ ایسی سو خدمتیں بھی ہوں تو بے کار جائیں۔ تفصیل آگے بیان کروں گا۔ اس نے جو برائیاں کیں۔ وہ اس کے مغل ہونے کا نتیجہ تھیں۔

صلاح مشورے | اس خبر کے ملتے ہی امراء کو جمع کیا اور صلاح کی۔ سب نے یہی عرض کیا۔ کہ یہ معمولی سا کام ہے۔ حضور کے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ قاسم بیگ کو امراء اور لشکر کا سردار بنایئے۔ وہ سب کو لے جائے۔ چناں چہ یہی بات قرار پا گئی۔

تنبل نے مغلوں کو مدد دی | اس کام کو آسان سمجھا۔ یہ غلطی ہوتی۔

قاسم بیگ اسی روز اپنے لشکر اور امراء کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہ سب راستے ہی میں تھے اور منزل پر پہنچنے نہ پائے تھے کہ تنبل مغلوں سے جا ملا۔

تنبل نے شکست دی | اسی رات کی صبح کو یاسی کی چت کے گھاٹ سے دریائے ایلامیش کے پار ہوتے ہی آمنا سامنا ہو گیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ قاسم بیگ نے سلطان محمد ارغون کا مقابلہ کیا۔ اور دو تین دفعہ پے در پے ایسی تلواریں ماریں۔ کہ اس کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ میرے اور بہت سے جوانوں نے بھی مقابلہ کیا۔ اور خوب لڑے۔ لیکن آخر کار شکست کھائی۔

بچ کر آنے والے | قاسم بیگ، علی دوست طغائی، ابراہیم سارد، ویس لاغری، سیری قرا اور امراء اور مقربین میں سے تین چار اور آدمی بچ کر نکل آئے

وہ جو گرفتار ہوئے | امراء وغیرہ کی اکثریت پکڑی گئی۔ علی درویش بیگ، میرم لاغری، توقہ بیگ، طغائی

بیگ، علی دوست، میر شاہ قوچین اور میرم دیوانہ وغیرہ پکڑے گئے۔

صمد اور شہسوار کا معرکہ | اس معرکہ میں دو نوجوان خوب لڑے۔ ہماری طرف سے ابراہیم سارو کے چھوٹے بھائیوں میں سے صمد اور ادھر سے حصاری مغلوں میں سے شہسوار نامی جوان کا آمنا سامنا ہوا شہسوار نے ایسی تلوار ماری کہ صمد کے خود کو کاٹتی ہوئی سر میں اتر گئی۔

اس زخم کے باوجود صمد نے ایسا ہاتھ مارا کہ اس کی تلوار شہسوار کے سر میں سے ہتھیلی کے برابر ہڈی کا ٹکڑا کاٹتی ہوئی نکل گئی۔

شہسوار کے سر پر خود نہ تھا۔ لیکن اس کے سر کا زخم اچھی طرح باندھ دیا گیا اس لئے وہ اچھا ہو گیا۔ ادھر کوئی نہ تھا جو صمد کی خبر لیتا۔ وہ تین چار دن بعد اسی زخم سے مر گیا اور مصیبتوں سے بچ گیا۔

بے ڈھب شکست | ملک لیتے ہی یہ عجیب اور بے ڈھب شکست ہوئی۔

قنبر علی فعل | ہمارے ہاں قنبر علی فعل رکن اعظم تھا۔ میں نے جب اندجان فتح کیا تو وہ اپنے وطن چلا گیا تھا۔

تنبل اندجان پر چڑھا | اس نازک موقع پر تنبل جہانگیر مرزا کو ساتھ لئے ہوئے آدھمکا۔ وہ اندجان سے دو میل کے فاصلے پر ایک سبزہ زار میں جو پشتۂ عیش کے سامنے ہے آن ٹھیرے۔

چل دختران سے پشتۂ عیش تک | وہ دو ایک دفعہ تیار ہو کر چل دختران سے پشتۂ عیش کے دامن تک آئے۔ ہمارے جوان بھی محلات اور باغات سے تیار ہو کر نکلے۔ لیکن دشمن آگے نہ آیا۔ پشتۂ عیش کے دامن ہی سے الٹا پھر گیا۔

میرم لاغری اور توقد کا قتل | جن دنوں انھوں نے اندجان پر چڑھائی کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ہمارے گرفتار شدہ آدمیوں میں سے میرم لاغری اور توقد کو قتل کر ڈالا۔

تنبل نے اوش چھین لیا | تقریباً مہینہ بھر تک دشمن وہاں پڑا رہا۔ لیکن کچھ بگاڑ نہ سکا آخر وہ سب اوش چلے گئے۔ میں نے اوش ابراہیم سارو کو دے دیا تھا۔ اس وقت وہاں اس کا کوئی آدمی نہ تھا اس لئے دشمنوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

۹۰۵ھ کے واقعات[1]

باقاعدہ جنگ کی تیاریاں | اپنے ملک میں سواروں اور پیادوں کی جتنی فوج تھی۔ اس کو بلانے کے لئے ہرکارے بھیجے اور جلد پہنچنے کی تاکید کی۔

قنبر علی کے پاس اور لشکر میں سے جو سپاہی اپنے اپنے وطن چلے گئے تھے۔ ان کے پاس خاص طور سے ہرکارے دوڑائے۔

تورا، سیڑھیاں، پھاوڑے، کلہاڑیاں اور لشکر کا دیگر سامان مہیا کرنے کے لئے آدمی مقرر کئے۔

چاروں طرف سے جو سپاہی، سوار اور پیادے آتے رہے۔ انہیں یکجا ٹھیرایا گیا۔ جتنے نوکر اور سپاہی ادھر ادھر انتظام کے لئے چلے گئے تھے۔ ان کو بھی جمع کیا۔

چار باغ | اٹھارویں محرم کو خدا پر توکل کر کے حافظ بیگ کے چار باغ کی طرف روانہ ہوا دو ایک روز چار باغ میں رہ کر جتنا اسباب حرب وضرب باقی رہ گیا تھا۔ اس کو تیار کیا۔ اور لڑائی کی صفیں دائیں بائیں اور لشکر کے بیچ میں اور لشکر کے آگے سوار اور پیادوں سے ترتیب دے کر اوش چلا۔

لات کند | اوش کے قریب پہنچے تو دشمن اوش کے آس پاس نہ ٹھیر سکے اور رباط سرہنگ[2] میں بھاگ گئے جو اوش کے شمال میں ہے۔

ہم اس رات لات کند میں ٹھیرے۔ صبح اوش سے چلتے وقت خبر ملی کہ دشمن اندجان چلا گیا۔

اور کند کو لوٹنے کا ارادہ | ہم اور کند چلے۔ اور فوج کا ایک دستہ اور کند کو لوٹنے کے لئے اپنے سے آگے بھیجا۔

اندجان پر نفسل کا ناکام حملہ | دشمن جو اندجان گیا۔ تو راتوں رات خندق میں جا پہنچا۔ لیکن جب فصیل پر سیڑھیاں لگانی چاہیں تو شہر والے ہوشیار ہو گئے۔ اور حملہ آور کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ناکام اُلٹے پھرے

بے فائدہ لوٹ | ہم سے آگے فوج کا جو دستہ گیا تھا۔ اس نے اور کند کے آس پاس کے علاقے کو لوٹا۔ مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔

---

[1] مطابق ۸ راگست ۱۴۹۹ء [2] مطابق ۲۵ راگست ۱۴۹۹ء [3] رباط سرہنگ اوزجینی

قومی اور جماعتی زندگی کے نفسیاتی مؤثرات

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

"نفسیات" کا مسئلہ نہایت اہم ہے قومی اور اجتماعی مسائل کے حل کرنے کے لئے اس کا سمجھنا بہت ضروری ہے اس کے بغیر صحیح معنوں میں نہ کوئی شخص جماعتی زندگی میں حصہ لے سکتا ہے نہ اس کی قیادت کر سکتا ہے اور نہ ٹھیک تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ انسانی فطرت کیا ہے؟ اندرونی زندگی کے مؤثرات و محرکات کیا ہیں؟ خارجی زندگی میں ان کا کس قسم کا اثر پڑتا ہے اس وقت تک کسی قوم و جماعت کے بارے میں نہ راہِ عمل متعین کی جا سکتی ہے اور نہ صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جدید دنیا نے اس مسئلہ کو مستقل علم کی شکل دے کر نہایت شاندار اور قیمتی بحثیں کی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر طبقہ و ہر پیشہ کی تعلیم سے پہلے ان کی نفسیاتی عوامل کا مطالعہ کیا جاتا ہے پھر ان کے لئے راہِ عمل کا تعین ہوتا ہے۔

یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرنی مشکل ہے چند ابتدائی اور بنیادی باتیں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ قومی اور جماعتی زندگی سمجھنے میں کسی قدر سہولت ہو سکے۔

فطرت قبول حق کی قوت واستعداد کا نام ہے

قرآن حکیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مؤثرات جن کا اثر عملی زندگی پر پڑتا ہے بنیادی حیثیت سے چار ہیں۔ (۱) فطرت (۲) وراثت (۳) ماحول اور (۴) تعلیم و تربیت اب ان میں سے ہر ایک کی بالترتیب تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت تخم کی ہے جس طرح تخم میں بالقوۃ نشو و نما، اور درخت بننے کی قوت موجود ہوتی ہے اسی طرح فطرت میں نشو و نمائی اور برگ و باری کی استعداد ہوتی ہے۔

اس بنا پر ہر انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے اور جب تک دوسرے مؤثرات کا غلبہ نہیں ہو جاتا

ہے یہ فطرت برابر لائٹ کا کام دیتی رہتی ہے[۱]

اس کی بنیاد درج ذیل آیتیں ہیں۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا ۳۰ پ ۲۱ — اللہ کی وہ تراش جس پر اس نے لوگوں کو تراشا[۲]

دراصل یہ تراش ہی ایسی ہے جس میں قبولِ حق کی استعداد بھر دی گئی ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۹۶ پ ۳۰ — ہم نے انسان کو خوب سے خوب اندازے پر پیدا کیا[۳]

فطرت کے بارے میں محققین کی رائیں | فطرت کے بارے میں محققین کی تصریحات یہ ہیں۔

لغتِ حدیث کی مشہور کتاب مجمع البحار میں ہے۔

"فطر" کے معنی ایجاد کرنا اور گھڑنا فطرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان ابتداء اور اختراع کے مرحلہ میں جبلت و طبیعت کی ایسی حالت پر پیدا ہوتا ہے کہ اس میں قبولِ دین (حق) کی استعداد ہوتی ہے[۴]

"محلی ابن حزم" میں فطرت کی یہی تشریح مذکور ہے[۵]۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں

تمام آدمیوں کا جوہر اصل فطرت میں قبول و اصلاح کی لیاقت رکھتا ہے جس طرح ہر لوہا آئینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے[۶]

قاضی بیضاوی کہتے ہیں

انسان فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے یعنی قبولِ حق کی قدرت پر[۷]

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فطرت پر نہایت محققانہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہو چکا[۸]

۱؎ "Lexxican" کی لغت میں فطرت کی یہ تعریف ہے۔ فطرت ۔ بچہ کی وہ نیچرل کانسٹی ٹیوشن جس پر کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں روحانی لحاظ سے بنایا جاتا ہے ۱۲ فطرت ۔ پر قدیم و جدید فلسفیوں نے کافی بحث کی ہے ۔ روسو ۔ کے نزدیک انسان فطرتاً نیک پیدا ہوتا ہے پستالوزی اپنے دورِ اول اور دورِ آخر میں اسی کا قائل تھا ان کے علاوہ دوسرے فلسفی جو اسلام سے زیادہ متاثر ہیں ان کے خیالات اس سے ملتے جلتے ہیں (ملاحظہ ہو پستالوزی کا فلسفہ تمدن و تعلیم) ۲؎ ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب ۳؎ حوالہ بالا ۴؎ مجمع البحار ج ۳ ص ۸۵ ۵؎ از فیض الباری ج ۲ ۶؎ کیمیائے سعادت عنوان اول ۷؎ بیضاوی ص ۹۶ ۸؎ فیض الباری ج ۲ کتاب الجنائز ص ۴۸۴ تا ۴۸۹

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فطرت کے دو حصے کئے ہیں اور ان دونوں کو ظاہری و باطنی خصوصیات پر محمول کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں۔

"انسان کی ظاہری خصوصیت اس کا سیدھا جسم دلکش رنگ اور دلربا صورت ہے وہ اس وصف میں اپنی خاص ہیئت کے ساتھ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے اسی طرح اس کی باطنی خصوصیت سمجھ بوجھ عقل اور یہ کہ اس میں اللہ کی معرفت کی طلب اس کی عبادت کا جذبہ اور زندگی میں انتفاع کی صورتیں وغیرہ بھر دی گئی ہیں یہ اس کی فطرت ہے" [1]

ایک اور موقع پر شاہ صاحب تمام انبیاء کی تعلیمات کا خلاصہ طہارت۔ اخبات۔ سماحت اور عدالت میں بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

"والحالة المركبة منها تسمى الفطرة وللفطرة اسباب تحصل بها بعضها علمية وبعضها عملية" [2]

ان چاروں اوصاف کی ترکیب سے جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کا نام فطرۃ ہے اور فطرۃ کے بہت سے علمی اور عملی اسباب انھیں اوصاف سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس عبارت سے غالباً شاہ صاحب کا مقصد فطرت کا مزاج سمجھانا اور اس کے رجحانات کی سمت متعین کرنا ہے۔

قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ جن کا ذکر حدیثوں میں آتا ہے اور شاہ صاحب نے جس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے وہ فطرت کے ماسوا نیکی و بدی کے محرکات ہیں اور اس وقت میرے موضوعِ بحث سے خارج ہیں۔ [ع]

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ قدرت کا قانون "فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا" اور رسول اللہ کا فرمان "کل مولود یولد علی الفطرۃ"	ہر انسان فطرۃ پر پیدا ہوتا ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے نہ کہ اکثریہ

(ہر بچہ فطرۃ پر پیدا ہوتا ہے) تمام انسانوں کے لئے عام ہے اس میں کسی قسم کی تخصیص اور تفریق

ع ڈاکٹر یانگ "Jung" نے "Persona" اور "Anima" کے نام سے جو بحث کی ہے وہ قوت ملکیہ اور بہیمیہ سے ملتی جلتی ہے (شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ تعلیم)

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۳۳ [2] حوالہ بالا ۱۶۷

نہیں ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ اکثریہ کیوں کہ مذکورہ دونوں عبارتوں سے کلیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ع

باقی رہیں وہ روایتیں اور حدیثیں جن سے بظاہر اس کلیت پر شبہ ہوتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے مثلاً خضر علیہ السلام نے جس بچہ کو قتل کر دیا تھا اس کے لئے یہ فرمان کہ وہ پیدائشی شریر اور کافر تھا یا رسول اللہؐ کا یہ فرمان کہ سعادت و شقاوت کا فیصلہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے یا جنتی اور دوزخی ہونے کا معاملہ اسی وقت طے ہو جاتا ہے جب کہ بچہ پشت میں ہوتا ہے اس قسم کی تمام روایتوں کا تعلق سعادت اور شقاوت کی بحث سے ہے نہ کہ فطرۃ سے۔ فطرۃ کا تعلق حس اور احساس سے ہے جو ابتدائی مرحلہ میں انسان کو عطا ہوتا ہے اور سعادت و شقاوت کا تعلق انسان کی پوری زندگی اور آئندہ کے تمام اعمال و افعال سے ہے۔

یہ اللہ کا انتہائی فضل و کرم ہے کہ اس نے مستقبل (آئندہ) کو ہم سے پوشیدہ رکھا تاکہ ہم راحت و سکون سے زندگی گذار سکیں لیکن علم الٰہی چونکہ حال و مستقبل کی قید سے پاک ہے اس لئے جو کچھ انسان اپنے قصد و ارادہ سے آئندہ کرے گا وہ سب کرنے سے پہلے علم الٰہی میں محفوظ اور موجود ہے اور بعینہ اسی طرح محفوظ ہے کہ گویا وہ کر چکا ہے۔ ہم مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ اس بنا پر نہیں کر سکتے ہیں کہ اس کا قطعی علم ہمیں نہیں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کو آئندہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے لاعلمی کا عذر نہیں ہے اس لئے آئندہ کے کاموں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اپنے قطعی علم کی بنا پر پیدائش کے وقت انسان کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ کر دیتے ہیں جس طرح ہم اپنے ناقص علم اور تجربہ کی بنا پر آئندہ کا بجٹ بناتے ہیں۔

مذکورہ حدیثوں میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ علم الٰہی کی بنا پر ہے اور اس فیصلہ کی بجنسہ وہی صورت ہے جو کام کے بعد کی ہوتی ہے اس بنا پر نہ ان حدیثوں کا فطرت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس بات سے ہے کہ بعض فطرتاً نیک بخت ہوتے ہیں اور بعض فطرتاً بدبخت۔ بلکہ ان کا تمام تر تعلق بعد کے اعمال و افعال سے ہے جنہیں انسان اپنے قصد و ارادہ سے کرے گا یہ فیصلے دراصل نتیجہ ہیں بعد کے کاموں کے نہ کہ بعد کے کام ان کے نتیجے ہیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے ورنہ غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

ع البتہ فلسفیوں کے یہاں اس بارے میں مختلف قول ملتے ہیں جن سے اس وقت مجھے بحث نہیں ۱۲

دوسرا وراثت ہے۔

(۴) کچھ خاصیتیں اور صلاحیتیں بطور وراثت ملتی ہیں شاکلہ کی تفسیر سے وراثت پر استدلال

وراثت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کچھ خاصیتیں اور صلاحیتیں بطور وراثت ملتی ہیں یعنی جس طرح انسان صورت شکل میں والدین اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک مشابہ ہوتا ہے اسی طرح سیرت میں کسی نہ کسی درجہ مشابہت ہوتی ہے اور مزاج وطبیعت کے بنانے میں اس کو بھی دخل ہوتا ہے ؎

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

کل یعمل علی شاکلتہ ۱۷/۸۴ ہر کوئی کام کرتا ہے اپنے ڈول پر[۱]

ڈول ہندی لفظ ہے جس کے معنی ابتدائی صورت۔ بناوٹ۔ ڈھانچہ وغیرہ ہیں۔

عربی میں شاکلۃ شاکل کی مؤنث ہے معنی مثل۔ نظیر۔ مشابہت۔ مسلک۔ طریقہ۔ مذہب وغیرہ ہیں محاورہ ہے لست علی شکلی ولا علی شاکلتی[۲] (تو میرے مسلک اور طریقہ پر نہیں ہے) فیہ شکلۃ او شاکل من ابیہ[۳] (اس میں اپنے باپ سے مشابہت ہے)

محققین کی تصریحات یہ ہیں:۔

ابو بکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ

مجاہد نے اس کی تفسیر "طبیعت" سے کی ہے اور بعضوں نے اس سے مراد وہ عادتیں لی ہیں جن پر انسان کی ترکیب ہوئی ہے علی عادتہ التی الفھا خود ابو بکر کے نزدیک اس کے معنی "

؎ اس سلسلہ میں "اجتماعیات" کا بیان یہ ہے

قوم صرف مادیات میں اپنے اسلاف کی پیروی نہیں کرتی بلکہ وہ ان کے جذبات واحساسات سے بھی متاثر ہوتی ہے ...... عملی زندگی کے مؤثرات کی تین قسمیں ہیں (۱) آباء واجداد یعنی گذشتہ سلسلۂ خاندان کا اثر جو تمام اسباب سے قوی ہوتا ہے (۲) ماں باپ کا اثر (۳) ملک جغرافیائی حدود آب و ہوا اور گردوپیش کی چیزوں کا اثر ...... ہر قوم میں چند اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں یہ اخلاقی وعقلی اوصاف جن کے مجموعہ سے ہر قوم میں ایک مشترک روح پیدا ہوتی ہے زمانہ کے سیکڑوں برس کی گردش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے وہ ہر قوم کے عہد گذشتہ کا خلاصہ اس کے آباء واجداد کی وراثت اور اس کی موجودہ روش کا مبدء اولین ہے اخلاق ایک موروثی چیز ہے اور وراثت کو صرف زمانہ ہی زائل کر سکتی ہے۔ (انقلاب الامم ص۱۳۹،۱۴۰) [۱] ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب [۲] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۴ [۳] المنجد۔

جس کے وہ لایق اور مشابہ ہے" جس طرح قرآنِ حکیم میں دوسری جگہ ہے الخبیثات للخبیثین والطیبات للطیبین (خبیث اور گندی باتیں خبیث اور گندے لوگوں کے لئے ہیں اچھی اور پاکیزہ باتیں اچھے اور پاکیزہ لوگوں کے لئے ہیں) اسی طرح اس مقام کو سمجھنا چاہیئے[1]

مدارج السالکین کی شرح منازل السائرین میں بھی یہی معنیٰ بیان ہوئے ہیں[2]۔

قاضی بیضاوی آیت کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں۔

"ہر آدمی اس طریقے پر عمل کرتا ہے جو طریقہ ہدایت و ضلالت میں اس کی حالت کے مشابہ ہوتا ہے اور اس طریقے پر عمل کرتا ہے جو جوہرِ روح اور مزاج بدن کی حالتوں کے مشابہ ہوتا ہے[3]"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں

"علی شاکلتہ ای طریقہ التی جبل علیہ[4] اپنے اس طریقے پر جس پر اس کی جبلت کی گئی ہے

یہ بات تو بہر حال مسلم ہے کہ انسان کی ظاہری صورت کی طرح اس کی ایک معنوی صورت بھی ہوتی ہے جو ابتدا میں بنتی ہے اور تاثیر کے فعل کو قبول کرتی ہے اس مرحلہ میں چونکہ ماں باپ زیادہ قریب ہوتے ہیں اس بنا پر ان کا زیادہ اثر پڑتا ہے اور ان کے توسط سے تمام ان لوگوں کا اثر پڑتا ہے جن کا ماں باپ پر اثر ہے درج ذیل بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ ابو حیان اندلسی کہتے ہیں

شاکلتہ کے معنی اس طریقے اور روش کے ہیں جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے فراء کا بیان بھی یہی ہے[5] ظاہر ہے کہ یہاں فطرت کے معنی وہ نہیں ہو سکتے جو پہلے مذکور ہو چکے ہیں کیونکہ فطرت کے فعل میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور آیت میں یکسانیت بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس بناء پر علامہ نے فطرت سے وہ معنوی صورت مراد لی ہو گی جو ابتدا میں انسان کو دی جاتی ہے یعنی جس

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۲۵۶ [2] منازل السائرین ج ۲ ص ۲۰۷ [3] بیضاوی ص ۳۰۹ [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲۰ و ۲۲ [5] البحر المحیط ج ۶ ص ۶۵ از لغات القرآن۔

نہاد پر اس کو بنایا جاتا ہے اور جس خمیر پر اس کو اٹھایا جاتا ہے۔

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں۔

"ہر ایک عمل کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر ع ہر کسے آں کند کز وشاید" یعنی اس سجیہ (بناوٹ) پر کہ جس کاتم نے اسے پابند کیا ہے کیوں کہ سجیہ کا غلبہ انسان پر چھایا رہتا ہے جیسا کہ میں نے "الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعۃ" میں بیان کیا ہے یہ آیت اسی طرح کی ہے جیسا کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے "کل میسر لما خلق لہ" ہر ایک کے لئے وہی چیز آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا۔[1]

یعنی ابتدائی سرشت میں جس کے لئے جو صلاحیتیں مہیا کردی گئی ہیں اسی کے کرنے میں انسان کو سہولت ہوتی ہے یہ واضح رہے کہ مذکورہ حدیث میں آسانی اور سہولت کا ذکر ہے یہ نہیں ہے کہ انسان دوسرے مؤثرات کی بنا پر اس کے خلاف کرہی نہیں سکتا ہے۔

گذشتہ قوموں کے تذکرہ سے وراثت پر استدلال

زیر بحث آیت کے علاوہ قرآن حکیم میں بکثرت بگڑی ہوئی قوموں کے آباء واجداد کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے موجودہ لوگوں کی روش پر استدلال کیا گیا ہے مثلاً یہودیوں کے ذکر میں ان کے آباء واجداد کا تذکرہ اور نصاریٰ کے بیان میں ان کے آباء واجداد کے حالات کا ذکر وغیرہ اس قسم کے تمام مواقع میں منجملہ اور باتوں کے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود رہے کہ ہر قوم کسی نہ کسی حد تک اپنے عہد گذشتہ کا خلاصہ ہوتی ہے اور کچھ صلاحیتیں اور خاصیتیں بطور وراثت منتقل ہوتی ہیں جن کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا ہر انقلابی و اصلاحی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی طرزِ معاشرت، رسم و رواج وغیرہ زندگی کے مظاہر پر وراثت کا جو اثر پڑتا ہے اس کا ادنیٰ اشارہ ان آیتوں میں موجود ہے۔

قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ اباءنا ۵ ۱۰۴	وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔
قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا ۲ ۱۰۷	وہ کہتے ہیں کہ ہم اس طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے بوڑھوں کو چلتے ہوئے پایا ہے۔

---

[1] لغات القرآن۔

قالوا بل وجدنا آباءنا کذٰلک یفعلون — وہ کہتے ہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا ہے

ان آیتوں میں وراثت کے ثبوت کی طرح ماحول کا بھی ثبوت ملتا ہے کیوں کہ طرزِ معاشرت اور رسم و رواج میں ماحول کا کافی اثر پڑتا ہے۔

مظاہر کے ساتھ قوموں کو کس قدر چسپیدگی ہوتی ہے اور ان سے کتنی خوش اور مطمئن رہتی ہیں اس کا ذکر درج ذیل آیتوں میں ہے۔

کل حزب بما لدیھم فرحون ۵۲ — ہر گروہ کے پاس جو مذہب و مشرب ہے وہ اس پر خوش ہے

وجدنا آباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثٰرھم مقتدون ۲۳ — ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین و آئین پر پایا انھیں کے نقش قدم کی اقتدا کرتے ہیں۔

ایک جگہ علیٰ آثٰرھم مھتدون ۲۲ ہے — انھیں کے قدموں پر ہم راستہ پائے ہوئے ہیں۔

احادیث میں بھی وراثت کا ثبوت ملتا ہے	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل فرمان سے بھی وراثت کا ثبوت ملتا ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ [۱]

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (خاندان) اس کو یہودی، نصرانی، مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔

اس حدیث سے وراثت اور ماحول دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ [۲] — لوگ کان ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح (ان کانوں سے مختلف قسم کے لوگ نکلتے ہیں)

یہ تشبیہ نہایت دور رس اور نتیجہ خیز ہے اس میں جس قدر آپ غور کریں گے حقیقت کھلتی جائے گی اور غور و فکر کے لئے نئے میدان سامنے آتے جائیں گے جس سے اصلاح و تربیت کے مسائل حل کرنے میں سہولت ہوگی۔

الود یتوارث والبغض یتوارث [۳] — محبت اور بغض وراثۃً چلتے ہیں

[۱] بخاری، مسلم [۲] مسلم و مشکوٰۃ کتاب العلم [۳] کنز العمال

اسی طرح رسول اللہ نے غصہ کے سلسلہ میں لوگوں کی مختلف قسمیں گنائی ہیں، مثلاً

(۱) بعض کو جلد غصہ آتا ہے اور جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض کو دیر میں غصہ آتا ہے اور دیر میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔

(۳) بعض کو دیر میں غصہ آتا ہے اور جلد ٹھنڈا ہوتا ہے۔

(۴) اور بعض کو جلد غصہ آتا ہے اور دیر میں ٹھنڈا ہوتا ہے [۱]

ایسے ہی رسول اللہ نے کسی سے مطالبہ کرنے اور قرض کے ادا کرنے میں لوگوں کی مختلف قسمیں بتائی ہیں جس سے طبیعت کے اختلاف کی طرف نشاندہی ہوتی ہے مثلاً آپ نے فرمایا

۱۔ بعض قرض کی ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں اور اپنا مطالبہ کرنے میں برے (سخت) ہوتے ہیں

۲۔ بعض ادائیگی میں بُرے ہوتے ہیں اور مطالبہ میں نرم ہوتے ہیں۔

۳۔ بعض ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں اور مطالبہ میں بھی اچھے ہوتے ہیں۔

۴۔ بعض ادائیگی میں بُرے ہوتے ہیں اور مطالبہ میں بھی بُرے ہوتے ہیں [۲]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مذکورہ صفتوں کی پیدائش اور اختلاف میں صرف وراثت ہی کو دخل ہے اور کسی چیز کو دخل نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے جذباتی اوصاف میں اور چیزوں کی طرح وراثت کو بھی دخل ہے جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ بچہ ہر حیثیت سے صورت و شکل میں اپنے خاندان اور والدین کے مشابہ ہو بعینہ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھے بُرے اوصاف میں وہ اپنے پیش روؤں کا مرہونِ منت ہو ؏

؏ بہت سے اجتماعیین اور نفسیین وراثت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے دلائل اس سلسلہ میں بہت دور تک چلے گئے ہیں لیکن اخلاقیاتی مباحث اور قانونِ کسب و ریاضت اتنی اہمیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کے زیادہ اہمیت دینے کی بنیاد وہ تجربہ ہے جو رصد گاہوں میں چوہے اور بندر وغیرہ حیوانات پر کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ انسان کے بارے میں ہر موقع پر یہ تجربے کس طرح قطعی و حتمی قرار دئے جا سکتے ہیں اصل یہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو جس نگاہ اور بلندی کے ساتھ دیکھا ہے بدقسمتی سے تحقیقات کی دنیا کے پاس نہ وہ بلندی ہے اور نہ وہ نگاہ جس کی بنا پر کہیں کہیں افراط و تفریط سے حفاظت نہیں ہو سکی ہے۔

[۱] ترمذی و مشکوٰۃ۔ [۲] حوالہ بالا۔

تیسرا ماحول ہے

انسان اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا اور حاصل کرتا ہے

ماحول کی دو قسمیں ہیں (۱) مادی اور (۲) اجتماعی - مادی ماحول میں زندگی کی تمام ضروریات اور تفریحات داخل ہیں مثلاً زمین - فضاء - آب و ہوا دریا - نہر - مکان - باغ وغیرہ -

اور اجتماعی ماحول میں تمام وہ چیزیں داخل ہیں جو مدنیت اور تمدن سے پیدا ہوتی ہیں اور زندگی پر اثر ڈالتی ہیں مثلاً مدرسہ - تعلیم - اخلاق - معتقدات و افکار - ادب - فن - پیشہ وغیرہ

انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے گرد و پیش کی تمام مادی و اجتماعی چیزوں کا اثر قبول کرتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ چیزیں اس کی طبیعت اور مزاج میں دخیل بن کر سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں جس کا اثر اعمال و اخلاق میں نمایاں ہوتا ہے [۱]

غور سے دیکھا جائے تو ماحول دوسرے مؤثرات سے قوی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ نفسی قویٰ اور قدرت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو نشو و نما پانے کا موقع ملتا ہے حتیٰ کہ خود وراثت ماحول سے کافی متاثر ہوتی ہے کیوں کہ جن خاصیتوں اور صلاحیتوں کو ہم کہتے ہیں کہ بطور

---

[۱] ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس مسئلہ پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جسم و اخلاق پر اقلیم درجۂ حرارت - آب و ہوا قحط و ارزانی وغیرہ سب کا اثر پڑتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں
تین چیزیں مجتمع سے الگ ہونے کے باوجود اس پر بہت اثر کرتی ہیں (۱) اقلیم (۲) جغرافیانہ ماحول (۳) مذہب ..
اجسام بشری اور اخلاق انسانی میں حرارت کے مختلف درجوں (اقالیم) کا اثر پڑتا ہے (مقدمہ ابن خلدون المقدمۃ الخامسہ وغیرہ)
لیبان نے مادی ماحول کو کمتر درجہ کا مؤثر قرار دیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے "آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود و حالات اور مقامی خصوصیات کا اثر صرف اس وقت پڑتا ہے جب کوئی قوم اپنے دور تکوین میں ہوتی ہے اور اس کے قدیم موروثی اخلاق کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے قدیم قوموں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے" البتہ اجتماعی ماحول کو کافی اہمیت دی ہے مثلاً مذہب کے بارے میں کہتا ہے "تاریخ کے ابتدائی زمانہ سے آج تک ہر نظام حکومت اور ہر نظام تمدن کا سنگ بنیاد مذہبی عقاید کی سطح پر رکھا گیا ہے ...... مذہب اس سرعت کے ساتھ اخلاق پر اثر ڈالتا ہے کہ اس معاملہ میں عشق کے سوا کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے (انقلاب الامم ص ۱۳ و ۳۸ و ۱۳۰ و ۱۳۱)
لیکن لیبان کے علاوہ ارسطو - بقراط - ابن سینا - ادیب - جاحظ - فیلسوف کندی (تیسری صدی ہجری) اور
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وراثت منتقل ہوتی ہیں، اگر ان کی تحلیل کی جائے تو اکثر و بیشتر حصہ ماحول کا پیدا کردہ دکھائی دے۔

ماحول کے قوی اثر ہوتے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ بسا اوقات بازاری اور بداخلاق لوگوں کے بچے عمدہ ماحول کی بدولت علم و اخلاق میں عظیم الشان ترقی حاصل کر لیتے ہیں اسی طرح مہذب و با اخلاق لوگوں کے بچے خراب ماحول کی بنا پر خاندانی اوصاف تک کھو بیٹھتے ہیں [۱]

قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیات میں ماحول کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن حکیم سے ماحول کا ثبوت

والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لایخرج الا نکدا ۷/۵۸

اور جو پاکیزہ شہر ہے رب کے حکم سے وہاں سبزہ نکلتا ہے اور جو خراب ہے نہیں نکلتا ہے مگر ناقص۔

نبات کا ماحول زمین اور اس سے متعلق اشیا ہیں جب یہ اچھی مل گئیں تو اس کی سرسبزی و تروتازگی عجیب و غریب سماں پیدا کر دیتی ہے اور جب یہ چیزیں خراب اور ناقص ہوئیں تو اس کے ہر وصف میں نقصان اور خرابی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔

واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنٰھا تدمیرا ۱۷/۱۶

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوش حال لوگوں کو "حکم" دیتے ہیں (احکام پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ تعمیل کرنے کے بجائے نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں پس ان پر عذاب کا قانون لاگو ہو جاتا ہے اور پاداشِ عمل میں انھیں ہلاک و برباد کر ڈالتے ہیں۔

"مترفیھا" میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جن کا اثر عوام پر پڑتا ہے خواہ وہ مذہبی و سیاسی لیڈر ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مؤرخ مسعودی چوتھی صدی ہجری اور فرانسیسی مصنف "مونٹیسکو" وغیرہ نے نظریۂ اقلیم کو کافی اہمیت دی ہے اور ان میں بعضوں نے تو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے (ملاحظہ ہو ابن خلدون از ذاکر صاحب) [۱] اسی بنا پر پستالوزی کہتا ہے کہ ہم نے جہاں تک دیکھا انسان کو اپنے ماحول کے اثر سے بنتے دیکھا (فلسفۂ تمدن و تعلیم)

باسرمایہ دار خوشحال لوگ یا ان کے علاوہ کوئی ہو جب یہ بڑی ناک والے کوئی کام کرتے ہیں تو لازمی طور سے اس کا اثر جمہور پر پڑتا ہے اس بنا پر یہ لوگ تربیت و اصلاح کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔

آیت میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کیونکہ جب یہ لوگ نافرمانی اور سرکشی پر اتر آتے ہیں تو ان کی وجہ سے پورا ماحول بگڑ جاتا ہے اور ان کے زہر سے پوری فضا مسموم ہو جاتی ہے اور بالآخر تباہی بربادی کا پروانہ آجاتا ہے خراب ماحول کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ "احسن تقویم" پر پیدا کیا ہوا انسان اس کی بدولت "اسفل سافلین" میں جا گرتا ہے

ثم رددناہ اسفل سافلین[۹۶]　پھر ہم نے اس کو سب سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا۔

یہ مطلب نہیں کہ انسان ماحول کے آگے بالکل بے بس اور مجبور ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان قدرت کی دی ہوئی صلاحیت عقل اور ارادہ کی طاقت سے کام نہ لے تو قوت بہیمیہ اور شہوانیہ کو برگ و بار لانے کا خراب ماحول کافی موقع فراہم کر دیتا ہے اور بالآخر اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔

رسول اللہ کی حدیث سے ماحول کا ثبوت	درج ذیل حدیث سے ماحول کی قوت کا ثبوت ملتا ہے۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ[۱]

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین (ماحول) اس کو یہودی نصرانی اور مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔

مادی ماحول کا ثبوت اس حدیث میں ہے۔

ان اللہ خلق آدم من قبضۃ قبضھا من جمیع الارض فجاء بنو آدم علی قدر الارض فجاء منھم الاحمر والابیض والاسود وبین ذلک والسھل والحزن والخبیث والطیب[۲]

اللہ نے دنیا کے ہر حصہ سے مٹھی بھر خاک لی اور اس سے آدم کو پیدا کیا اس لئے انسان زمین کے اختلاف سے مختلف رنگ اور مختلف اخلاق کے پیدا ہوئے بعض سرخ بعض سفید بعض سیاہ بعض متوسط درجہ کے اور بعض نرم اور بعض سخت بعض اچھے اور بعض برے۔

مختلف آب ہوا اور مختلف ملک کے باشندوں میں رنگوں کا اختلاف تو ظاہر ہے طبیعت مزاج اور اخلاق کے مظاہرہ میں بھی کافی فرق ہوتا ہے جس کا سمجھنا ہر تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے جس طرح شہری اور دیہاتی کے مزاج میں نسبتہً نرمی اور خشونت وغیرہ کا فرق ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا۔

من سکن البادیۃ جفا[۳]　جس شخص نے دیہات میں سکونت اختیار کی اس کے مزاج میں سختی آگئی۔ (باقی آئندہ)

[۱] بخاری و مسلم [۲] ترمذی و ابو داؤد [۳] ابو داؤد و ترمذی

ادبیات

نالۂ سحری

(از جناب اکمؔ مظفرنگری)

جنون و عقل کے ہیں شیوہ ہائے فتنہ گری
مذاقِ بخیہ گری ہو کہ شغلِ جامہ دری

یہ بے خودیٔ شبِ عیش تابکے جاگو
ہوا طلوع وہ دیکھو سپیدۂ سحری

نگاہِ ناز کے سیراب ہو چکے ٹھنڈے
تڑپ رہا ہے ابھی تک خرابِ کم نظری

قدم قدم پہ نہ مجھ کو نویدِ منزل دے
حریفِ شوق نہ بن مدعیٔ راہ بری

کچھ انقلاب کے آثار ہیں فضاؤں میں
الٰہی اور بڑھے عمرِ نالۂ سحری

تو صبح و شام اسیری کی روداد نہ پوچھ
قفس ہے میں ہوں اور اک عالمِ شکستہ پری

سرشکِ غم ہے ادھر ضوفگن سرِ مژگاں
ادھر فلک پہ ہے روشن ستارۂ سحری

تری نگاہِ تجلی شناس ہو تو دیکھ
پسِ حجابِ دو عالم کسی کی جلوہ گری

زمیں پہ دیکھئے کب تک جگائے گا فتنے
نجومِ چرخ کا راتوں کو شوقِ نغمہ گری

نگاہِ شوق تو کم حوصلہ نہیں لیکن
فریبِ جلوہ سے بڑھتی ہے میری بے خبری

گلوں پہ کون گلستاں میں اعتبار کرے
جنونِ عشق کی کرتے ہیں خود یہ پردہ دری

نفس نفس میں ہیں بیدار آتشیں نغمے
لہو ترنگ ہے ہر لحظہ کاوشِ جگری

تو میرے سوزِ جگر کے تصرفات کو دیکھ
برنگِ شعلہ بھڑکتی ہے آنسوؤں کی تری

جو ماورائے تعین گیا ہے لے کے مجھے
کسے خبر ہے کہ وہ تھا کمالِ بے خبری

اسی سے عزمِ جواں میں ہوئی خودی پیدا
بنا گئی ہے مجھے تو فغاں کی بے اثری

مریضِ عشق نہ کیوں بے نیازِ درماں ہو
کہ راس نہ آسکی اس کو سعیٔ چارہ گری

نگاہِ شوق کو مژدہ کہ بعد مدت پھر
فرازِ طور پہ ہے اہتمامِ جلوہ گری

کھلیں گے اس پہ وجود و عدم کے رازِ نہاں
اداشناسِ حقیقت ہے جس کی دیدہ وری

تو مصلحت پہ نہ کر راہِ عشق میں تکیہ
یہاں تو کام اگر آئے گی تو بے جگری

ہنر فروش مری پستیوں کو دیکھتے ہیں
بہت بلند ہے میرا مقامِ بے ہنری

بتاؤ بارِ امانت کو کون اٹھا لیتا
اگر قبول نہ کرتا اکمؔ یہ دردسری

"فرمودۂ قرآں!"

(از زہرۂ سخن سیدہ اختر)

اے مردِ مسلماں ارے او مردِ مسلماں؟
اے بے خبر عظمت "فرمودۂ قرآں"!

اے وہ کہ نہیں جس کو کچھ آگاہیٔ امروز!
اے وہ کہ جسے مشکلِ فردا نہیں آساں!

اے وہ کہ حقیقت ہے فقط جس کی فسانہ!
اور پھر وہ فسانہ نہیں جس کا کوئی عنواں!

اے وہ کہ جو تھا حق و صداقت کا طرفدار!
ہے آج وہی حق و صداقت سے گریزاں!

اے وہ کہ سبک قلب و سبک حال و سبک تال!
اے وہ کہ گراں گیر و گراں بخت و گراں جاں!

سن گوش توجہ سے ذرا وقت کی آواز!
"کیا ہو گئی وہ جرأت بے باک مسلماں"؟

کیا ہو گئے وہ حق و صداقت کے ترانے؟
کیوں بجھ سی گئی آج تری مشعلِ ایماں؟

کیوں جوش نہیں رقص نہیں تیرے لہو میں؟
کیوں تیری نگاہوں میں نہیں روحِ گلستاں؟

کیوں حادثۂ وقت سے بیدار نہیں تو؟
کیوں شورشِ امروز نہیں تیری رگِ جاں؟

تو نے نہ سنا گوشِ توجہ سے کسی دن؟!
اختر ہوئی تیرے لئے کیا کیا نہ غزل خواں؟

غزل

(از جناب شمس نوید)

قسمت کوئی راز نہیں ہے
کیا کوشش غمّاز نہیں ہے!

غم سے ملی راحت کی تمنّا
سوز ہے پہلے ساز نہیں ہے

درسِ محبت دل ہے کہ جس میں
دھڑکن ہے آواز نہیں ہے

اشکِ خموشی خونِ تبسّم
غم کا کوئی انداز نہیں ہے

عشق وہاں تک خام سمجھئے
حسن کو جب تک ناز نہیں ہے

ایسی بھی ہے ایک کہانی
جس کا کوئی آغاز نہیں ہے!

شوق وہاں تک لے اڑتا ہے
اپنی جہاں پرواز نہیں ہے

نور بھی اک ظلمت ہے جب تک
چشمِ بصیرت باز نہیں ہے

عجز کے سجدوں نے سمجھایا
عظمت سر افراز نہیں ہے

رنجِ شکستِ نغمہ ہے لیکن
رنج شکستِ ساز نہیں ہے

میرے نغمے تیری عطا ہیں
شعر مرا اعجاز نہیں ہے

تبصرے

علم الصیغہ از مولانا ابوعبیدہ صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؎ پتہ :- امین بک ڈپو - پیلی کوٹھی - بنارس - یوپی -

علم الصیغہ فارسی زبان میں عربی علم الصرف کا مشہور رسالہ ہے اس کے مصنف مولانا مفتی عنایت احمد صاحبؒ اپنے زمانہ کے صرف مشہور فاضل اور مختلف علومِ دینیہ وعصریہ کے جید عالم و متبحر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ مجاہد بھی تھے اور اسی جہاد فی سبیل الوطن کی پاداش میں انڈمان میں نظربند کر دئے گئے تھے، چنانچہ یہ رسالہ بھی موصوف نے اسی زمانہ نظربندی میں لکھا تھا۔ ۱۲۷۹ھ میں ۱۵ برس کی عمر میں جدہ کے قریب جہاز کو جس میں مولانا رہائی کے بعد وطن آنے کے لئے سفر کر رہے تھے سخت حادثہ پیش آیا اور مولانا نے غرق ہو کر جام شہادت نوش فرمایا۔ مولانا کے علم الصیغہ کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ کوئی مدرسہ عربیہ اس کے درس سے خالی نہ ہوگا۔ چوں کہ آج کل فارسی زبان کا ذوق مفقود ہوتا جاتا ہے اس لئے مولانا ابوعبیدہ صاحب نے اس کو اردو کا جامہ پہنادیا ہے تاکہ فقط اردو خواں بھی اُس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ ترجمہ بہت صاف سلیس اور عام فہم ہے شروع میں مترجم کے قلم سے اصل مصنف کتاب کے حالات اور اُن کے علمی کمالات کا ذکر ہے امید ہے کہ ضرورت مند اصحاب اُس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

۱- ننھا سردار
۲- اصحاب کہف
۳- بھٹکا ہوا شکاری
۴- معمل زر
۵- سونے کا دریا

از مولانا عبید الحق صاحب ضخامت از ۴۰ تا ۴۶ کتابت وطباعت اعلیٰ تقطیع خورد قیمت ۶؍ پتہ :- الملکیۃ العلمیہ ۱۵- لیک روڈ- لاہور دار المعارف مصر نے بچوں کے لئے اخلاقی اور مفید کہانیوں کا ایک مفید سلسلہ چھاپا ہے جس کو عربی زبان کے تین ادیبوں نے مرتب کیا ہے۔ یہ پانچوں رسالے انھیں عربی رسالوں کا اردو ترجمہ ہیں۔ ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے جس کو بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور حکایات سب اخلاقی بھی ہیں اور بچوں

کی عام معلومات میں اضافہ کرنے والی بھی ہیں۔ اس لئے اردو زبان کے بچے اور بچیاں ان سے بے تکلف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سچی باتیں حصہ چہارم | از انوار الحسن صاحب ایم۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۶؍ پتہ :- وہی مذکورۂ بالا۔

یہ رسالہ بھی بچوں اور بچیوں کے لئے لکھا گیا ہے جس میں اسلامی اخلاق و کردار پر چند سبق ہیں اور ہر سبق کے آخر میں سبق سے متعلق کچھ سوالات بھی ہیں۔ یہ رسالہ مکاتب کے نصاب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

حضرت ابوذر غفاری اشتراکی نہ تھے | از جناب اختر علی صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۰؍ پتہ :- مکتبۂ جامعۃ الٰہیات چمن گنج کانپور۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابو ذر غفاری بھی کمیونسٹ تھے۔ یہ رسالہ اسی بات کی تردید میں لکھا گیا ہے۔ حضرت ابو ذر غفاری پر مولانا مناظر احسن گیلانی نے الفاسم دیوبند کے دور اول میں مسلسل ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو بعد میں مولوی محمد طاہر مرحوم نے کتابی صورت میں چھاپ دیا تھا زیر تبصرہ رسالہ میں حضرت ابو ذر غفاری کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد اشتراکیت اور اسلام کا فرق واضح کیا گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آپ اشتراکی نہیں تھے ہمارے خیال میں حضرت ابو ذر اصطلاحی معنی کے اعتبار سے اشتراکی یا کمیونسٹ تو یقیناً نہیں تھے۔ لیکن بہر حال معاشی اور اقتصادی مسائل میں سوشلسٹ اصول کے حامی ضرور تھے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب نمبر کیا ہے | از جناب حاجی محمد زبیر صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ؍ پتہ :- فرحت منزل بدر باغ۔ علی گڈھ

حاجی محمد زبیر صاحب مسلم یونیورسٹی کے بہت پرانے اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔ انھوں نے اس دیرینہ تجربہ سے دوسرے لوگوں کو مستفید کرنے کی غرض سے فن لائبریری پر مختلف عنوانات کے ماتحت چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھنے کا پروگرام بنایا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو واقعی

بقول مصنف اُردو میں پہلی کوشش ہے اس میں کتاب نمبر کی ضرورت۔ اس کا کام۔ اس کی ایجاد۔ بشیرالدین اسکیم وغیرہ پر گفتگو کرنے کے بعد کتاب نمبر بنانے کا قاعدہ اور اُس کے اصول بڑی شستہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں اس سے متعلق بعض مفید مشورے دئیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بقامت کمتر اور بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ فن لائبریری کے طلبار کے علاوہ عام اربابِ ذوق جو اپنی چھوٹی موٹی لائبریریاں رکھتے ہیں اُن کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔

آج کل کا موسیقی نمبر مرتبہ جناب عرشؔ ملسیانی و مظفر شاہ صاحبان ضخامت ۱۴۰ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت عمر پتہ:۔ پبلیکیشن ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی۔

یہ حکومت ہند کے مشہور و معروف اُردو ماہنامہ آج کل کا خاص نمبر ہے جس میں فنِ موسیقی کی تاریخ۔ اُس کی مختلف قسمیں اور شاخیں۔ اُن کی خصوصیات، عہدِ حاضر کے مشہور اربابِ فن کا تذکرہ مع ان کے فوٹو کے۔ اس فن کے مختلف مرکز اور ان کے فنی مختصات ان سب پر سیر حاصل مضامین نظم و نثر ہیں۔ جو لوگ اس فن کے متعلق نظری معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ نمبر بڑے کام کی چیز ہے اور اس حیثیت سے آج کل کے گذشتہ نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی اپنے موضوع اور مقصد میں بہمہ وجوہ کامیاب ہے اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کا فن موسیقی اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے اور اُس کی شاخیں اس قدر پھیلی ہوئی ہیں کہ کسی ماہنامہ کا ایک نمبر اُن سب کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

اسلامی زندگی مع اسلامی دوامی جنتری مرتبہ جناب نسیم احمد صاحب علوی تقطیع خورد ضخامت ۵۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ مدرسہ نور محمدیہ قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر۔ یوپی

اس کتاب میں وہ اسلامی آداب دفعہ وار بیان کئے ہیں جن کی ضرورت ہر مسلمان کو عبادات معاملات اور معاشرت میں پیش آتی ہے آخر میں ایک باب ہے جس میں اخلاقی تعلیمات سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سلیس اور عام فہم اُردو میں لکھ دئیے گئے ہیں، ساتھ ہی

ایک اسلامی دوامی جنتری بھی ہے جس میں ہر انگریزی مہینہ پر طلوع و غروب وغیرہ کا وقت بیان کیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے یہ جنتری ہر ایک مقام کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اتر پردیش کے اکثر مقامات میں یہ کارآمد ہوگی اور دوسرے مقامات کے لوگ عرض البلد کو دیکھ کر اوقات کا تعین کر سکتے ہیں۔

سلاطینِ ہند کی علم پروری | از جناب محمد حفیظ اللہ صاحب تقطیع خورد کتابت و طباعت متوسط ضخامت ۱۶۸ صفحات قیمت غیر مجلد عہ پتہ مسلم اکاڈمی۔ پھلواری شریف (پٹنہ)

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اس ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات کے انمٹ نقوش ہیں انھوں نے جہاں اور خدمات انجام دیں ایک بڑی خدمت یہ بھی کہ بلا تفریق مذہب و ملت انھوں نے ہر قوم کے علما اور فضلار کی قدردانی کی ان کے خوانِ کرم سے جہاں عربی و فارسی کے علمار نے فیض اٹھایا۔ سنسکرت اور بھاشا کے فضلار بھی اس سے محروم نہیں رہے ان کی ان علمی قدردانیوں کے صدہا واقعات بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں بعض واقعات کو خاندان وار مرتب کر دیا گیا ہے۔ حاشیہ میں ماخذ کا حوالہ بھی مذکور ہے۔ زبان آسان اور عام فہم ہے۔ اُردو سے زیادہ ایسی کتابوں کی اشاعت ہندی میں ہونی چاہیے۔

وحی الٰہی

تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم۔ اے رفیق ندوۃ المصنفین

وحی اور اس سے متعلق مباحث پر محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر ایسے دل پذیر و دل کش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے اور حقیقتِ وحی سے متعلق تمام خلشیں صاف ہو جاتی ہیں۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، کتابت نفیس ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی، طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ قیمت تے مجلد للعہ

برہان

جلد ۳۸ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۵۷ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

خدا کا شکر ہے قلم کا مسافر "صدیق اکبر" یعنی سیرت حضرت ابوبکرؓ صدیق کی تسوید و ترتیب کی جس راہ میں دو برس سے گامزن تھا اب اس کی منزلِ آخر آ لگی ہے۔ کتابت شروع ہو چکی ہے، امید ہے کہ اکتوبر نومبر تک ندوۃ المصنفین کے معہود کتابی سائز کے ساڑھے پانچ سو چھ سو صفحات پر آئے گی۔ اس کتاب کے چند صفحات "صدیق اکبر سے حضرت علی کی بیعت" اور "مالک بن نویرہ کا واقعہ" کے عنوان سے برہان کی دو اشاعتوں میں نکل چکے ہیں جن کو ملاحظہ فرما کر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اڈیٹر "معارف"، ڈاکٹر زبید احمد کراچی۔ اور جناب شبیر احمد خاں غوری ایم۔ اے ال۔ ال۔ بی۔ الہ آباد نے تحسین و ستائش کے خطوط لکھے اور بڑی داد دی تھی۔ پوری کتاب اسی نہج اور اسی اسلوب پر لکھی گئی ہے۔ عہد صدیقی کا کوئی تاریخی۔ فقہی اور سیاسی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی گرہ کشائی نہ کی گئی ہو۔ اور کوئی خلا نہیں ہے جسے خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر پُر نہ کیا گیا ہو۔ بہرحال بحث و تحقیق تنقید و تحیص۔ جامعیت مباحث اور وسعت ماخذ کے اعتبار سے کتاب کس پایہ کی ہے؟ اس کا فیصلہ تو اربابِ علم و تحقیق ہی کریں گے۔ البتہ ایک بات جو مصنف بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہے یہ ہے کہ جس روشنائی سے اس کتاب کی تسوید ہوئی ہے اس میں چند اشکہائے نیم شبی اور چند قطرہائے خونِ جگر بھی شامل رہے ہیں:-

ز چشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

اس کتاب کو شروع کرنے سے پہلے "الاسلام" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھنی شروع کی تھی اور متعدد اجزا لکھ بھی لئے تھے کہ اچانک سیرتِ صدیقی لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور قلم ہمہ تن ادھر مصروف ہو گیا اب اس کا آخری باب بھی ہو جائے تو "الاسلام" کو پھر شروع کرنے کا ارادہ ہے ومنہ التوفیق وعلیہ التکلان

مولانا سید شاہ فخر الدین احمد صاحب کی وفات حسرت آیات سے پچھلے دنوں صدر امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ کی جو مسند خالی ہوئی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک عظیم الشان اور عام جلسۂ علما نے اب اس کے لئے مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری کا متفقہ طور پر انتخاب کیا ہے۔ موصوف علما و عملاً جس طرح خانقاہِ رحمانیہ کی روایات کے حامل ہیں۔ اسی طرح امید ہے کہ امارتِ شرعیہ کی قدیم روایات بھی اُن کے دم سے نہ صرف یہ کہ زندہ رہیں گی بلکہ اور ترقی کریں گی۔ اس دور میں اس سے بہتر کوئی اور انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم مولانا کو اس اعزاز پر مبارک باد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے باحسن وجوہ عہدہ برآں ہوسکیں۔

افسوس ہے پچھلے دنوں دہلی کے مشہور صاحب خیر بزرگ حاجی محمد اسمٰعیل صاحب جیون بخش نے عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پائی۔ موصوف مشہور فرم جیون بخش کے سب سے بڑے حصہ دار اور اس کے روح رواں تھے۔ لیکن وہ جتنے متمول اور صاحب ثروت تھے اس سے کہیں زیادہ عابد و زاہد متقی اور پرہیزگار تھے۔ دینی اور خیراتی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ نہایت خندہ جبیں اور صاحبِ باطن تھے۔ چہرہ پر نور برستا تھا۔ تونگری کے باوجود فقر و درویشی ان کا شعار تھا۔ اب ایسے دین اور دنیا کے جامع کم ہی ہوں گے۔ حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ابرار و صلحا کے ساتھ حشر فرمائے۔ آمین

ایک اطلاع ہے کہ رے لی جس لیڈرز نامی کتاب کے مصنفین نے مرزا البشیر الدین محمود صاحب کو ان کے توجہ دلانے پر ایک خط لکھا ہے جس میں کھلے دل کے ساتھ ان عبارتوں اور فقروں پر اظہار افسوس کیا ہے جن سے مسلمانوں کو دکھ پہنچا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ غلط ہو تو اب جب کہ کتاب مذکور کے مقدمہ نویس پہلے ہی اعلان برأت کر چکے اور مصنفین نے اب معافی مانگ لی۔ کوئی بتائے کہ اس سلسلہ میں جو ہنگامے ہوئے اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو جانی اور مالی دونوں قسم کا

نقصان پہنچا تو ان سب کا وبال کس کے سر ہوگا؟ حبِ رسول میں دیوانگی اور جوش مبارک اور صد مبارک! لیکن اسلام نام ڈسپلن کا ہے، اور ڈسپلن اسی وقت پایا جاسکتا ہے جب کہ شدید سے شدید اشتعال کی حالت میں بھی دماغی توازن اور ہوش و خرد کو مغلوب نہ ہونے دیا جائے۔ اگر مسلمان اس نکتہ کو پہچان لیں تو آج ان کی بہت سی مشکلات رفع ہوسکتی ہیں۔

شاہانِ مغلیہ کا شراب سے اجتناب

از

جناب ڈاکٹر قاضی محمد ابراہیم ضیا ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ بی ۔ ٹی ۔
("شعبۂ فارسی اور اسلامک کلچر" اسماعیل کالج۔ بمبئی)

دنیا کی ہر مذہب ۔ قوم نے شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی مذمت کی ہے اور اس کے استعمال سے پرہیز کیا ہے ۔ ہر مذہب نے اسے ممنوع قرار دیا ہے ۔ بڑے بڑے حکمرانوں نے عملاً اس کی پیروی کی اور اپنے قلمرو میں حتی الامکان کوششیں کیں کہ لوگ شراب سے دور رہیں ۔ اس قسم کی مثالیں تاریخی اور دیگر کتابوں میں جابجا ملتی ہیں ۔ ان حکمرانوں میں سلاطینِ مغلیہ خاص اہمیت کے مالک ہیں ۔

ہندوستان کے مغل حکمرانوں میں سب سے پہلے بابر نے شراب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بہ حیثیت بانیٔ سلطنت اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اصلاحی کاموں کو پوری دلجمعی سے انجام دیتا تاہم اس قلیل عرصے میں اس نے جو بھی اصلاحی کام کئے ان میں شراب بندی ایک اہم کارنامہ ہے ۔ گو بابر کو دنیا سے گذرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا لیکن اس کا یہ کارنامہ آج بھی صفحۂ ہستی پر دائم و قائم ہے اور زمانہ بابر کو ایک اچھا حکمراں، کامیاب جنرل اور ہوشیار سیاستدان کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ریفارمر اور مصلحِ قوم کے بھی یاد کرتا ہے ۔

بابر اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط سے مضبوط پایہ پر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے بعد بھی یہ حکومت سربراقتدار اور دائم و قائم رہے اور اس کے جانشین ہر ممکن برائیوں سے بچکر خدمتِ خلق سے مشرف ہوتے رہیں وہ حکومت کو صرف طاقت اور زور کے بل بوتے پر کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ زیرِ اقتدار باشندگانِ مملکت کے دلوں میں گھر کر کے انھیں اپنانا چاہتا تھا ۔ ساتھ ہی ساتھ بطور مصلح کے وہ ان میں سے وہ تمام خرابیاں دور کرنا چاہتا تھا جن کی وجہ سے وہ گوناگوں برائیوں

میں گھرے پڑے تھے۔ اس کی نظر میں ان تمام برائیوں کی جڑ شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں تھیں جن کا استعمال بڑی حد تک عام تھا۔

یہ خیال کرنا کہ بابر نے پی ہی نہیں ایک بڑی تاریخی غلطی ہے لیکن اس نے کب کیوں اور کیسے پی اور کب کیوں اور کیسے اس سے توبہ کر کے اسے ممنوع قرار دیا یہ بھی تاریخی انکشاف سے کچھ کم نہیں بابر کو اوائل عمر ہی سے شراب سے نفرت تھی۔ اس کا لڑکپن اور اس کے بعد کا ایک عرصہ اس سے گریز کرنے میں گذر گیا۔ تزک بابری میں وہ خود لکھتا ہے کہ ایک روز وہ اپنے ایک عزیز مظفر مرزا کے یہاں مہمان تھا۔ مرزائے موصوف نے مہمان نوازی میں کسی قسم کی کمی باقی نہ رکھی تھی۔ دوران قیام میں دوستوں اور عزیزوں کے مکرر اصرار پر اس نے پہلی بار شراب سے اپنے لبوں کو آشنا کیا[1]۔ چوں کہ بادل ناخواستہ اس نے شراب پی تھی اس لئے وہ جب بھی شراب پیتا یا اس قسم کی مجلس میں شریک ہوتا ہر وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا اور وہ شراب کو چھوڑ کر تنہائی میں چلا جاتا۔ غالباً اس قسم کے رویہ سے اس کے امرا اور درباری بھی اس کے سامنے شراب نہیں پیتے تھے۔ بقول بابر یہ لوگ حتی الامکان شراب سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتے یہاں تک کہ روز پینے کی بجائے مہینہ میں ایک بار شراب پیتے لیکن اس وقت بھی وہ اس قدر احتیاط برتتے کہ شہنشاہ کو خبر نہ ہو۔ بابر نیز رقمطراز ہے کہ وہ جب شراب پیتے تو کمروں کے دروازے بند کر لیتے[2]۔ بابر کی شراب سے نفرت روز بروز بڑھتی گئی اس لئے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ وہ شراب سے توبہ کر لے لیکن اسے اپنے ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی دختر رز سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ع بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر۔ بالآخر بابر نے خلوص نیت سے ٹھان لی کہ شراب سے توبہ کرے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے ترک کر دے پس بابر کے اپنے بیان کے مطابق بروز دوشنبہ ۲۳ جمادی الاول ۹۳۳ھ اسے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ وہ ہر وقت شراب سے مغلوب آ کر اپنے ارادوں میں ناکامیاب ہوتا رہا ہے[3]۔ بابر کا شراب سے توبہ کرنا بڑا پر لطف اور سبق آموز واقعہ ہے جسے بابر خود اپنی تزک میں بیان کرتا ہے۔ جوں ہی اس نے ارادہ محکم کر لیا اپنے

---

[1] تزک بابری جلد دوم انگریزی ترجمہ ص ۱۱-۱۲ [2] ایضاً ص ۱۳ [3] ایضاً صفحہ ۲۸

نوکروں کو حکم دیا کہ شراب پینے اور شراب رکھنے کے تمام آلات کو ایک جا اکٹھا کریں۔ اس حکم کے فوراً بعد گوناگوں قسم کی بے شمار و بے بہا صراحیاں، پیالے اور دیگر آلات بابر کے سامنے جمع کر دیئے گئے ان میں سے بیشتر آلات بہترین آرٹ کے نمونے تھے بقول بابر یہ آلات سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے[1] بابر نے بعد ازاں حکم دیا کہ ان آلات کو توڑ ڈالیں۔ اس شاہی فرمان کی تعمیل فوراً کی گئی اور بیش بہا صراحیاں، پیالے آن کی آن میں توڑ ڈالے گئے چوں کہ یہ معاملہ توبہ کا تھا اس لئے بابر کے حکم کے مطابق ان ٹکڑوں کو غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیا گیا۔ بابر کی توبہ کا اثر اس کے عزیزوں اور درباریوں پر بھی ہوا تین سو کے قریب لوگوں نے فوراً شراب سے توبہ کی اور اسے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ بابر نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی وہ اپنی رعایا کو بھی اس برائی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک فرمان جاری کیا اور اپنی مملکت میں اعلان کر دایا اور شراب کی آمد پر شراب سازی پر شراب فروشی پر اور شراب نوشی پر قید لگا دی تاکہ اس کی رعایا شراب سے پیدا ہونے والے خطروں سے محفوظ رہ سکے

شاہانِ مغلیہ میں اکبرِ اعظم کا نام ہمہ گیر شہرت کا مالک ہے اکبر ایک کامیاب حکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا سوشل ورکر اور رفارمر بھی تھا اس نے اپنی رعایا کی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے میں حتی الامکان کوشش کی جیسا کہ تاریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے۔ جہالت کے باعث وہ جن برائیوں کے مرتکب ہو چکے تھے ان سے انھیں نجات دلانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا اکبر کی اصلاحات میں ستی کی رسم بند کرنا ہی نہیں تھا بلکہ دیگر اصلاحات بھی شامل تھے مثلاً بھکاریوں کی اصلاح فاحشہ عورتوں کی اصلاح کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کی روک تھام وغیرہ کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کے متعلق جو اقدام اکبر نے اٹھائے تھے ان کا ذکر بدایونی یوں کرتا ہے:

"ہم چنیں پسر را بیشتر از شانزدہ سالگی و دختر را پیش از چہاردہ سالگی نکاح روا نباشد"[2]

اکبر کی ان اصلاحات میں سب سے زیادہ اہم شراب بندی تھی۔ شراب سے متنفر ہونے کے کئی اسباب

---

[1] تزک بابری جلد دوم انگریزی ترجمہ صفحہ ۲۸۰ [2] منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۰۶ ذکر شدہ دیگر اصلاحات کی تفصیل کے لئے میرا بدایونی سے متعلق مضمون معارف اپریل تا اگست ۱۹۵۱ ملاحظہ فرمائیں۔

تھے سب سے پہلے اسلام نے اس چیز کو ممنوع قرار دیا جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ذیل سے ظاہر ہے:
"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ...... رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" چوں کہ اکبر خود مسلمان تھا اور اسلام اور اس کے پیغمبر پر اس کا یقین کامل تھا جیسا کہ ذیل کی عبارت سے جو اس کے ایک خط کا اقتباس ہے ظاہر ہوتا ہے

"الحمد للہ والمنۃ کہ ہمیشہ پیش دہد دانش و بنیش فرمودہ خدا و پیغمبر او بودہ و روز افزونی بخت ہمایوں گواہ حال بس ست"[1]

لہذا آیت مذکور سے متاثر ہو کر اس نے شراب کی روک تھام کے لئے مختلف قوانین جاری کئے۔ دوسرے یہ کہ اس نے شراب کے خراب اثرات پر زیادہ غور و فکر کیا کئی لوگ اس کا شکار بن کر تباہ و برباد ہوئے۔ چوں کہ اکبر اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کا حد سے زیادہ خیال رکھتا تھا جیسے ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے اس لئے وہ لوگوں کو شراب نوشی سے اور اس کے استعمال سے باز رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنی زندگی خوش حالی سے گذار سکیں۔ ذیل کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کو مدِ نظر رکھتا تھا:

"للہ الحمد کہ از عنوانِ جلوس بر اورنگ فرمانروائی تا حال کہ سنہ عاشرہ است از قرنِ ثانی و اوائل انکشاف صبح اقبال و میدار ابتسام بہار اجلال است ہمگی نیت حق اساس نیاز مند درگاہ الٰہی آنست کہ اغراض خود منظور نداشتہ ہموارہ در القیام و انتظام جہانیان کوشد و از میامن ایں کردار سعادت پرتو مملکت وسیع ہندوستان کہ ہر چندیں فرمانروایان والا شکوہ انقسام یافتہ بود در حیطۂ تصرف و احاطہ اقتدار ما در آمد"[2]

علاوہ ازیں اکبر کے لڑکے خود شراب کے عادی ہو چکے تھے اور اس طرح اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے پر بضد تھے۔ لڑکوں کی ان حرکات سے یقیناً باپ کا دل کڑھتا ہوگا اور شراب سے نفرت اس کے دل میں روز بروز گھر کرتی ہوگی اور اسے اس سے متنفر بناتی ہوگی۔ اس ضمن میں اکبر کے

---

[1] انشاء ابو الفضل دفتر اول ص۲۲　[2] ایضاً ص۷

لڑکوں مراد اور دانیال کی موت کا ذکر برمحل اور قابلِ ذکر ہے۔ مراد اور دانیال دونوں شراب کے سخت عادی ہو چکے تھے یہاں تک کہ ان کی موت کا باعث بھی شراب ہی ہوئی۔ مراد کی موت کا بیان محمد حسین آزاد اپنے خاص طرز میں اپنی مشہورِ عالم تصنیف دربار اکبری میں یوں کرتے ہیں:

"مراد ۹۷۸ھ میں ۱۰ محرم کو فتح پور کے پہاڑوں میں پیدا ہوا تھا اور اسی واسطے اکبر پیار سے اسے پہاڑی راجہ کہا کرتا تھا مہم دکن پر سپہ سالار ہو گیا۔ شراب مدت سے گھلا رہی تھی اور ایسی منہ لگی تھی کہ چھٹ نہ سکتی تھی وہاں جا کر اور بڑھ گئی اور بیماری بھی حد سے زیادہ گذر گئی آخر ۱۰۰۷ھ میں ۳۰ برس کی عمر میں مراد نامراد ونا شاد جوان مرگ دنیا سے گیا۔ تاریخ ہوئی ؎ از گلشن اقبال نہالے گم شد" [۱]

اکبر کے دوسرے لڑکے دانیال کی موت بھی شراب کی وجہ سے واقع ہوئی تھی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دانیال شراب کا بڑا دلدادہ تھا چوں کہ اکبر مراد کی موت سے بہت رنجیدہ ہوا تھا اس لئے دانیال کی شراب سے دل بستگی اسے اور بھی زیادہ رنجیدہ اور مغموم بنا دیتی۔ اکبر کو اس بات کا خوف تھا کہ دانیال بھی شراب کی وجہ سے موت کا شکار نہ بن جائے۔ اس نے ہر ممکن طریقہ سے سمجھایا اور اس سے قسم لے لی کہ وہ شراب ترک کردے۔ باپ کے الفاظ کا اثر دانیال پر ضرور ہوا اور اس نے شراب چھوڑ دی لیکن زیادہ عرصے تک وہ ترک شراب کو نبھا نہ سکا۔ اس نے دوبارہ شراب نوشی کی اکبر کو جب اس کی اطلاع ملی تب اس نے دوبارہ دانیال کو سمجھایا کہ وہ بھائی کی موت سے عبرت حاصل کرے اور اپنی جوانی پر رحم کرے اور شراب ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے چنانچہ مصنف اکبر نامہ کا بیان اس ضمن میں حسب ذیل ہے:

"بعرض اقدس رسید کہ شاہزادہ دانیال یک چند بنابر تاکیدات آنحضرت ازمی گساری باز آمدہ وجام برسنگ زدہ دیر نخوردن شراب قسم بفرق فرقد سائے خدیو صورت ومعنی یاد کردہ بود دریں اوان پیمان گسل شدہ باز بیادہ پیمائی افتادہ ودر خوردنِ آن آب آتش مزاج از حد اعتدال تجاوز نمود فرمان اندوزشان آں نونہال سلطنت نافذ گشت چرا برپرنائی ورعنائی خود رحم نمیکند واز واقعہ برادرِ خود شاہزادہ

[۱] دربار اکبری صفحہ ۹

سلطان مراد پند پذیر نمی شود"[1]

اکبر کے ان الفاظ کا اثر دانیال پر نہیں ہوا۔ باپ کی نصیحت کو پسِ پشت ڈال کر وہ عیش و عشرت میں ڈوب گیا جس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ اکبر کو تھا۔ اکبر نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ اکبر نے پابندی لگادی تھی کہ کوئی شخص دانیال کو شراب مہیا نہ کرے اس قسم کی پابندی کی وجہ سے شہزادہ دانیال بے چین و بے قرار ہوا۔ شراب کی عدم موجودگی نے اسے قانون شکنی اور خلاف ورزی پر مائل کیا چنانچہ اس نے شراب حاصل کرنے کے لئے ایک تجویز ڈھونڈ نکالی۔ اور شکار کے بہانے شہر کے باہر خیمہ زن ہوا۔ اس نے اپنے خاص ملازموں کو حکم دیا کہ وہ بغیر کسی کو معلوم کئے اپنے ساتھ شراب بھی لے آئیں۔ شہزادے کی خوشنودی کی غرض سے ملازموں نے بندوق کی نلیوں میں شراب بھر لی اور نیز گائے کی آنتوں میں شراب بھر کر انھیں اپنی کمر پر باندھ لیا۔ شراب ان میں عرصہ تک رہنے سے خراب ہوگئی شکارگاہ میں شہزادے نے اس شراب کو بصد خوشی پی لیا جس کی وجہ سے وہ سخت بیمار ہوگیا۔ اکبر نامہ میں اس جان لیوا بیماری کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کا ایک خراب اثر یہ بھی ہوا کہ شہزادہ کی بھوک زائل ہوگئی تاہم ایسی حالت میں بھی وہ شراب شراب کرتا رہا چنانچہ صاحب اکبر نامہ کا بیان ہے:

"چوں پاسبانان بے ردی گماشتند و در ندادن شراب اہتمام رفت بنزدیکاں خود ساختہ بتقریب شکار سواری کردی وآں دوستان نادان برخی شراب درنال تفنگ انداختہ وچندی در رودہ گاؤ پر کردہ آں را زیر جامہ بکمر پیچیدہ در صحرا باں آشفتہ میرسانیدند وآں پا برجاں نہادہ و دست از زندگی شستہ بخوردن دلیری میکرد . . . . . رفتہ رفتہ اعضای رئیسہ خاصہ دماغ را آزردگی تمام بہم رسانید وسخت رنجوری وناتوانی افتاد وقوای طبیعی رو بانحطاط آورد و دررگ واعضا فتور حواس افزونی گرفت واز خوردنی روی برتافت بجز نام شراب ہیچ بر زبان نراندی تا چہل روز پہلو بر بستر نہادہ بود در روز شنبہ بلیست وہشتم شوال پیمانۂ عمرش در آزردی شراب پرگشت سی وسہ سال وشش ماہ درین دیرفنا بادہ زندگانی خوردہ بخمار مرگ افتاد"[1]

---

[1] اکبر نامہ جلد دوم ۸۳۷

دانیال کی موت کے متعلق بہ نسبت اکبر نامہ کے تزک جہانگیری میں زیادہ اور دلچسپ معلومات ملتی ہے۔ جہاں گیر نے خود اپنے بھائی کے آخری حالات تفصیلاً اس میں بیان کئے ہیں۔ جہاں گیر کا بیان ہے کہ اس کا باپ اکبر برہان پور کی مہم سے فتح یاب ہو کر لوٹا تب اس شہر کو دانیال کے سپرد کیا مصنف موصوف نیز رقمطراز ہے کہ دانیال بھی اپنے بھائی مراد کی طرح شراب کا عادی ہو گیا جس کی وجہ سے ۳۳ برس کی عمر میں وہ راہی ملک عدم ہوا مصنف کا مزید بیان ہے کہ شہزادہ دانیال کو شکار کا بڑا شوق تھا اس کی اپنی خاص بندوق تھی جس کا نام اس نے "یکہ و جنازہ" رکھا تھا چونکہ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا اور خود شعر بھی موزوں کرتا تھا اس لئے یہ شعر لکھ کر اپنی بندوق پر نقش کروایا تھا[1]

از شوق شکار تو شود جان تر و تازہ　　بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ و جنازہ

باپ کی عدم موجودگی میں وہ تھا اور دختر رز اور بنا بر ے یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے۔ ہر وقت شراب میں مست رہتا نوبت یہاں تک پہنچی کہ بغیر شراب کے زندگی دو بھر تھی۔ شہزادے کی عادت سے سب ہی لوگ واقف تھے لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹوکتے خاندان مغلیہ کے بہی خواہوں نے اس خاندان کے مغل اعظم کو شہزادے کی عادت سے مطلع کیا چوں کہ مراد باپ کے جگر پر داغِ مفارقت لگا چکا تھا اس لئے اکبر کو بہت رنج ہوا اس نے دانیال سے شراب دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اس وقت دربارِ مغلیہ کا ایک اہم رکن خان خاناں دانیال کے ساتھ ہی تھا وہ اس کا خسر بھی تھا اس لئے باپ کی جگہ تھا اکبر نے اسے لکھا کہ وہ دانیال کو شراب پینے سے باز رکھے اور شراب اسے کسی بھی حالت میں مہیا نہ کی جا سکے اس پابندی سے دانیال کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ شراب کی ایک ایک بوند کو ترستا اور شراب اسے نہ ملتی لہذا اس نے اپنے خاص نوکروں سے التجا کی انھیں انعام واکرام کے سبز باغ دکھائے بد قسمتی سے ان میں سے ایک نے جس کا نام مرشد قلی تھا شراب لا کر دینے کا ذمہ لیا۔ اس نے بندوق "یکہ و جنازہ" کی نلی میں شراب بھر دی لیکن وہ فوراً شہزادے کو دے نہ سکا

---

[1] دانیال ہندی میں بھی ایسے اشعار موزوں کرتا تھا چنانچہ جہانگیر لکھتا ہے بہ نغمہ ہندی مائل بود گاہے بزبان اہل ہند باصطلاح ایشاں شعری میگفت بد نبودی"

کیوں کہ پہرہ سخت تھا اس تاخیر کی وجہ سے لوہے کا زنگ شراب میں حل ہوگیا اور شراب کو سخت زہر آلود کیا۔ جوں ہی موقعہ ملا مرشد قلی نے شراب پیش کی دانیال چوں کہ کئی دنوں سے اس کے انتظار میں تھا بغیر سوچے سمجھے شراب منہ کو لگالی اور فوراً زمین پر گر پڑا جہاں سے وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔[۲]

شہزادوں کی شراب سے دل بستگی نے اکبر کو شراب سے زیادہ متنفر کر دیا بدایونی کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنی حکومت میں فرمان جاری کر دیا کہ کوئی شخص حکومت مغلیہ کے حدود میں نہ شراب بیچے اور نہ شراب پئے۔ اس نے شراب کے استعمال کو بند کر دیا ہاں اس نے مریضوں کے لئے شراب کا استعمال جاری رکھا لہٰذا فرمان میں یہ واضح کر دیا جن لوگوں کو معالجہ کے لئے شراب کی ضرورت ہوتی وہ طبیب یا حکیم کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے شراب حاصل کرتے۔ بدایونی کا یہ بھی بیان ہے کہ اکبر نے ایک سرکاری دکان قائم کی تھی اور اس کی نگرانی کا کام ایک خاتون کے ذمہ کیا جو خمار کی نسل سے تھی لوگ اس دکان میں آتے اور اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام وغیرہ لکھواتے اور حکیم کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے شراب لے جاتے چوں کہ بدایونی بڑی حد تک اکبر سے ناراض تھا اس لئے مزید لکھتا ہے کہ بعض لوگ بیماری کا بہانہ بناتے اور شراب لے جاتے اور کوئی تحقیق نہیں ہوتی۔

چنانچہ بدایونی یوں رقمطراز ہے:

"...... دکان شراب فروشی بر در بار باہتمام خاتون دربان کہ در اصل از نسل خمار است برپا کردہ نرخی معین نہادند تا ہر کسی کہ برای علاج بیماری ابتیاع خمر نماید نام خود را از پدر وجد از مشرف بنویسانند آنگاہ ببرد مردم بایں حیلہ بلباس اسامی می نویسانیدند و می بردند کہ تحقیق می کرد"[۱]

مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے بعد سلاطین مغلیہ کا دوسرا تاجدار سلیم ہوا جو جہاں گیر کے نام سے ہمہ گیر و عالم گیر اہمیت کا مالک ہوا۔ سلیم کی رومانی زندگی اور عیش پسندی کی داستان زبان زد خاص و عام ہے سلیم عیش و عشرت کا دل دادہ ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ وہ صاحب ذوق بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کے کاروبار میں اس نے جو بھی کام کئے تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں

---

[۱] منتخب التواریخ حصہ دوم ص ۳۰۱ و ص ۳۰۲

یہاں ان چیزوں سے بحث نہیں ہے۔ جہانگیر عیش پسند ہونے کی وجہ سے شراب کا بھی عادی تھا مورخین نے اکثر جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے جہانگیر خود اپنی تزک میں اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے عمر کے ۱۸ ویں سال سے ہی شراب پینا شروع کی[1] شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ وہ دن میں بیس سے زیادہ پیالیاں تیز شراب کی پیتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود شراب سے دل بستگی ہونے کے تدریجاً وہ اس سے متنفر ہوتا گیا اور اس نے ہر روز شراب کی مقدار کم کر دی یہاں تک کہ آخر میں وہ شراب محض اس لئے پیتا تھا کہ ہاضمہ اچھا رہے۔ جیسا کہ اس کے اپنے الفاظ سے ظاہر ہے:

"در اوایل چوں بخوردن آں حریص بودم گاہی تا بیست پیالہ عرق دو آتشہ تناول میشد...... درایں ایام خود محض برائے گوارش طعام میخورم"[2]

اس کی اپنی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک فرمان جاری کر کے شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کو اپنے قلمرو میں ممنوع قرار دیا:

"چہارم شراب...... نہ سازند و نفر شند"[3]

اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا مقصد یہی تھا کہ لوگ شراب سے پیدا ہونے والے خطروں سے محفوظ رہ سکیں چنانچہ فرمان جاری کرنے کے بعد جہانگیر نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ کوئی فرد اس شاہی فرمان کی خلاف ورزی نہ کرے چنانچہ اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے شاہی فرمان کو پس پشت ڈال کر شراب پی سخت سزائیں دیں۔ شری رام شرما کا بیان ہے کہ بعض امراء نے شاہی فرمان کو نظر انداز کر کے شراب پی اور شاہی عتاب کے مرتکب ہوئے[4]

جہانگیر کے بعد مغلیہ حکومت کی باگ ڈور شاہجہاں کے ہاتھ آئی۔ شاہ جہاں کا دور مغلیہ تاریخ کا ایک اہم دور ہے گو جنگی معرکہ آرائیاں اس کے دورانِ حکومت میں بہت کم ہوئیں تاہم نظام حکومت میں اس نے جو اصلاحی کام کئے ہیں قابل احترام و قابلِ تعریف ہیں چونکہ ان کا ذکر مضمون کا اصل مقصد نہیں ہے اس لئے اسے ہم تاریخ کے اوراق تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ البتہ مضمون سے متعلق اس

---

[1] تزک جہانگیری ص ۵ [2] ایضاً [3] ریلیجس پالیسی آف دی مغل امپائر ص ۵

کیوں کہ پہرہ سخت تھا اس تاخیر کی وجہ سے لوہے کا زنگ شراب میں حل ہوگیا اور شراب کو سخت زہر آلود کیا۔ جوں ہی موقعہ ملا مرشد قلی نے شراب پیش کی دانیال چوں کہ کئی دنوں سے اس کے انتظار میں تھا بغیر سوچے سمجھے شراب منہ کو لگالی اور فوراً زمین پر گر پڑا جہاں سے وہ دوبارہ نہ اُٹھ سکا۔[۲]

شہزادوں کی شراب سے دل بستگی نے اکبر کو شراب سے زیادہ متنفر کر دیا بدایونی کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنی حکومت میں فرمان جاری کر دیا کہ کوئی شخص حکومت مغلیہ کے حدود میں نہ شراب بیچے اور نہ شراب پیئے۔ اس نے شراب کے استعمال کو بند کر دیا ہاں اس نے مریضوں کے لئے شراب کا استعمال جاری رکھا لہذا فرمان میں یہ واضح کر دیا جن لوگوں کو معالجہ کے لئے شراب کی ضرورت ہوتی وہ طبیب یا حکیم کا سرٹیفکٹ پیش کر کے شراب حاصل کرتے۔ بدایونی کا یہ بھی بیان ہے کہ اکبر نے ایک سرکاری دوکان قائم کی تھی اور اس کی نگرانی کا کام ایک خاتون کے ذمہ کیا جو خمار کی نسل سے تھی لوگ اس دوکان میں آتے اور اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام وغیرہ لکھواتے اور حکیم کا سرٹیفکٹ پیش کر کے شراب لے جاتے چوں کہ بدایونی بڑی حد تک اکبر سے ناراض تھا اس لئے مزید لکھتا ہے کہ بعض لوگ بیماری کا بہانہ بناتے اور شراب لے جاتے اور کوئی تحقیق نہیں ہوتی۔

چنانچہ بدایونی یوں رقمطراز ہے:

"..... دزکان شراب فروشی بر در بار باہتمام خاتون دربان کہ در اصل از نسل خمار است برپا کردہ نرخی معین نہادند تا ہر کسی کہ برای علاج بیماری ابتیاع خمر نماید نام خود را از پدر و جد از مشرف بنویساند آنگاہ ببرد مردم باین حیلہ بلباس اسامی می نویسانیدند و می بردند کہ تحقیق می کرد"[۱]

مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے بعد سلاطین مغلیہ کا دوسرا تاجدار سلیم ہوا جو جہاں گیر کے نام سے ہمہ گیر و عالم گیر اہمیت کا مالک ہوا۔ سلیم کی رومانی زندگی اور عیش پسندی کی داستان زبان زد خاص و عام ہے سلیم عیش و عشرت کا دل دادہ ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ وہ صاحب ذوق بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کے کاروبار میں اس نے جو بھی کام کئے تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں

---

[۱] منتخب التواریخ حصہ دوم ص ۳۰۱ و ص ۳۰۲

یہاں ان چیزوں سے بحث نہیں ہے۔ جہانگیر عیش پسند ہونے کی وجہ سے شراب کا بھی عادی تھا مورخین نے اکثر جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے جہانگیر خود اپنی تزک میں اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے عمر کے ۱۸ ویں سال سے ہی شراب پینا شروع کی شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ وہ دن میں بیس سے زیادہ پیالیاں تیز شراب کی پیتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود شراب سے دل بستگی ہونے کے تدریجاً وہ اس سے متنفر ہوتا گیا اور اس نے ہر روز شراب کی مقدار کم کر دی یہاں تک کہ آخر میں وہ شراب محض اس لئے پیتا تھا کہ ہاضمہ اچھا رہے۔ جیسا کہ اس کے اپنے الفاظ سے ظاہر ہے:

"در اوایل چوں بخوردن آں حریص بودم گاہی تا بیست پیالہ عرق دو آتشہ تناول میشد...... در ایں ایام خود محض برائے گوارش طعام میخورم۔"[۱]

اس کی اپنی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک فرمان جاری کر کے شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کو اپنے قلمرو میں ممنوع قرار دیا:

"چہارم شراب ...... نہ سازند و نفروشند"[۲]

اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا مقصد یہی تھا کہ لوگ شراب سے پیدا ہونے والے خطروں سے محفوظ رہ سکیں چنانچہ فرمان جاری کرنے کے بعد جہانگیر نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ کوئی فرد اس شاہی فرمان کی خلاف ورزی نہ کرے چنانچہ اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے شاہی فرمان کو پس پشت ڈال کر شراب پی سخت سزائیں دیں۔ شری رام شرما کا بیان ہے کہ بعض امراء نے شاہی فرمان کو نظر انداز کر کے شراب پی اور شاہی عتاب کے مرتکب ہوئے۔[۳]

جہانگیر کے بعد مغلیہ حکومت کی باگ ڈور شاہجہاں کے ہاتھ آئی۔ شاہ جہاں کا دور مغلیہ تاریخ کا ایک اہم دور ہے گو جنگی معرکہ آرائیاں اس کے دورانِ حکومت میں بہت کم ہوئیں تاہم نظامِ حکومت میں اس نے جو اصلاحی کام کئے ہیں قابلِ احترام و قابلِ تعریف ہیں چوں کہ ان کا ذکر مضمون کا اصل مقصد نہیں ہے اس لئے اسے ہم تاریخ کے اوراق تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ البتہ مضمون سے متعلق اس

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۲۲۳ [۲] ایضاً [۳] ریلیجس پالیسی آف دی مغل ایمپررس ص ۶۴

شاہنشاہ کے متعلق جو بھی معلومات ملتی ہیں ان کا ایک تذکرہ لازمی و ضروری ہے۔ شاہجہاں جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے دخترِ رز سے اپنا دامن بچا نہ سکا۔ اس کا شراب سے دوچار ہونے کا واقعہ صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عمر کے چوبیس سال تک شاہجہاں نے اپنے آپ کو شراب سے بچائے رکھا تھا گویا عمر کا بہترین حصہ اس نے بہتر سے بہتر طریقہ پر گذارا اور بلا شبہ وہ تا دمِ آخر شراب سے اجتناب کرتا لیکن اس کے باپ جہانگیر نے اسے شراب سے دوچار کیا جس کا ذکر جہانگیر خود اپنی تزک میں تفصیلاً کرتا ہے اس کا بیان ہے کہ شاہجہاں جس وقت چوبیس سال کا تھا اس کا جشنِ وزن منایا گیا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اس سے کہا کہ وہ صاحبِ اولاد ہے اب وہ چند موقعوں پر مثلاً روزہائے جشن اور نوروز کے موقع پر شراب پیا کرے لیکن اعتدال کا پہلو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اس ضمن میں جہانگیر بو علی کے اشعار بھی نقل کرتا ہے جو اس خیال کے طرفدار ہیں۔ جہانگیر کا بیان یوں ہے۔

"در بیست و پنجم روز جمعہ وزن فرزند خرم واقع شد تا سال حال کہ سنش به بیست و چہار سالگی رسید و کدخدا یہا کردہ و صاحب فرزندان شدہ اصلا بہ خوردنِ شراب آلودہ نہ ساختہ بود دریں روز کہ مجلس وزن او بود گفتم کہ بابا صاحب فرزندان شدہ و پادشاہان و پادشاہزادگان شراب خوردہ اند امروز کہ روزِ جشن وزن تست بتو شراب میخورانیم و رخصت میدہیم کہ در روزہائے جشن و ایام نوروز و مجلسہائے بزرگ میخوردہ باشی اما طریقہ اعتدال مرعی داری کہ خوردن باندازہ کہ عقل را زائل کند دانایان روا نداشتہ اند و میباید کہ از خوردن آں غرض نفع و فائدہ باشد و بو علی کہ بزرگ طبقہ حکما و اطباست ایں رباعی را بنظم در آوردہ:

می دشمنِ مست و دوستِ ہوشیار است — اندک تریاق و بیش زہر مار است

در بسیارش مضرت اندک نیست — در اندک او منفعت بسیار است [1]

لیکن شاہجہاں نے بہت جلد اسے ترک کر دیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ شاہجہاں نے شراب سے اسی طرح توبہ کی جیسے اس کے جدِ امجد بابر نے کی تھی چنانچہ اس ضمن میں بنارسی پرشاد کے الفاظ قابلِ ذکر

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵۱

ہیں۔ مورخ موصوف کا ماخذ قزوینی کی تاریخ بادشاہنامہ ہے مورخ کا بیان حسب ذیل ہے

"He always held Babur and Timur as Ideal and Followed the example of his ancestors by Taking a Vow never to touch wine again. His entire stock of wine was ordered to be thrown in to the chambal, and the Precious cups of Gold and silver were broken and were distributed among the Poor and needy." [1]

شاہجہاں نے اس کے علاوہ یہ بھی موزوں سمجھا کہ اس مہلک شے کو اپنی رعایا سے دور رکھے چنانچہ اس نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کی رو سے شراب کو اپنی حکومت میں ممنوع کر دیا اور ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔ جنہوں نے شاہی فرمان کی خلاف ورزی کی۔

غلامانِ اسلام

تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم اے رفیق ندوۃ المصنفین

اسّی کے قریب ان صحابۂ تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور اربابِ کشف و کرامات اور اصحابِ علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تلاش سے جمع کئے گئے جنہوں نے غلام یا آزاد غلام ہوتے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں۔ جنھیں اسلامی سوسائٹی میں عظمت کی کرسی پر بٹھایا گیا اور جن کے علمی، تاریخی، مذہبی اور اصلاحی کارنامے اس قدر شاندار اور روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو بھی رشک آتا ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب۔ اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی، صفحات ۴۰۸ بڑی تقطیع۔

قیمت ۵ مجلد ۶

بلاذری کی انساب الاشراف

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

برسوں سے اس کتاب کو پڑھنے کا شوق تھا۔ یوں تو پرانے مصنفوں کی تالیفوں میں اس کے بہت سے اقتباس موجود ہیں جن کو بغیر اعتراف ماخذ نقل کر دیا گیا ہے لیکن ایسے مصنف بھی گذرے ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں میں انساب الاشراف کے حوالے دئے ہیں اور اس کو سراہا ہے، ان میں مسعودی مصنف مروج الذہب، اصابہ کے مصنف ابن حجر، وفیات الاعیان کے مصنف ابن خلکان اور تاریخ دمشق کے مصنف ابن عساکر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ قیمتی کتاب اب تک نہیں چھپی اس کا ایک حصہ ۱۸۸۳ء میں المانی مستشرق اہلوارڈ نے غریفسوالڈ میں چھاپا تھا، یہ حصہ عبدالملک بن مروان کی خلافت پر مشتمل ہے اور اس کا مخطوطہ فاضلِ مذکور کو برلن لائبریری میں ملا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کتاب کا چوتھائی حصہ بشکلِ مخطوطہ پیرس لائبریری میں موجود ہے، لیکن پوری کتاب کا نسخہ صرف استنبول کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں اس کتاب کے مکمل نسخہ کی دریافت کا پہلی بار اعلان ہوا اور اس کو چھاپنے کا منصوبہ بنایا گیا، مختلف دقتوں کی وجہ سے کتاب نہ چھپ سکی۔ پھر برسوں بعد اس کو چھاپنے کی مہم عبرانی یونی ورسٹی فلسطین کے شعبۂ مشرقیات کو سونپی گئی، وہاں ۱۹۳۶ء اور پھر ۱۹۳۸ء میں اس کا کچھ حصہ چوتھی اور پانچویں جلدوں کی شکل میں دو فاضلوں کی محنت سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ میں بہت خوش تھا کہ جلد یہ نفیس کتاب بازار میں آجائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ عبرانی یونی ورسٹی کے کارکن شروع کئے ہوئے کام کو آگے نہ بڑھا سکے، جنگ شروع ہوگئی، پھر

عرب اور اسرائیل کے تعلقات خراب ہوگئے۔

قاہرہ کے دار الکتب نے اس کتاب کا استنبول سے فوٹو لے لیا تھا جو بارہ موٹی جلدوں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ ہوا عرب لیگ (الجامعۃ العربیہ) نے ایک شعبہ احیاء مخطوطاتِ عربیہ کے نام سے قائم کیا ہے اور اس کا ارادہ اپنی نگرانی میں کتاب کو چھاپنے کا ہے، دیکھئے یہ تاریخی خزانہ کب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی آٹھ جلدیں عرب لیگ کے شعبہ مخطوطات میں دار الکتب سے آگئی ہیں، باقی چار ہنوز دار الکتب میں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کی دوسری اور تیسری جلدیں تصحیح کے لئے ایڈیٹروں کے پیشِ نظر ہیں[1]۔

کل کتاب دو ہزار چار سو چون ۲۴۵۴ صفحوں پر مشتمل ہے، صفحہ کا پیمانہ اندازاً ۹×۸ اینچ ہے اور ہر صفحہ پر سینتیس ۳۷ سطریں ہیں، قلم درمیانی، کتابت گنجلک ہے، آخری جلدوں کا فوٹو صاف نہیں ہے، جگہ جگہ لفظ اور حروف مٹ گئے ہیں، یا اُن کی شکل بگڑ گئی ہے۔ کاتب کم سواد تھا، اس لئے کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں۔

بلاذُری غالباً دوسری صدی ہجری کے خاتمہ پر پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ بغداد میں رہتے تھے، خلافت عباسی کے مرکزی دفتر میں فارسی سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے، ان کا ایک ترجمہ عہدِ اردشیر آج تک مشہور ہے۔ ترقی کرتے کرتے مُتوکل باللہ کے مصاحبوں میں ہوگئے، ان کے بعد مُستعین باللہ اور پھر مُعتز باللہ نے انھیں اپنے ندیموں میں رکھا، آخر الذکر نے اپنے لڑکے کی اتالیقی بھی ان کے سپرد کی۔ فارسی اور عربی ثقافت میں رنگے ہوئے تھے، شاعری کا بھی شوق تھا، شعر میں پھبتیاں بڑی سخت کہتے تھے۔ ان کی دو ۲ کتابیں مشہور ہیں اور دونوں تاریخی ہیں، ایک فتوح البلدان اور دوسری اَنسابُ الاشراف جس کا نام ابن الندیم نے اپنی فہرست (لیبزگ صفحہ ۱۱۳) میں کتابُ الاخبار والانساب دیا ہے جو مضامینِ کتاب کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب ہے۔

---

[1] میں رشاد عبد المطلب صاحب انچارج شعبۂ مخطوطات عرب لیگ کا ممنون ہوں جنہوں نے میرے مطالعہ کے لئے یہ دونوں جلدیں اڈیٹروں سے منگوانے کی زحمت فرمائی۔

فتوح البلدان پہلے لکھی، اس کے حوالے انساب میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔

بلاذری کو تاریخ و اخبار سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے اپنے وقت کے سب سے ممتاز علماء تاریخ کے حلقوں میں شرکت کی تھی جن میں یہ چند نام قابلِ ذکر ہیں:۔ مدائنی، ہشام بن عمار، شیبان بن فروخ، ابو عبیدہ معمر مثنی، ابن المدینی، محمد بن سعد (مصنف طبقات الکبیر) ابو عبید قاسم بن سلام (مصنف کتاب الاموال)، اس کے علاوہ ان کے پاس وہ سارے رسالے اور کتابیں تھیں جو ان کے ہم عصر اور پہلے کے علماء نے تاریخ اور انساب کے موضوع پر تصنیف کی تھیں۔

جن علماء کی کتابوں سے بلاذری نے انساب الاشراف میں مواد لیا ہے اور جو بد قسمتی سے فنا ہو گئیں یا پردۂ غیب میں ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: عوانہ کلبی متوفی ۱۴۷ھ، ابو مخنف ازدی ہشام کلبی متوفی ۲۰۶ھ، واقدی متوفی ۲۰۷ھ، عمر بن شبہ بصری متوفی ۲۶۲ھ، ہیثم بن عدی متوفی ۲۰۷ھ، مدائنی متوفی ۲۱۵ھ، زبیر بن بکار متوفی ۲۵۶ھ۔

بلاذری عباسی حکومت کے سایہ میں پلے بڑھے اور عباسی خلفاء کی سرپرستی میں زندگی بسر کی تاہم ان کی کتاب بنو امیہ کے تعصب سے آلودہ نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انساب الاشراف میں جتنا تفصیلی ذکر بنو امیہ کا ہے کسی اور کا نہیں ہے اور اس ذکر میں بہت سے نئے نئے حقایق بیان ہوئے ہیں جو دوسری کتابوں میں مفقود ہیں اور جن سے بنو امیہ اور ان کے حاکموں کی سیرت اور سیاست پر تازہ روشنی پڑتی ہے اور وہ غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں یا ان کے دور ہونے کا قرینہ پیدا ہوتا ہے جو دوسری مروجہ تاریخوں کے مطالعہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔

کتاب کی بنیاد خاندانوں پر رکھی گئی ہے جیسے بنو عبد مناف اور بنو عبد شمس، پہلے ان کا نسب بیان ہوتا ہے پھر ان کے جو افراد مشہور و مقتدر ہوئے ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سیاسی یا کسی دوسری حیثیت سے شہرت حاصل کرتے ہیں۔ کتاب ربط و نظم سے بہت جگہ محروم ہے، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مصنف کو موت یا مرض نے ترتیب درست کرنے کا موقع نہیں دیا، فتوح البلدان میں ایسی بے ربطی نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ بلاذری نے اپنے شیخ ابن سعد کی طبقات کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، کیوں کہ انساب کا انداز طبقات سے بہت مشابہ ہے۔ جس طرح طبقات منظم و مربوط تاریخ نہیں، اسی طرح انساب بھی نہیں ہے، جس طرح طبقات افراد سے بحث کرتی ہے، اسی طرح انساب بھی کرتی ہے، جس طرح طبقات اسناد کا بلیغ اہتمام کرتی ہے، انساب بھی کرتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ طبقات کے افراد کی ترتیب طبقوں یا شہروں کی بنیاد پر ہوئی ہے جیسے بدریوں مہاجروں، تابعیوں، کوفیوں، بصریوں اور انساب کے افراد کی ترتیب خاندانوں اور قبیلوں کی بنیاد پر ہوئی ہے جیسے بنو تمیم، قریش، مضر، ہذیل وغیرہ۔

(۲) طبقات کا دائرہ کیا تعداد افراد اور کیا تنوع معلومات کے لحاظ سے انساب کے مقابلہ میں کافی تنگ ہے، اگرچہ طبقات اپنے دائرہ میں بہت مفید کتاب ہے۔

(۳) طبقات میں محدثوں، فقیہوں، اور مفتیوں کا ذکر غالب ہے، انساب میں ارباب سیاست و اقتدار کا۔

(۴) طبقات میں نہ شعر ہے نہ شاعروں کا تذکرہ، انساب میں متعدد نامور شاعروں کے خاکے پیش کئے گئے ہیں اور کئی ہزار اشعار کا قیمتی اور دلچسپ انتخاب جمع کیا گیا ہے۔ یہ اشعار بالعموم کسی سیاسی واقعہ، یا سماجی حادثہ، یا کسی معرکۂ جنگ یا کسی شکست یا فتح کی ترجمانی کرتے ہیں اور ہم عصر تاریخ کو ذہن نشین کرانے میں مدد دیتے ہیں۔ خوارج کی شاعری جتنی آپ انساب میں پائیں گے کسی دوسری تاریخ میں نہ پا سکیں گے۔

کتاب کی صحیح تثمین و تقدیر اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کا شروع سے آخر تک اچھی طرح مطالعہ نہ کیا جائے، مجھے افسوس ہے کہ میں مطالعہ کا حق نہیں ادا کر سکا، اگرچہ میں نے کئی ہفتے تین چار گھنٹے یومیہ کے حساب سے اس پر صرف کئے۔ بایں ہمہ کتاب کی چند بنیادی حیثیتیں واضح ہو گئی ہیں: کتاب کا اکثر حصہ مطبوعہ تاریخوں کی معرفت ہم تک پہنچ چکا ہے، کم حصہ اچھوتا اور نیا ہے، لیکن کم ہونے کے باوجود یہ حصہ بہت قیمتی ہے اس کو پڑھ کر اسلام کی تاریخی شخصیات کے بارے میں مسلمہ نظریات و آراء میں ترمیم

و اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(۲) کتاب میں خلافت راشدہ اور بنو اُمیہ کی تاریخ کے بہت سے اجمال کی تفصیل موجود ہے۔

(۳) تاریخ کے دھاگے جہاں جہاں ٹوٹ گئے ہیں یا اُلجھ گئے ہیں ان کو جوڑنے اور سلجھانے میں اس کتاب سے مدد ملتی ہے۔

(۴) جن سیرتوں کی تصویر کا ایک رُخ ہم نے دیکھا تھا، ان کی سیرت کے دوسرے رُخ کی جھلکیاں بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

اس قدر ضخیم ہونے کے باوجود اسلام کے ڈیڑھ سو سال کی تاریخ تک محدود ہے، رسول اللہؐ خلفائے راشدین، بنو اُمیہ اور بنو عباس میں صرف منصور اس کتاب کے ماہتاب و آفتاب ہیں جن کے گرد سینکڑوں سیارے سیاسی، اداری، فقہی اور ادبی شخصیات کی صورت میں گردش کرتے ہیں لیکن ان چاند ستاروں میں سے کسی ایک کے عہد، سیرت اور عمل کی صرف رسول اللہ کو چھوڑ کر، جامع اور مربوط تاریخ نہیں پیش کی گئی ہے بلکہ ان کے حالات زیادہ تر روایتوں، مختصر واقعات اور اشاروں کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں، جن کی سند کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے اور جن کو متعدد مورخوں یا شیوخ تاریخ کی متفقہ سند حاصل ہوتی ہے ان کو ہمارا مصنّف "قالوا" کہہ کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ چھوٹی بڑی روایتیں ہیں بہت کام کی، کیوں کی ان کی مدد سے تاریخ اور تاریخی اشخاص کی سیرت اور عمل کے وہ گوشے روشن ہو جاتے ہیں جو مبسوط تاریخوں مثلاً طبری کے مطالعہ سے صاف نہیں ہوتے یا ہمیں بالکل نئے انکشاف ملتے ہیں جو ہماری تاریخی معلومات کے مصحف میں انقلاب آفریں باب کی حیثیت رکھتے ہیں، یا ہمیں ایسا مواد ملتا ہے جس کی مدد سے ہم تاریخی اشخاص کی سیرت و عمل کی تصویروں میں ایک نئی رنگینی اور نکھار پیدا کر سکتے ہیں۔

کتاب کے اہم محتویات اور چند نمونے

جلد اوّل صفحہ ۱ تا ۲۰۰

عرب عاربہ کا نسب۔ قحطان، عدنان اور ان کی اولاد کا ذکر۔ عاد اور عمالیق کی بستیوں کی

تحقیق۔ قریش اور اس کے اکابر کا ذکر۔ کعبہ اور اس کے انتظام کا ذکر۔ عبد مناف کا مفصل نسب واقعہ فیل۔ بیئر زمزم کی کھدائی کا قصہ۔ عبد المطلب اور ان کی اولاد کا ذکر۔ رسول اللہؐ کی ابتدائی زندگی کا ذکر ۱۰۶ صفحہ تک۔ رسول اللہؐ کی بعثت۔ ابو جہل کا قصہ۔ ابو لہب بن عبد المطلب کا قصہ۔ ذکر اسود بن یغوث اور حارث بن قیس جو رسول اللہؐ کو ستاتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے دوسرے بارسوخ قریشیوں کا ذکر۔ امیہ، اُبیّ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا ذکر جو رسول اللہؐ کی توہین و تکذیب کرتے تھے۔ مستضعفین یعنی ان مسلمانوں کا ذکر جو گوناگوں مجبوریوں سے مکہ نہ چھوڑ سکتے تھے اور قریش کے ظلم سہتے تھے۔ مہاجرین حبشہ۔ معراج کا قصہ۔ ہجرت رسول اللہؐ۔ قبیلۂ خزرج کے منافقوں اور ان کی شرارتوں کا ذکر۔ قبیلۂ اوس کے منافقوں اور ان کی شرارتوں کا ذکر۔ مدینہ کے ممتاز یہودی۔ رسول اللہؐ کے غزوات کا تفصیلی ذکر، ۱۲۵ - ۱۷۸ صفحہ تک۔ رسول اللہؐ کی سراپا کا ذکر۔ رسول اللہؐ کی صورت اور اخلاق۔ رسول اللہؐ کی بیگمات کا ذکر۔ اس کے ساتھ پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری جلد ۲۰۱ سے ۴۰۰ صفحہ تک

رسول اللہؐ کی بیگمات (جاری) اور شادیاں ۲۰۶ سے ۲۱۷ صفحہ تک، رسول اللہؐ کی اولاد ۲۱۷ سے ۲۲۵ تک، رسول اللہؐ کے موالی اور خدمتگار ۲۲۵ - ۲۳۷، یہاں اچانک مغیرہ بن شعبہ اور ان پر الزام زنا کا قصہ آجاتا ہے۔ ابو بکرۃ کا ذکر جنہوں نے مغیرہ پر الزام لگایا تھا۔ رسول اللہؐ کے لباس کا ذکر۔ ص ۲۴۵۔ رسول اللہؐ کے غلام۔ رسول اللہؐ کے افسر ص ۲۲۵۔ رسول اللہؐ کے کاتب۔ اُن عورتوں کا ذکر جن کا نام فاطمہ اور عاتکہ تھا۔ رسول اللہؐ کی علالت ۲۶۱ - ۲۷۸۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر کی بیعت اور انصار کی شورش کا ذکر۔ زبیر بن عوام اور اُن کی اولاد۔ رسول اللہؐ کے چچا ابو طالب کا مفصل ذکر۔ جعفر اور عبد اللہ بن جعفر۔ عقیل بن ابی طالب (انساب قریش)۔ کوفہ میں حضرت حسین کے سفیر مسلم بن عقیل اور ان کے قتل کا ذکر۔ حضرت علی اور ان کے متعدد خطوط کا ذکر (جو غالباً نہج البلاغہ میں بھی موجود

ہیں) - ۲۱۳ - ۲۳۶)، - حضرت علیؓ کی اولاد - حضرت علیؓ کی بیعت - جنگ جمل ۲۴۶ - ۲۶۳)، - جنگ صفین ۲۶۳ - ۲۸۵ - تحکیمین کا قصہ - جنگ نہروان - اس جنگ کے بعد حضرت علی کے حالات کا ذکر - اس کے ساتھ دوسری جلد ختم ہوتی ہے -

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ جنگ نہروان (۳۸ھ) کے بعد حضرت علی کی فوج میں اچانک بددلی پیدا ہوگئی تھی، تحکیم کے بعد حضرت علی معاویہ سے لڑنے نکلے تھے کہ خوارج سے نمٹنا پڑا - کئی ہزار خارجی مارے گئے، ان میں زیادہ تر کوفہ کے قرآن خوان اور تہجد گذار لوگ تھے خوارج کو ٹھکانے لگانے کے بعد حضرت علی نے فوج سے کہا کہ اب شام کا رُخ کرو جہاں تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے، پر لیڈران فوج نے شام جانے سے انکار کیا اور یہ بہانہ کر کے کوفہ آگئے کہ ہتیار درست کرلیں اور ہمارے گھوڑے فربہ ہو جائیں تو معاویہ سے لڑنے چلیں گے، لیکن پھر کبھی وہ معاویہ سے لڑنے نہیں گئے، حضرت علی نے ان کو مستعد جنگ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، بڑی جوشیلی تقریریں کیں، بہلایا، غیرت دلائی - ڈانٹا ڈپٹا، مگر ان کا جمود نہ ٹوٹا - جہاں تک مجھے یاد ہے ہماری مطبوعہ کتابوں میں حضرت علی کے اکابر فوج اور قبائلی لیڈروں کے جمود و نافرمانی کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہے، اس سلسلہ میں بڑی سے بڑی وجہ جو مجھے معلوم ہوئی ہے وہ اغانی اور شرح نہج البلاغہ میں مدائنی کی یہ رائے ہے کہ چوں کہ حضرت علی تقسیم خراج میں موالی وغیر موالی یعنی خالص عربوں میں امتیاز نہ کرتے تھے اس لئے کوفہ کے اکابر اُن سے بگڑ گئے تھے، لیکن یہ توجیہ دل کو مطمئن نہیں کرتی، سبب یہ ہے کہ جمود و نافرمانی جنگ نہروان سے شروع ہوئی اور تقسیم خراج میں عدم مساوات اس وقت سے ہو رہی تھی جب ۳۶ھ میں حضرت علی کوفہ تشریف لائے تھے - اس گتھی کو بلاذری کی ان روایتوں نے سلجھا دیا ہے :-

"تحکیم کے بعد جب اہل شام نے حضرت معاویہ کو خلیفہ بنایا اور ان کو حضرت علی کی نہروان میں خوارج سے جنگ کی خبر ملی تو انھوں نے حضرت علی کے فوجی لیڈروں جیسے اشعث بن قیس سے خط و کتابت کی اور انھیں سبز باغ دکھائے، عزت، دولت اور منزلت کے وعدے کئے، جس

سے وہ حضرت علی سے ٹوٹ کر حضرت معاویہ کی طرف مائل ہو گئے اور حضرت علی کے ساتھ معاویہ سے لڑنے جاتے ہوئے کسمسانے لگے۔ حضرت علی ان سے چلنے کو کہتے پر وہ دھیان نہ دیتے، وہ جہاد کی دعوت دیتے لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتے، اسی بنا پر معاویہ کہا کرتے: صفین کے بعد علی سے میری لڑائی میں نہ لشکر کی ضرورت پڑی، نہ سامانِ جنگ کی۔"۔۔۔۔ ہشام بن عمار دمشقی ۲/۴۰۰

(۲) عقبہ بن ابی معیط کے صاحبزادے عمارہ نے کوفہ سے حضرت معاویہ کو لکھا:۔" علی کے قرآن خوان اور زہد کیش ساتھیوں نے ان سے بغاوت کی (خوارج کی طرف اشارہ ہے) علی ان سے لڑے اور قتل کر ڈالا (نہروان میں) اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا لشکر اور اہل کوفہ (جن کے عزیز نہروان میں مارے گئے) ان سے بگڑ بیٹھے ہیں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی عداوت پیدا ہو گئی ہے اور ان کی یک جہتی پارہ پارہ ہو گئی ہے"۔۔۔۔ لوط بن یحییٰ ۲/۴۰۰۔

تیسری جلد ۴۰۱ - ۶۰۰

حضرت علی کی خلافت میں مصر کے حالات۔ مصر کے گورنر محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ کا ذکر۔ خربتیت کی بغاوت ۴۰۹ - ۴۱۲ - معاویہ کی طرف سے عبداللہ بن حضرمی کی بصرہ پر چڑھائی۔ معاویہ کی طرف سے حضرت علی کے قلمرو پر دھاوے۔ حضرت علی کی طرف سے معاویہ کی سرحدوں پر چھاپے۔ حضرت علی کے قتل کا ذکر ص۴۲۷۔ حضرت حسن کی خلافت اور حضرت معاویہ سے ان کی صلح ۴۲۷ - ۴۵۹ - اس کے بعد یکایک خلیفہ عباسی منصور کی خلافت کا ذکر آجاتا ہے اور اس میں ایک اہم بحث شروع ہوتی ہے یعنی خاندان علی کے دعویداران خلافت سے منصور کے تعلقات اور بنو اُمیہ کے عہد میں خاندان علی کے سیاسی اکابر کی بغاوتیں ۴۵۷ - ۵۱۸ - حضرت حسین کی مکہ سے روانگی اور جنگ کربلا، ۴۷۹ - ۵۰۲ - زید بن علی بن حسین کے بنو اُمیہ سے تعلقات اور ان کا قتل ۵۰۲ - ۵۱۲ یحییٰ بن زید بن علی بن حسین کے بنوامیہ سے تعلقات اور ان کا قتل۔ ۵۱۲ سے ۵۱۵، ابن الحنفیہ کا ذکر۔ عباس بن عبدالمطلب اور ان کی اولاد، ان میں عبداللہ بن عباس کا ذکر ۵۲۸ سے ۵۷۰ تک۔ عباسی دعوت کی ابتدا، ترقی اور انتہا، عباسی دعوت کے عجمی کارکنوں کا ذکر۔ تیسری جلد یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

خاندانِ علی کے بنو اُمیّہ سے تعلقات کے باب میں متعدد قیمتی انکشاف ملتے ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

(۱) ۴۱ھ میں حضرت حسن اور معاویہ کے مابین صلح ہوئی اور ۴۹ھ میں حضرت حسن نے وفات پائی - ان نو برس میں وہ برابر بیمار رہے - ان کی موت اور مرض کے بارے میں بلاذری لکھتے ہیں : بہت سے ثقہ مورخ کہتے ہیں کہ عراق سے مدینہ آنے کے بعد حضرت حسن کا مرض طول پکڑتا گیا - اطبا کی رائے تھی کہ انھیں سِل یا پُرانا بخار ہو گیا ہے، اس مرض میں انھوں نے شہد کا شربت پیا جس سے انتقال ہو گیا -

قول ضعیف کے طور پر بلاذری نے وہ روایت بھی نقل کی ہے جس میں ہے کہ معاویہ نے حضرت حسن کی ایک بیوی سے ساز باز کر کے زہر دلوا دیا تھا -

(۲) مدینہ کے گورنر مروان نے معاویہ کو خبر دی کہ حضرت حسین کوئی سیاسی انقلاب برپا کرنے والے ہیں کیوں کہ لوگ ان کے پاس بہت آ جا رہے ہیں - معاویہ نے مروان کو لکھا: "جب تک حسین حکومت کے خلاف کوئی عملی قدم نہ اٹھائیں ان سے تعرض نہ کیا جائے" ساتھ ہی انھوں نے حضرت حسین کو یہ خط بھیجا : - تمھارے بارے میں مجھے ایسی خبریں ملی ہیں جو اگر صحیح ہوں تو کچھ بعید نہیں، کیوں کہ میں نہیں سمجھتا کہ تم خلافت کے لئے جدوجہد کی خواہش چھوڑ چکے ہو اور اگر یہ خبریں غلط ہیں تو تم بڑے ہی خوش نصیب ہو . . . . . . کوئی ایسا کام نہ کرو کہ میں تم سے دوستی اور مودت کے تعلقات توڑنے پر مجبور ہوں اور بد سلوکی سے پیش آؤں، کیوں کہ تم اگر کوئی غلط قدم اُٹھاؤ گے تو میں بھی اُٹھاؤں گا، اگر میرے ساتھ چال چلو گے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا - حسین خدا سے ڈرتے رہو، مسلمانوں میں پھوٹ نہ ڈالو، ان کو خانہ جنگی کی طرف نہ دھکیلو" مورخ کہتے ہیں کہ حضرت حسین نے اس خط کا سخت جواب دیا پہلے زیاد کے شیعوں سے تشدد اور حجر بن عدی کے قتل پر معاویہ کو ملامت کی اس کے بعد لکھا: "خدا نے تم پر یہ مصیبت ڈالی ہے کہ جب سے پیدا ہوئے "صالحین" کے ساتھ چالیں چلتے رہے ہو، جتنا جی چاہے مجھ سے بھی چالیں چل لو! خط کے خاتمہ پر والسلام علیک کی جگہ

یہ الفاظ تھے: والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔ جو غیر مسلموں کو لکھے جاتے ہیں۔ جب حضرت معاویہ نے اپنے مشیروں سے اس خط کی شکایت کی تو انھوں نے کہا آپ بھی ایسا ہی ترش خط لکھئے جس میں حضرت حسین اور علی کی توہین ہو۔ معاویہ نے کہا: اگر میں ان کے والد کی شان میں بُرا کلمہ لکھوں گا تو یہ جھوٹ ہوگا اور پھر میرے شایان شان کہاں کہ لوگوں کی خواہ مخواہ عیب جوئی کیا کروں۔ میں حسین کی بھی برائی نہیں کروں گا، میری رائے تھی کہ دھمکیوں سے بھر ا خطان کو لکھوں، پھر یہ خیال بھی چھوڑ دیا۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے اس درشت مراسلہ کے بعد بھی معاویہ کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ آیا، وہ بدستور حضرت حسین کو وہ سارے نذرانے اور تحفے بھیجتے رہے جو پہلے بھیجا کرتے تھے۔ ہر سال دس لاکھ درہم (تقریباً پانچ لاکھ روپئے) اور ہر قسم کا دوسرا سامان۔

(۳) یزید کے آزاد کردہ غلام (مولی) نے بیان کیا کہ جب حضرت حسین کا سر یزید کے سامنے رکھا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ رونے لگا اور غصہ میں آکر کہا: خدا غارت کرے ابن مرجانہ (عبید اللہ بن زیاد) کو، اگر وہ حسین کا رشتہ دار ہوتا تو کبھی یہ سلوک نہ کرتا۔" اخبار الطوال میں بھی اس سے ملتا جلتا مضمون موجود ہے۔

(۴) "علماء تاریخ کہتے ہیں کہ جب معاویہ نے یزید کو اپنا جانشین بنانے کے لئے لوگوں سے بیعت لی تو ابن الحنفیہ نے خوشی خوشی بیعت کرلی، اس وجہ سے معاویہ ان کے بہت ممنون تھے اور ان کو نذرانے دیا کرتے تھے، اور کہتے کہ سارے قریش میں محمد بن علی (یعنی ابن الحنفیۃ) سے زیادہ بردبار، زیادہ عالم، زیادہ سنجیدہ مزاج، اور غرور طیش اور آلودگی سے زیادہ پاک، صاف کوئی دوسرا شخص نہیں ہے ..... یزید بھی ابن الحنفیہ کی اس ادا کی قدر کرتا تھا کہ انھوں نے بطیب خاطر اس کی بیعت کرلی تھی۔ معاویہ کے بعد جب یزید خلیفہ ہوا تب بھی اس نے ابن الحنفیہ کی طرف سے کوئی بُری بات نہیں سُنی اور ان کو اپنی بیعت پر قایم اور اپنے عہد وفاداری پر ثابت قدم پایا۔ وہ ابن الحنفیہ کا پہلے سے زیادہ مداح ہوگیا اور ان کے ساتھ زیادہ لطف و محبت سے پیش آنے لگا، جب حضرت حسین کربلا میں قتل کئے گئے اور ابن الزبیر نے خلافت کا دعویٰ کیا تو یزید نے ابن الحنفیہ کو لکھا کہ میں

تم سے ملنے کا مشتاق ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم یہاں آکر مجھ سے ملاقات کرو۔ ابن الحنفیہ کے صاحبزادے عبداللہ کو اس دعوت کا علم ہوا تو انھوں نے کہا: اباجی آپ یزید کے پاس نہ جایئے گا، مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔" پر ابن الحنفیہ نے صاحبزادے کی بات نہ مانی اور یزید سے ملنے دمشق چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو یزید نے ان کے لئے رہائش کا خاص انتظام کیا اور ایک معزز مہمان کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب ان کے لئے فراہم کیں۔ پھر ابن الحنفیہ کو ملاقات کے لئے بلایا اور اپنے بالکل پاس بٹھا کر ان سے کہا: حسین کی موت پر خدا مجھے اور تمھیں اجر خیر عطا کرے، بخدا حسین کا نقصان جتنا بھاری تمھارے لئے ہے اتنا ہی میرے لئے بھی ہے اور ان کی موت سے جتنی اذیت تمھیں ہوئی اتنی ہی مجھے بھی ہوئی ہے، اگر ان کا معاملہ میرے سپرد ہوتا اور میں دیکھتا کہ ان کی موت کو اپنی انگلیاں کاٹ کر یا اپنی آنکھیں دے کر ٹال سکتا ہوں تو بلا مبالغہ دونوں ان کے لئے قربان کر دیتا گو کہ انھوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی اور خونی رشتہ کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم کو ضرور معلوم ہوگا کہ ہم پبلک میں حسین کی عیب جوئی کرتے ہیں، بخدا یہ اس لئے نہیں کہ عوام میں خاندانِ علی کو عزت و حرمت حاصل نہ ہو، بلکہ اس سے ہم لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت و خلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے یہ باتیں سُن کر ابن الحنفیہ نے کہا: خدا تمھارا بھلا کرے، اور حسین پر رحم فرمائے اور ان کے گناہ معاف کرے، یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ہمارا نقصان تمھارا نقصان اور ہماری محرومی تمھاری محرومی ہے، حسین اس بات کے مستحق نہیں کہ تم ان کو بُرا بھلا کہو اور برملا ان کی مذمت کرو۔ امیرالمومنین میں درخواست کرتا ہوں کہ حسین کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہئے جو مجھے ناگوار ہو۔ یزید: میرے بھیرے بھائی، میں حسین کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے تمھارا دل دکھے۔" اس کے بعد یزید نے ابن الحنفیہ سے پوچھا کہ تم مقروض تو نہیں انھوں نے کہا نہیں۔ یزید نے اپنے لڑکے خالد کو بلایا اور کہا: بیٹے تمھارے یہ چچا دھوکہ، سفلہ پن، اور جھوٹ سے بالکل پاک ہیں، اگر ان لوگوں سے پوچھتا تم مقروض تو نہیں، تو ضرور کہتے ہم اتنے اتنے مقروض ہیں۔" اس کے بعد یزید نے ابن الحنفیہ کو تین لاکھ درہم کا نذرانہ پیش کیا جو انھوں نے لے لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں پانچ لاکھ درہم نقد دیئے اور

ایک لاکھ کا سامان یزید ابن الحنفیہ کے سامنے تصنع سے پیش آتا تھا اور ان سے قرآن و فقہ کے متعلق سوالات پوچھتا تھا۔ جب ابن الحنفیہ الوداعی ملاقات کے لئے آئے تو یزید نے کہا: ابو القاسم اگر تم نے میری کوئی بات ناپسند کی ہو تو بتاؤ میں اسے چھوڑ دوں گا، اور تمھارے کہے پر عمل کروں گا۔" ابن الحنفیہ نے کہا: بخدا اگر میں نے کوئی برائی دیکھی ہوتی تو بھلا بے ٹوکے کب رہتا، یقیناً تمھاری توجہ اس کی طرف مبذول کرتا، کیوں کہ خدا نے اہل علم پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ لوگوں کو ان کی برائیوں پر متنبہ کریں اور چشم پوشی سے کام نہ لیں، میں نے تو تم میں سب اچھی ہی باتیں دیکھی ہیں۔" اس کے بعد ابن الحنفیہ رخصت ہو کر مدینہ چلے گئے۔

جب مدینہ والوں نے یزید سے بغاوت کی اور اس کی بیعت توڑ کر ابن الزبیر کی طرف مائل ہو گئے اور اُن کی سرکوبی کے لئے مسلم بن عقبہ شام سے فوج لے کر آیا تو عبد اللہ بن عمرو، اور عبد اللہ بن مطیع اکابر قریش و انصار کا ایک وفد لے کر ابن الحنفیہ کے پاس آئے اور کہا یزید کی بیعت توڑ کر ہمارے ساتھ اس سے لڑنے نکلو، ابن الحنفیہ نے کہا: "یزید سے کیوں لڑوں اور اس کی بیعت کس لئے توڑوں؟" ارکانِ وفد: اس لئے کہ وہ کافروں کے سے کام کرتا ہے، فاجر ہے، شراب پیتا ہے اور دین سے خارج ہو گیا ہے۔" ابن الحنفیہ نے کہا: خدا سے نہیں ڈرتے کیا تم میں سے کسی نے اس کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔ میں اس کے ساتھ تم سے زیادہ رہا ہوں مگر میں نے تو اس کو کوئی برا کام کرتے نہیں دیکھا۔" وفد نے کہا: تو کیا وہ تمھارے سامنے برے کام کرتا؟" ابن الحنفیہ: تو کیا تم کو اس نے اپنے کرتوتوں سے باخبر کر دیا تھا؟ اگر اس نے یہ برائیاں تمہارے سامنے کی تھیں تو اس کے معنی ہوئے کہ تم بھی ان میں شریک تھے اور اگر تمھارے سامنے نہیں کیں تو تم ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔" یہ سن کر ارکانِ وفد ڈرے کہ کہیں ابن الحنفیہ کے عدم تعاون سے لوگ یزید کے خلاف شریک جنگ ہونے سے انکار نہ کر دیں، اس لئے انھوں نے کہا: اچھا ہم تمھاری بیعت کرتے ہیں اور تمہیں خلیفہ بنانے کو تیار ہیں اگر تم ابن الزبیر کی بیعت کے لئے تیار نہیں ہو۔ ابن الحنفیہ: میں تو لڑوں گا نہیں، نہ اپنی خلافت کے لئے نہ کسی اور کی۔ "لَسْتُ قَاتِلًا تَابِعًا وَلَا مَتْبُوعًا"

چوتھی جلد ۶۰۱ - ۸۰۰

مُسلم بن قُتیبہ - ابو جعفر منصور - ابو مسلم خراسانی - ابن المُقفّع - ابن ہَرمَة - عمرو بن عُبید معن بن زائدہ - ابو ایوب مُوریانی - سَوّار بن عبداللہ قاضی بصرہ - حمزہ بن عبد المطلب - عبدالمطلب کا نسب - عبد شمس کا نسب - معاویہ بن ابی سفیان، ۶۹۵ - ۷۶۲، معاویہ کے زمانہ میں خوارج کا ذکر ۷۶۲ - ۷۷۴، زیاد بن ابی سفیان ۷۷۴ - ۸۰۰، یہاں چوتھی جلد ختم ہوتی ہے۔

پانچویں جلد ۸۰۱ - ۱۰۰۰

زیاد کا ذکر جاری ۸۱۷ تک - معاویہ کی اولاد - ان میں یزید بن معاویہ کے حالات ۸۱۸ - ۸۲۷، عبداللہ بن زُبیر - جنگ حَرّہ - حصار مکہ - یزید کی اولاد - زیاد بن ابی سفیان کی اولاد ۸۶۱ - ۸۶۳، عبیداللہ بن زیاد اور اس کی اولاد - سفیان بن اُمیہ کی اولاد - سعید بن عاص کی اولاد - عمرو بن سعید بن عاص کا قتل - [تیسرے خلیفہ عثمان بن عفانؓ کے حالات ۹۱۸ - ۹۷۸ تک - حضرت عثمانؓ کی اولاد] یہاں پانچویں جلد ختم ہوتی ہے۔

چھٹی جلد ۱۰۰۱ - ۱۱۹۶

[نُعمان بن بشیر کا قتل - رَبذہ کی جنگ - حَکم بن عاص کی اولاد - مَروان بن حکم اور ان کی اولاد - خلافت مَروان میں عبداللہ بن زبیر کے حالات ۱۰۲۵ - ۱۰۳۵، تَوّابین کے حالات - مختار بن ابی عُبید ثقفی کے حالات ۱۰۴۰ - ۱۰۸۵، زُفر بن حارث کلابی - مُصعَب بن زبیر (گورنر عراق) اور اس کا قتل - عبدالملک بن مروان کی خلافت میں عبداللہ بن زُبیر کے حالات ۱۱۲۴ - ۱۱۲۹] خلافت یزید سے لے کر خلافت عبدالملک تک خوارج کے حالات - عبدالملک بن مروان ۱۱۵۹ - ۱۱۸۷، ولید بن عبدالملک سلیمان بن عبدالملک ۱۱۸۷ - ۱۱۹۶ - یہاں چھٹی جلد ختم ہوجاتی ہے۔

ساتویں جلد ۱ - ۲۱۰

عبدالملک کے عہد میں اُستقایا ذ کی جنگ اور حجّاج بن یوسف کا تقرر بحیثیت گورنر بصرہ

خط کشیدہ حصے عبرانی یونی ورسٹی کی نشر کردہ چوتھی جلد (قسم ثانی) میں موجود ہیں

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

۱۰۱ - ۱۰۶ ، عبدالملک کے عہد میں خوارج ۶۰ - ۱۰۵ ، ولید بن عبدالملک - ولید کے زمانہ میں خوارج ۱۰۵ - ۱۱۸ ، سُلیمان بن عبدالملک ۱۱۹ - ۱۲۷ ، سلیمان کے زمانہ میں خوارج ۱۲۷ - ۱۲۸ ، عبدالعزیز بن مروان ۱۲۸ - عمر بن عبدالعزیز ۱۲۹ - ۱۶۵ ، عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں خوارج ۱۶۵ - ۱۶۹ ، عمر بن عبدالعزیز کی اولاد - یزید بن عبدالملک ۱۷۹ - ۱۸۹ ، یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں عمر بن ہبیرہ کے حالات -

آٹھویں جلد ۲۱۱ - ۴۲۹

یزید بن مُہلّب ۱۹۵ - ۲۲۰ ، مُہلّب کی قندابیل میں مہم ۲۲۰ - ۲۲۸ ، یزید بن عبدالملک کی اولاد - یزید بن عبدالملک کے عہد میں خوارج - مَسلمہ بن عبدالملک ۲۲۲ - ۲۲۴ ، مَسلمہ کی اولاد - ہشام بن عبدالملک ۲۲۵ - ہشام کی اولاد - ہشام کے عہد میں خوارج ۲۶۱ - ۲۶۶ ، ہشام کے زمانہ میں عراق کے گورنر - خالد بن عبداللہ قسری - بلال بن ابی بُردہ - یوسف بن عمر - ابو عاج سُلمی ۲۶۶ - ۳۰۹ ، ولید بن یزید ۳۰۹ - ۳۲۷ ، یزید بن ولید ۳۲۷ - ۳۴۱ ، ابراہیم بن ولید - محمد بن مروان اوران کی اولاد - مروان بن محمد بن مروان اوران کی اولاد - سُلیمان بن ہشام بن عبدالملک - مروان بن محمد کے عہد میں خوارج ۳۵۹ ، مشہور لڑائیاں (جنگ قدید ، جنگ وادی القریٰ وغیرہ) مروان بن محمد کا قتل ۳۸۵ - ۳۹۰ ، مروان بن محمد کے بیٹے - عمرو بن اُمیّہ کی اولاد - ربیعہ بن عبدشمس کی اولاد - عبدالعُزیٰ بن عبدشمس کی اولاد - عبدالمطلب بن عبدمناف کی اولاد - قُصیّ بن کلاب کی اولاد - عبدالدار کی اولاد - یہاں آٹھویں جلد ختم ہوتی ہے -

نویں جلد ۴۲۲ - ۶۳۱

قُصیّ کی اولاد کا ذکر - زہر کی اولاد - عبدمناف کی اولاد - ان میں سعد بن ابی وقاص کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مابین القوسین حصہ عبرانی یونی ورسٹی کی نشر کردہ پانچویں جلد میں موجود ہے - خط کشیدہ حصے مستشرق المانی اہلوارڈ کی نشر کردہ کتاب میں موجود ہیں - یہ کتاب پتھر کے چھاپہ پر ۱۸۸۳ء میں طبع ہوئی تھی -

حالات ۵۲۴ - ۵۷۰، سعد کی اولاد - عبدالرحمن بن عوف اوران کی اولاد - امام زہری کا ذکر تمیم بن مُرّہ کی اولاد - ان میں خلیفہ اول ابوبکر کے حالات ۵۷۰ - ۵۹۱ تک، - ابوبکر کی اولاد - مُرّہ کی اولاد میں طلحہ بن عبیداللہ کا ذکر ۵۹۸ - ۶۰۵، - طلحہ کی اولاد - یقظہ بن مُرّہ بن کعب کی اولاد کا ذکر، ان میں خالد بن ولید کے مختصر حالات - سعید بن مُسیّب ۵۵۳ - ۵۵۷، قیس بن عدی کی اولاد کا ذکر، ان میں عمرو بن عاص کے حالات ۵۷۳ - ۵۷۴، عمرو بن عاص کی اولاد - عدی بن کعب بن مُرّہ کی اولاد، ان میں عُمر بن خطّاب کے حالات ۵۷۷ - ۶۳۱ تک، نویں جلد یہاں ختم ہوتی ہے -

دسویں جلد ۶۳۲ - ۸۴۳

عمر بن خطّاب کا ذکر جاری ۶۳۲ - ۶۴۹ تک، عمر بن خطّاب کی اولاد - ان میں عبداللہ بن عمر کے حالات ۶۴۹ - ۶۵۲، - زید بن عمرو بن نُفیل (عدی بن کعب کی اولاد سے) ۶۵۷ - ۶۵۸، سعید بن زید بن عمرو بن نُفیل - مُطیع بن اسود بن حارثہ - ابوجہم بن حُذیفہ - عامر بن لُؤَیّ بن غالب بن فہر کی اولاد - ان میں ابوعُبیدہ بن جرّاح کے حالات ۶۹۱ - ۶۹۴ تک - کِنانہ بن خُزیمہ بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر اوران کی اولاد - ابوالأسود دُؤلی ۷۱۰ - ۷۱۳، ہون بن خُزیمہ کی اولاد - ہذیل بن مدرکہ کی اولاد - ان میں عبداللہ بن مسعود کے حالات ۷۵۳ - ۷۶۲، طابخہ بن الیاس بن مُضر بن نزار کی اولاد - عدی بن عبدمناۃ بن اوس بن طابخہ کا نسب اور اولاد، ان میں سُفیان ثوری کے حالات ۷۹۷ - ۸۰۳، اِیاس بن مُعاویہ بن قُرّہ بن ایاس بن ہلال قاضی عمر عبدالعزیز کا ذکر ۸۰۹ - ۸۱۵، حاجب بن زُرارہ (عبداللہ بن دارم کی اولاد میں) - یہاں دسویں جلد ختم ہوتی ہے -

گیارہویں جلد ۸۴۴ - ۱۰۵۳

حاجب بن زُرارہ کی اولاد میں فرزدق شاعر (حافظ قرآن) کے حالات، اس کے فسق و فجور اور گندے اشعار کا ذکر ۸۶۶ - ۸۸۵، نہشل بن دارم کی اولاد ۸۹۲ - ۹۰۶ - یربوع

بن حنظلہ کی اولاد - کُلیب بن یربوع بن حنظلہ کی اولاد - ان میں جریر شاعر کا ذکر ۹۲۷ - ۹۵۱، - خالد بن صفوان بن عبداللہ بن عمرو بن اہتم ۹۶۷ - ۹۸۱، مُرّہ کی اولاد سے احنف بن قیس کے حالات ۹۸۳ - ۱۰۰۰، بہدلہ کی اولاد، ان میں سے زبرقان بن بدر کا ذکر ۱۰۰۶ - ۱۰۱۰، عمرو بن تمیم کا نسب اور اولاد ۱۰۲۱ - ۱۰۵۳، یہاں گیارہویں جلد ختم ہو جاتی ہے۔

بارہویں جلد ۱۰۵۴ - ۱۲۵۸

اس جلد کے صفحات پر داغ دھبے بہت ہیں، الفاظ بگڑے اور مٹے ہوئے ہیں۔

تمیم کی اولاد کی مختلف شاخوں اور ممتاز افراد کا ذکر ۱۰۵۴ - ۱۲۵۸؛ ان میں مشہور دانائے عرب اکثم بن صیفی کے حالات، اکثم کا رسول اللہ صلعم کے نام ایک خط اور اس کا جواب بھی ہمارے مصنف نے نقل کیا ہے، اکثم کے بہت سے عقل و دانش سے بھرے مقولے نظم و نثر دونوں میں ۱۰۶۳ - ۱۰۸۷، قیس کا نسب اور اولاد ۱۰۸۷ - ۱۱۰۸، فزارہ کی اولاد، ان میں مشہور مُرتد عُیینہ بن حصن کا ذکر۔ ص ۱۱۳۳ سے عبس بن بغیض کی اولاد اور ان کی شاخوں کا ذکر۔ ص ۱۱۴۲ سے انمار بن بغیض کی اولاد اور شاخوں کا مختصر ذکر۔ قُتیبہ بن مُسلم ۱۱۵۰ - ۱۱۵۲، عدوان اور اس کی اولاد۔ فہم بن عمرو کا نسب اور اس کی اولاد - ان میں جاہلی شاعر تابط شرا کا مختصر ذکر۔ محارب بن حفصہ کا نسب اور اولاد - مازن بن منصور بن عکرمہ بن حفصہ کی اولاد - ان میں عُتبہ بن غزوان کے حالات ۱۱۷۸ - ۱۱۷۹ - سُلیم کی اولاد - ثقیف کا نسب اور اس کی اولاد - ان میں

(۱) مغیرہ بن شُعبہ کا ذکر ۱۲۰۱ - ۱۲۰۶ -

(۲) حجّاج بن یوسف کے حالات ۱۲۰۷ - ۱۲۴۸ -

(۳) یوسف بن عمر گورنر عراق ۱۲۴۹ - ۱۲۵۱؛

(۴) حارث بن کلدہ۔

(۵) ابو محجن شاعر،

(۶) اُمیّہ بن ابی الصلت، کتاب کا خاتمہ وہب بن ابی خُویلد کے مختصر ذکر پر ہوتا ہے۔

فبدل الذین ظلموا الخ الآیۃ کی صحیح توجیہہ

از

(جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

قرآن مجید کی دو سورتوں (بقرہ و اعراف) میں مذکورۃ الصدر فقرہ بیان ہوا ہے اور دونوں سورتوں میں صرف الفاظ کی معمولی کمی و بیشی ہے ورنہ کوئی معنوی فرق نہیں پایا جاتا اس لئے سورۂ بقرہ سے یہ اور اس کی ماقبل آیت نقل کر رہا ہوں،

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ	اور (یاد کرو) جب ہم نے (بنی اسرائیل) سے کہا
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا	کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں چاہو
وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا	عیش کے ساتھ کھاؤ! اور دروازہ میں سجدہ کرتے
حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ	ہوئے اور کلمۂ استغفار کہتے ہوئے داخل ہو جاؤ تو ہم
الْمُحْسِنِيْنَ ـ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ	تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے اور احسان کرنے والوں
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ	پر مزید انعام کریں گے پس ظالموں نے اس بات کو بدل
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ	دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ظلم کرنے والوں پر
السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝	آسمان سے ان کے فسق کی پاداش میں عذاب نازل کیا۔

ان آیتوں میں علمائے تفسیر نے بہت سارے مباحث قائم کئے ہیں لیکن میں صرف دو سوالات قائم کر رہا ہوں:۔

(۱) "ھٰذِہِ الْقَرْیَۃ" سے کون سا قریہ مراد ہے؟

(۲) "فبدل الذین ظلموا" سے یہود کی کون سی تبدیلی مراد ہے؟

اس سلسلہ میں قرآن پاک کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے

اسے علمار تحقیق اور اصحاب تفسیر کے اقوال کے ساتھ ساتھ ذکر کروں گا۔

پہلے سوال کے متعلق صاحب تفسیر کبیرؒ نے تین اقوال نقل فرمائے ہیں :۔

(۱) قتادہ اور ربیع کے نزدیک اس سے بیت المقدس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ابن جریرؒ نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مصر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) ابن عباسؓ اور ابن زید کا خیال ہے کہ اس سے "اریحا" مراد ہے، حضرت شاہ عبد القادرؒ اور مولانا ابو الکلام آزاد کی بھی یہی رائے ہے۔

لیکن اس عاجز کے خیال میں دوسرا قول کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ پہلا اور تیسرا قول یہاں صحیح ہو سکتا ہے لیکن "ھٰذہ القریۃ" سے یہاں خیال ہوتا ہے کہ "اریحا" کو مراد لینا ہی صحیح ہوگا، اگرچہ اصل میں بیت المقدس ہی میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے لیکن بیت المقدس کی طرح سارے ملک شام کو عمالقہ کے قبضہ سے نکال کر بنی اسرائیل کے سپرد کرنا ہے مگر چوں کہ ملک شام میں جاتے ہوئے پہلے یہی قریہ پڑتا ہے اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ "ھٰذِہِ الْقَرْیَۃَ" سے "اریحا" ہی مراد ہے اسی لئے بعد میں بیت المقدس کے لئے "وَادْخُلُوا الْبَابَ" کہا گیا ہے اور سورۂ مائدہ میں بیت المقدس کے لئے "ارض مقدسہ" کا لفظ آیا ہے۔ والعلم عند اللہ۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے اس کے بارہ میں جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ :۔

اللہ تعالیٰ نے جب بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں سجدہ ریز ہو کر اور طلب مغفرت کرتے ہوئے داخل ہونے کے لئے کہا تو انھوں نے خدا کے اس حکم میں تبدیلی کر ڈالی اور سجدہ ریز ہونے کے بجائے اکڑتے، اتراتے اور سرینوں کو ہلاتے ہوئے داخل ہوئے اور کلمہ استغفار کی جگہ "حنطۃ فی شعیرۃ" وغیرہ کہتے ہوئے گئے اسی لئے ان کے بارہ میں "فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" کہا گیا ہے۔

لیکن جمہور مفسرین کے خلاف ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک یہاں صرف نافرمانی اور امر الٰہی کی خلاف ورزی مراد ہے یعنی بنی اسرائیل کو جب بیت المقدس میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے

جانے سے انکار کر دیا اور خدا کی حکم عدولی کی ان کی اسی حکم عدولی اور بغاوت کو تبدیل قول سے تعبیر کیا گیا ہے ابو مسلم نے ایک حد تک بات پتہ کی کہی ہے کیوں کہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہود نے بیت المقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا مگر محض امتثال امر کے انکار کو تبدیل کیسے کہا جا سکتا ہے، یہ تو زبان کے استعمالات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور پھر محض تبدیل ہی کا لفظ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی "قولاً غیر الذی قیل لہم" بھی کہا گیا ہے جس کا صاف اور صریح یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ایک بات کہی گئی اور انھوں نے اس کے علاوہ ایک اور بات بدل لی اور یہ یہود جیسے شرارت پسندوں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ خدا کی بات کے مقابلہ میں کوئی اور بات بنالی ہو کیوں کہ ان کی تاریخ تو اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے قرآن نے جابجا ان کی اس ذہنیت کو آشکارا کیا ہے مثال کے طور پر صرف ذبح بقرہ کے واقعہ پر غور کرو تو ان کی شرارت اور تبدیل قول کی ہزاروں داستانیں نگاہوں میں رقص کرنے لگیں اسی لئے جمہور مفسرین نے ان کے تبدیل قول کی نشاندہی کی ہے مگر انھوں نے اس سلسلہ میں جن روایتوں پر اعتماد کیا ہے اگر وہ روایت و درایت کے اصولوں پر پوری اتر بھی جائیں جب بھی چند وجوہ سے جنھیں بعد میں بیان کروں گا ان کا قول میرے نزدیک پورے طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے میرے نزدیک ابو مسلم کی طرح جمہور مفسرین کا قول بھی ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر دونوں قولوں کے اندر تھوڑا سا نقص اور سقم اپنی فہم کے مطابق محسوس کر رہا ہوں اس لئے جمہور کے خیال کا ہزار بار احترام کرتے ہوئے بھی اپنی رائے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں امید ہے کہ ارباب بصیرت اور اہل علم اس پر بھی غور فرمائیں گے۔

میرے خیال میں سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ یہود سے جب بیت المقدس میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے بعد کیا جواب دیا؟ اور یہی جواب اگر کسی دوسری بات میں موجود ہے تو وہی تبدیل قول ہو سکتا ہے اسی لئے اس کا جواب خود قرآن مجید میں ڈھونڈھنا چاہیے چنانچہ سورہ مائدہ کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیے:-

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (موسیٰ) نے کہا اے قوم کے لوگو! اس مقدس سرزمین

الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ

(مائدہ)

میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمھارے لئے لکھ دیا ہے اور الٹے پاؤں نہ لوٹو کہ گھاٹے میں پڑ جاؤ! انھوں نے کہا اے موسیٰ اس میں تو زبردست لوگ ہیں اور ہم اس میں ہرگز نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں اگر وہ وہاں سے نکل گئے تو ہم داخل ہوں گے دو آدمیوں نے جن پر اللہ کا انعام ہوا تھا اور وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے تھے کہا کہ دشمنوں پر غلبہ حاصل کرکے دروازہ میں داخل ہو جاؤ اور جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمہیں غالب رہو گے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر ایمان والے ہو، انھوں نے کہا اے موسیٰ اس میں ہم کبھی نہ داخل ہوں گے جب تک کہ دشمن وہاں رہیں گے تو اور تیرا خدا جاکر دشمنوں سے لڑے ہم بیٹھے رہیں گے۔

قرآن نے یہاں چل کر سارا معاملہ صاف کر دیا اور اب اس کے علاوہ اور کوئی راہ اختیار کرنا مناسب نہ ہوگا کیوں کہ اس سے بڑھ کر اور کیا تبدیل قول ہو سکتا ہے کہ خدا تو انھیں عزت و سیادت کی طرف لانے کے لئے ملک شام اور بیت المقدس کی امانت و قیادت سپرد کرتا ہے مگر وہ اپنی شرارت و بدبختی کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زبردست اور طاقت وروں سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں اس پر جب کچھ لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تحقیق حال کے لئے بھیجا تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا کہ موسیٰ اور موسیٰ کا خدا جاکر لڑیں بھڑیں ہمارے بس کی بات نہیں ہم صرف بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے البتہ دو آدمیوں (یوشع اور کالب) نے جن پر خدا کا بیش بہا انعام ہوا تھا اور جو عذاب الٰہی سے بہت زیادہ خائف تھے لوگوں کو بہت سمجھایا اور آمادہ کیا کہ اگر لوگ خدا سے ڈریں اس پر پورا

بھروسہ کریں اور اپنے اندر پختہ ایمان و یقین پیدا کریں تو سارا ملک شام بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ اپنے اندر سے خوف و جبن نکال کر اپنے اندر اعتماد، توکل اور سچا ایمان و یقین پیدا کریں

ع ہم تو مائل بکرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

پس میرے خیال میں وہی تبدیلِ قول جس کا تذکرہ سورۂ مائدہ کی آیت میں کیا گیا ہے یہاں بھی مراد لینا چاہیئے اور یہی وہ جرم شنیع تھا جس کی پاداش میں آسمان سے "رجز" نازل کیا گیا اور ملکِ شام اور ارضِ مقدس کی نیابت و خلافت سے انھیں محروم کر دیا گیا اور چالیس سال تک کے لئے میدان تیہ میں حیران و سرگرداں چھوڑ دیا گیا تاکہ ایسی نئی نسل برپا ہو جو قید و مشقت کی خوگر ہو اور غلامی کی زنجیروں میں آنکھ کھولنے کے بجائے آزاد ماحول میں پرورش پائے۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا "ادخلوا الباب سجدا و قولوا حطۃ" میں انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی بلاشبہ کی تھی اسی لئے تو روایتوں میں اس کی تفصیل موجود ہے لیکن یہ تبدیلی تو داخلہ کے وقت جا کر انھوں نے کی تھی لیکن سب سے بڑی اور پہلی تبدیلی جس کا اس آیت میں تذکرہ ہے وہ تو ان ظالموں نے پہلے قدم ہی پر کر دی اور اپنی ڈھٹائی سے بول اُٹھے کہ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔

پس نتیجہ بحث یہ ہے کہ یہود نے دونوں مقامات پر تبدیلی کی لیکن اولین تبدیلی کا جرم انھوں نے پہلے قدم ہی پر کر دیا اور پھر ان کے ناخلف فرزندوں نے بھی ان کی روش اختیار کر لی اور ان سے جب کہا گیا کہ استغفار، تواضع، اخبات اور خشیت الٰہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلیں کہ یہی ایک مومن فاتح کی پہچان ہے تو انھوں نے استکبار اور تبختر کے نشہ میں چور ہو کر کافر فاتحوں کا طرز عمل اختیار کر لیا دیکھو بعینہٖ یہی حکم خود امت مرحومہ کو بھی بیت اللہ کی فتح کے وقت دیا گیا

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔

غور کرو کس قدر مماثلت پائی جارہی ہے مگر امت مرحومہ نے خدا کے فرمان کو بسر و چشم قبول کیا اور یہود اپنی دیدہ دلیری کا اظہار کرنے لگے اور خدا کی بات کو سنی ان سنی کر دیا بقول شخصے

ع۔ بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

اسی لئے قرآن کے منشاء و مراد سے زیادہ لگتی ہوئی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں یہود کی وہی تبدیلی مراد ہے جو پہلے قدم پر حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں داخلہ کے حکم کے انکار کے ساتھ ہی انھوں نے کر دی باقی ضمناً وہ تبدیلی بھی مراد ہو سکتی ہے جو داخلہ کے وقت ناخلف لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت یوشعؑ کے زمانہ میں کیا۔

اس توجیہ کو اختیار کرنے کے دلائل | میں نے جو تاویل بیان کی ہے وہ جمہور علماء تفسیر سے کسی قدر مختلف ہے اس لئے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس پر اطمینان نہ ہو اور نہ یہ میرا مقصد ہی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ میری بات ہی کو تسلیم کرلیں کیوں کہ عوام کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ سلف کے قول کو اختیار کر لیا جائے اگرچہ اس پر اطمینان نہ ہو لیکن چوں کہ قرآن نے جا بجا ہمیں تفکر و تعقل کی دعوت دی ہے اس لئے فکر و نظر سے کام لینا کوئی عیب کی بات نہیں اور جب صحیح دلائل و نتائج سے کوئی ایسی راہ خدا کی توفیق سے حاصل ہو جائے جو کتاب و سنت اور اصول شریعت کے خلاف نہ ہو تو اس کو مان لینے میں کوئی قباحت نہیں، قرآن کے عجائب نہ تو ختم ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے البتہ ایسے اہل نظر اور ارباب فہم کی ضرورت ہے جو قرآن کے دقائق کا سراغ لگائیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

لیکن اس کا مقصود محض نکتہ آفرینی اور جدت طرازی نہ ہو بلکہ احقاق حق ہو جو ہر مسلمان کی اصلی شان ہے اور جس کی دعا وہ خدا سے مانگتا ہے

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

پروردگار! ہمیں حق کو حق دکھائیو! اور اسے اختیار کرنے کی توفیق دیجیو! اور باطل کو باطل دکھائیو! اور اس سے بچنے کی توفیق دیجیو!

اور کافی غور و خوض کے بعد جب ہم روش عام سے کسی قدر ہٹ کر ایک جداگانہ راہ اختیار کر چکے ہیں تو اس کے دلائل بھی لوگوں کے سامنے رکھ رہے ہیں تاکہ لوگ ان پر پوری سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ غور فرمائیں اور لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

(۱) یہ تو معلوم ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے انعامات اور ان کی عہد شکنیوں اور احسان فراموشیوں کے ضمن میں لائی گئی ہے یعنی خدا نے ان پر دینی و دنیوی ہر دو طرح کی جو نعمتیں دی تھیں ان کا تذکرہ کر کے انھیں جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ تم نے خدا کے کیسے کیسے انعامات کو رد کر دیا ہے اسی سلسلہ بیان میں یہ زبردست انعام بھی آ رہا ہے کہ انھیں حکومت و سلطنت اور خدا کے گھر کی ولایت سپرد کی جا رہی تھی مگر انھوں نے اس حدود سلطنت میں جانا ہی گوارا نہ کیا اور اپنی ڈھٹائی سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس سلطنت میں زبردست اور طاقتور لوگ ہیں ان سے لڑنا بھڑنا ہمارے لئے ناممکن ہے موسیٰ اور موسیٰ کا خدا جا کر لڑ بھڑ لیں اور اسی سلسلہ میں بعد کی بات بھی رکھ دی کہ جب وہاں فاتح ہو کر داخل ہونا تو ایک مسلمان فاتح کی طرح سجدۂ شکرانہ بجا لاتے ہوئے داخل ہونا مگر ان بدبختوں نے خدا کی اس تعلیم کو بھی فراموش کر دیا اور غرور و گھمنڈ کے نشہ میں سرشار ہو کر داخل ہوئے۔ اس لئے انھوں نے گو کہ خدا کی اس بات کو بھی بدل دیا مگر اس کا انعامات سے کیا تعلق؟ انعام تو دراصل خدا کی خلافت و نیابت پر قائم ہونا تھا یہ تو اس انعام کو پا کر شکر و سپاس ادا کرنے کا ایک طریقہ تھا اس لئے اب جب کہ ان پر انعامات گنائے جا رہے ہوں اور ان کے انعامات کو پس پشت ڈالنے کی روداد سامنے لائی جا رہی ہو تو اس ضمن میں اس انعام و اعزاز کا جب ذکر کیا گیا تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انھوں نے اس میں تبدیلی کی تھی اور اسی تبدیلی کا ذکر یہاں مقصود ہے ہرچند کہ شکر و سپاس کے طریقہ کو ترک کر کے استکبار کا رویہ اختیار کر لینا بھی ایک تبدیلی ہے لیکن چونکہ اس کا انعام و اعزاز سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے اس لئے موزوں یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تبدیلی کو مراد لیا جائے۔

(۲) دوسری دلیل پہلی دلیل کا ایک جزء ہے کہ یہود کو اصل میں عمالقہ سے جنگ کر کے بیت المقدس میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تھا اور اسی ضمن میں داخلہ کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن انھوں نے دونوں

کو بدل ڈالا اسی لئے روایتوں میں وادخلوا الباب سجدا وقولوا حطۃ کی تفسیر اس طرح مذکور ہوئی ہے جیسے ہمارے مفسرین بیان کرتے ہیں مگر یہ تو ایک ضمنی بات ہے جو اس میں شامل تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن اسی کو اصل نہیں قرار دیا جا سکتا اس لئے میرے نزدیک اس آیت میں اسی اصل تبدیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے باقی ضمناً وہ بھی شامل ہو جائے گی۔

(۳) یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی اصل اور صحیح تعبیر کو سمجھنے کے لئے خود قرآن سے رہنمائی طلب کرنا ضروری ہے اسی لئے سلف سے لے کر خلف تک یہ اصول مسلمہ چلا آرہا ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا (قرآن کے بعض اجزاء بعض کی تفسیر کرتے ہیں) اگر یہ اصول صحیح اور صائب ہے تو پھر ہماری تاویل حسن تاویل کا بہترین نمونہ ہے کیوں کہ قرآن کا یہ نہایت معروف طریقہ بیان ہے کہ وہ ایک ہی بات کو کہیں مجمل طور سے بیان کرتا ہے مگر دوسرے مقام پر اسے واضح کر دیتا ہے۔

(۴) خود روایتوں کو اگر وہ صحیح الاسناد ہیں پوری آیت کے لئے بنیادِ تفسیر نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ ایک جزو کی تفسیر ہیں یہ بڑی زحمت ہے کہ لوگ روایتوں کو لے کر چلتے ہیں مگر یہ نہیں غور کرتے کہ اس سے نتائج کیا کیا اور کہاں تک پیدا ہو سکتے ہیں، متقدمین کے یہاں تو اس طرح کوئی غلط فہمی نہیں واقع ہوتی مگر متاخرین کے یہاں اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایک دوسرے پر ترک حدیث کا الزام لگا دیا جاتا ہے اور پھر یہاں تو کسی روایت سے یہ ثابت بھی نہیں ہوتا کہ یہود نے کوئی اور تبدیلی نہیں کی تھی اور آیت زیر بحث میں صرف داخلہ کے وقت ہی کی تبدیلی مراد ہے بلکہ قرآن تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ انھوں نے داخل ہونے ہی سے انکار کر دیا اور ایک دوسری بات بنا ڈالی جو خدا کی بات کے علاوہ تھی۔

(۵) یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ نے ہماری تاویل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اتنی کھلی اور واضح ہے کہ اس کی کسی تفسیر و توضیح کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ قرآن نے اس بات کو دوسری جگہ بالکل صاف کر دیا ہے اور اب ہمیں خود اپنی فہم و فراست سے اسے معلوم کرنا چاہیئے۔ یہ یاد رکھیئے کہ کتابِ حکیم ہمیں تدبر و تفکر کی دعوت دیتی ہے اور اس امر کی تلقین کرتی

ہے کہ اپنے ذہن و دماغ پر زور ڈال کر اس کی آیات کے مطالب معلوم کریں۔

یہ چند باتیں تھیں جو اس آیت کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمارے قلم کی غلطیوں کو معاف کرے اور اس کے غلط اثرات سے لوگوں کو محفوظ رکھے رَبَّنَا لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

تزکِ بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۱۲)

خلیل | قلعہ مادو، اوش کے قلعوں میں سے ایک قلعہ ہے۔ جو اس زمانے میں بہت مشہور بھی تھا اور مضبوط بھی تھا۔

تنبل نے اپنے چھوٹے بھائی خلیل کو اس قلعے کے انتظام کے لئے چھوڑ رکھا تھا کوئی ڈھائی سو آدمی اس کے ساتھ تھے۔

قلعہ مادو | ہم پلٹ کر پہنچے اور مادو کے قلعے پر سخت لڑائی لڑے قلعہ بہت مضبوط ہے۔ اس کے شمال کی طرف ایک دریا ہے۔ وہ اتنا اونچا ہے کہ وہاں سے تیر مارا جاتے تو شاید فصیل کے اندر نہ پہنچے اس کا ایک نالہ اسی طرف بہتا ہے قلعے کے نیچے دونوں طرف ایسی فصیل ہے کہ گلی سی بن گئی ہے اور وہ دریا تک گئی ہے پشتے کے چاروں طرف خندق ہے۔ دریا پاس ہی ہے۔ وہاں سے توپ کے گولوں کے برابر بڑے بڑے پتھر لاکر قلعے میں جمع کر لئے۔

پتھروں کی بارش | بہت بڑے بڑے پتھر قلعہ مادو سے برسائے گئے۔ بہوتے کو اور قلعوں پر بھی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مگر کسی قلعے سے اتنے پتھر کسی نے نہیں برسائے۔

عبدالقدوس کو ہیم بال بال بچا | کتہ بیگ کا بڑا بھائی عبدالقدوس فصیل کے نیچے پہنچ گیا تھا۔ فصیل سے اس پر اتنے پتھر برسے کہ اس کا پاؤں کہیں نہ ٹک سکا اور وہ معلق ہو کر اس طرح گرا۔ کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر تھے۔ وہ اتنی اونچی جگہ سے لڑھکتا ہوا ٹیلے کے نیچے آپڑا۔ لیکن بال بال بچا۔ اور اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر میں آپہنچا۔

یار علی بلال | یار علی بلال کے سر میں ایک پتھر لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے لڑکے نے زخم باندھا۔

پتھروں کی مار | اس لڑائی میں بہت سے لوگ پتھروں سے مرے۔

دریائی نالے پر قبضہ | دوسرے دن جو لڑائی ہوئی تو صبح دس بجے سے پہلے ہی دریائی نالے پر قبضہ ہو گیا۔ لڑائی شام تک جاری رہی۔ دریائی نالے پر جو قبضہ ہو گیا۔ تو دشمن پانی نہ لے سکے[1]

خلیل کی گرفتاری | صبح انھوں نے جان کی امان چاہی اور باہر نکل آئے۔

ان کے سردار، خلیل کو جو تنبل کا چھوٹا بھائی تھا۔ ستر اسی بلکہ سو آدمیوں کے ساتھ گرفتار کر کے اندجان بھیج دیا۔ تاکہ احتیاط کے ساتھ وہاں نظر بند رکھا جائے۔

ہمارے امرا، سردار اور اچھے اچھے سپاہی دشمنوں کی قید میں تھے یہ اچھا بدلہ مل گیا۔

آمنے سامنے | مادو کی فتح کے بعد ہم اوشتو[2] نام کے گاؤں میں جا اُترے جو اوش کے علاقے میں ہے ادھر تنبل اندجان سے واپس آ کر آنجان میں جا ٹھیرا۔ جو رباط سرہنگ اور جینی کے دیہات میں ہے۔ دونوں لشکروں کا فاصلہ چار میل ہو گا۔

قنبر علی کی بیماری | ان ہی دنوں قنبر علی بیمار ہو کر اوش چلا گیا۔ ہم کوئی چالیس دن یا مہینہ بھر وہیں پڑے رہے۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے غلّہ لانے والے اور دشمن کے غلہ لانے والے روز لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔

سیدی بیگ کی گرفتاری | راتوں کو لشکر کے چاروں طرف زبردست بندوبست ہوتا تھا۔ خندقیں کھودی گئی تھیں۔ جہاں خندق نہ تھی وہاں جھانکھڑ لگا دیئے تھے۔ اور جتنی فوج تھی سب کی سب خندق کے کنارے ہتھیار بند رہتی تھی۔

اتنی احتیاط پر بھی تیسری چوتھی رات کو لشکر میں غل مچ جاتا تھا۔

ایک دفعہ سیدی بیگ طغائی غلّہ لانے والوں کا سردار بن کر گیا۔ غنیم کے سپاہیوں نے ایکا ایکی

---

[1] پانی پر قبضہ ہو گیا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر باہر نہ ٹھیر سکے [2] مسز جان لیڈی نے متن میں ادشتو لکھا ہے ایک ترکی نسخے میں ادشو ہے۔

جا گھیرا۔ اور لڑائی میں سیدی بیگ پکڑا گیا۔

بائسنقر کی موت | اسی برس خسرو شاہ نے بلخ پر حملے کا ارادہ کیا۔ اور اسی خیال سے بائسنقر مرزا کو بلا کر تندز لے گیا اور بلخ روانہ ہوا۔

جب وہ اوباج کے مقام پر پہنچا۔ تو کم بخت کافرِ نعمت خسرو شاہ کو سلطنت کی ہوس ہوئی۔ اور اس نے بائسنقر مرزا جیسے خوش طبع، پر فضیلت اور صاحب حسب ونسب شہزادے کو امرا سمیت گرفتار کر لیا۔ اور دسویں محرم کو کمان کے حلقے سے پھانسی دے کر شہید کر دیا اور اس کے امرا اور مصاحبوں کو بھی مار ڈالا۔

خسرو کی کمینگی | سلطنت کہیں ایسے نالایق اور بے ہنر آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ جس کا نہ حسب نسب درست ہو اور نہ کوئی حیثیت ہو۔ اور نہ جس میں ہنر ہو نہ تدبیر، نہ شجاعت نہ انصاف اور نہ عدالت۔

بائسنقر کا نسب | مرزا کی پیدائش اور اس کا نسب:۔

وہ ۸۸۲ھ میں حصار میں پیدا ہوا۔ وہ سلطان محمود مرزا کا منجھلا بیٹا تھا۔ سلطان مسعود مرزا سے چھوٹا، اور سلطان علی مرزا، سلطان حسین مرزا اور سلطان ویس مرزا (جو خان مرزا مشہور ہے) سے بڑا۔

اس کی ماں کا نام پشہ بیگم تھا

بائسنقر کی صورت شکل | بائسنقر کا حلیہ یہ ہے

بڑی بڑی آنکھیں، گول چہرہ، میانہ قد، بلیح جوان، چہرہ کا ڈول ترکمانوں جیسا۔

بائسنقر کے طور طریق | اخلاق واطوار یہ تھے:۔

وہ عادل، خوش طبع انسان اور صاحب فضیلت شہزادہ تھا

بائسنقر کا عقیدہ | اس کا استاد سید محمود شیعہ تھا۔ اسی لئے بائسنقر مرزا بھی بدنام تھا۔ کہتے ہیں۔ آخر سمرقند میں اس نے عقیدہ بدل لیا۔ اور پاک اعتقاد ہو گیا تھا۔

---

[1] ایک معروف راستہ ہے اور قبادین کے قریب ہے۔

بائسنقر کا کلام | وہ شراب کا بہت شوقین تھا۔ جب شراب نہ چڑھائے ہوتا تو نماز پڑھتا شراب کے نشے میں نماز نہ پڑھتا تھا۔

اس کی سخاوت اور فیاضی وسط درجے کی تھی۔ خط نستعلیق کا خوش نویس تھا مصور بھی بُرا نہ تھا۔ شعر بھی خاصا کہتا تھا۔ عادلی[1] تخلص تھا۔ اس کا کلام اتنا زیادہ نہیں ہے کہ دیوان مرتب ہو جاتا۔ یہ مطلع اُسی کا ہے[2]۔

سایہ وار از ناتوانی جا بجا می اوفتم گر نہ گیرم رو ئے دیوار نہ پا می اوفتم

سمرقند میں اس کی غزلیں اتنی مشہور ہیں۔ کہ ہر گھر میں اُن کے اشعار سُن لو۔

بائسنقر کی لڑائیاں | وہ دو لڑائیاں لڑا ہے۔

ایک دفعہ سلطان محمد خاں سے لڑا۔

بائسنقر مرزا کے تخت نشین ہوتے ہی سلطان جنید برلاس وغیرہ فتنہ پردروں کے بہکانے اور کھٹر کانے سے سلطان محمود خاں نے سمرقند چھیننے کے لئے حملہ کیا۔

وہ آق کوتل[3] ہوتا ہوا رباط سند اور کنبائی کے آس پاس پہنچا۔

بائسنقر مرزا بھی سمرقند سے نکلا اور کنبائی میں مقابلہ کر کے محمود خاں کو شکست فاش دی۔

تین چار ہزار مغل بائسنقر مرزا کے حکم سے قتل کئے گئے۔ حیدر کو کلتاش بھی جو خان کا بہت منہ لگا تھا۔ اسی لڑائی میں مارا گیا۔

دوسری دفعہ بخارا میں سلطان علی مرزا سے لڑائی ہوئی اور بائسنقر مرزا کو شکست ہوئی۔

بائسنقر کے مقبوضہ ملک | اس کے قبضے میں یہ ملک تھے :۔

اس کے باپ سلطان محمود مرزا نے اس کو بخارا دیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد امراء نے متفق ہو کر اسے سمرقند کا بادشاہ بنایا۔

کچھ مدت تک بخارا اس کی سلطنت میں شامل رہا۔ لیکن ترخانیوں کی بغاوت کے بعد بخارا

---

[1] عادلی [2] یہ شعر اس کی ایک مشہور غزل کا ہے [3] آق کوتل یعنی سفید راستہ جو آق تاغ پہاڑوں میں ہے۔

قبضے سے نکل گیا۔

میں نے جب سمرقند فتح کرلیا۔ تو وہ خسرو شاہ کے پاس چلا گیا۔ اور خسرو شاہ نے حصار چھین کر اسے دے دیا۔

بائسنقر کی ملکہ | جب وہ خسرو شاہ کے پاس گیا۔ اس زمانے میں اس نے اپنے چچا سلطان خلیل مرزا کی لڑکی سے شادی کی۔ اس کے علاوہ کوئی اور بیوی یا لونڈی نہ تھی۔

بائسنقر کے امراء | اس نے اتنی جم کر حکومت نہیں کی کہ کسی ایک آدمی کو بھی بڑھایا ہو اور امیر بنایا ہو اس کے امراء وہی تھے۔ جو اس کے باپ اور چچا کے امراء تھے۔

سلطان احمد قراول کی آمد | بائسنقر کی شہادت کے بعد قوچ بیگ کا باپ سلطان احمد قراول اپنے بھائیوں، عزیزوں، بال بچوں اور نوکروں سمیت قراتگین[1] سے روانہ ہوا۔ اس نے مجھے خبر بھیجی اور پھر میرے پاس آگیا۔

قنبر علی کی آمد | قنبر علی اوش میں بیمار پڑا تھا تندرست ہوا تو وہ بھی چلا آیا۔

نیک شگون | اس نازک موقعہ پر سلطان احمد قراول جو اپنے ہمراہیوں سمیت غیبی امداد لے کر آگیا۔ تو میں نے اسے نیک شگون سمجھا۔ اور دوسرے دن صبح سامان ٹھیک ٹھاک کر کے ہم دشمن کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔

دشمن کے پڑاؤ میں | دشمن آسنجان میں نہ ٹک سکا۔ اور اپنے پڑاؤ سے چل پڑا۔ ہم اسی کے پڑاؤ میں جا اترے تھوڑا سا سامان فرش فروش، ڈیرے خیمے وغیرہ ہمارے لشکر کے ہاتھ لگے۔

تنبل خوبان میں | تنبل اسی رات جہانگیر مرزا کو لئے ہوئے ہماری بائیں طرف سے ہوتا ہوا خوبان[2] نام کے گاؤں میں چلا گیا۔ جو ہمارے پہلو میں اندجان کی طرف اندازاً بارہ میل ہوگا۔

---

[1] مسز جان لیڈی نے بھی قراتگین لکھا ہے لیکن قلمی نسخے میں قراتگین ہے۔

[2] خوبان، حصار اور ختلان کے شمالی اور فرغانہ کے جنوبی پہاڑوں میں ہے۔ ایک ترکی نسخے میں اس کو جونان بھی لکھا ہے۔

لڑائی کی تیاریاں دوسرے دن ہم نے بھی دائیں بائیں اور آگے پیچھے فوجوں کو ترتیب دیا۔ ہتھیار لگائے۔ صف بندی کی۔ اور ان پیدلوں کو جو تورا[1] اٹھائے ہوئے تھے۔ اپنے آگے کیا اور دشمن کی طرف چلے۔

لشکر کی ترتیب دائیں طرف علی دوست طغائی اور اس کے آدمی تھے۔ بائیں طرف ابراہیم سارد ولیس لاغری، سیدی قرا، محمد علی مبشر، کن جنگ بیگ[2] (خواجہ کلاں کا بھائی) اور بعض دوسرے مصاحبوں کو مقرر کیا۔ ان کے ساتھ سلطان احمد قراول اور کوبج بیگ اور ان کے ساتھی بھی مقرر کئے گئے۔ قاسم بیگ میرے پاس لشکر کے بیچ میں تھا۔ اور قنبر علی لشکر کے آگے آگے تھا۔

پہلی باقاعدہ لڑائی قنبر علی اور ہمارے بعض دوسرے مصاحب اور ملازم جب سقانامی گاؤں میں پہنچے۔ جو خوبان سے کوس بھر جنوب و مشرق میں ہے تو دشمن خوبان سے ٹھیک ٹھاک ہو کر نکلا۔ اور ہم بھی پوری احتیاط کے ساتھ بہت جلد آگے بڑھے۔ توروں اور پیادوں کو ترتیب دے دی گئی تھی۔ لیکن وہ مقابلے کے وقت پیچھے کہیں رہ گئے۔ خدا کے فضل سے ان کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اور ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے دائیں بازو کی فوج اور دشمن کا بایاں بازو دو بدو لڑنے لگے۔ خواجہ کلاں کا بھائی کن جنگ بیگ بڑی جواں مردی سے لڑا۔ اس کے بعد محمد علی مبشر نے بھی خوب بہادری دکھائی۔ دشمن اتنا سا حملہ بھی نہ جھیل سکا اور بھاگ نکلا۔

دشمنوں کا قتل بہت سے دشمن گرفتار ہو کے آئے تو میں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ ہمارے امراء میں سے قاسم بیگ اور علی دوست بیگ نے لیکن زیادہ تر علی دوست بیگ نے احتیاط کے خیال اور نقصان کے ڈر سے بھگوڑوں کا دور تک پیچھا کرنے کے لئے کسی کو نہ بھیجا۔ اس

---

[1] تورا کے معنی قاعدہ ہے۔ نہ جانے یہاں کن معنوں میں استعمال ہوا ہے

[2] کی چک بیگ (چھوٹا سردار) خواجہ کلاں کا بڑا بھائی تھا۔

لئے ان کے بہت سے آدمی گرفتاری سے بچ گئے۔

ہم نہیں خوبان میں جا اُترے۔ میں پہلے پہل باقاعدہ لڑائی یہی لڑا ہوں۔ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے فتح عنایت کی اور میں نے اس کو نیک شگون جانا۔

جہانگیر سے دادی کی محبت | دوسرے روز میری دادی شاہ سلطان بیگم اندجان پہنچیں۔ تاکہ جہانگیر مرزا پکڑا گیا ہو تو اُسے چھڑالیں۔

اندجان واپس گئے | جاڑا قریب آن لگا تھا۔ آس پاس کہیں بھی غلے اور گھاس کا نام ونشان نہ تھا۔ اس لئے اور کند پر حملہ مناسب نہ جانا۔ اور ہم اندجان واپس چلے گئے۔

ارمیان اور نوشاب | چند دن بعد مشورہ ہوا اور یہ تجویز قرار پائی کہ اندجان میں جاڑا گذارا جائے تو ہم دشمن کو تو کیا نقصان پہنچائیں گے الٹا ڈر یہ ہے کہ دشمن کہیں چوری چھپے اپنا کام نہ کرجائے۔ اس لئے جاڑا ایسی جگہ گذارنا چاہیئے۔ جہاں ہمارے لشکر کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو اور ہم دشمن کو تنگ بھی کرتے رہیں۔

اس مصلحت کے مدنظر ہم نے اندجان سے رباطک اور چینی کی طرف چل کر ارمیان اور نوشاب کے قریب قیام کیا۔

سیر وشکار | وہاں شکار کھیلنے کے عمدہ موقعے ہیں۔ اور کھیل تماشوں کے لئے اچھے میدان ہیں۔ انلامیش[1] دریا کے قریب جنگلوں میں پہاڑی بکریاں، بارہ سنگھے، اور سؤر بہت ہوتے ہیں اور جنگل کے ان حصوں میں جہاں دور دور جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں۔ جنگلی جانور اور خرگوش بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور رنگ برنگ کے ہوتے ہیں۔ وہاں کی لومڑی اور جگہ کی لومڑیوں سے بہت تیز رفتار ہوتی ہے

میں وہاں کے قیام کے زمانے میں دوسرے تیسرے دن شکار کھیلنے جاتا تھا۔ اور بڑے بڑے جنگلوں کو کھنگال کر بارہ سنگھوں اور پہاڑی بکریوں کا شکار کھیلتا تھا۔ وہاں کے تنگ جنگلوں میں جنگلی پرندوں پر شکاری جانور چھوڑے جاتے تھے۔ اور دوشاخہ تیروں سے بھی گرائے جاتے تھے۔ وہاں کا جنگلی پرندہ بہت موٹا تازہ ہوتا ہے۔ جب تک ہم وہاں رہے۔ جنگلی جانوروں کا ڈھیروں گوشت

---

[1] الامیش

پڑا رہتا تھا۔

تنبل کے ساتھیوں کے سر کاٹے | اسی زمانے میں خدا بیردی نشان بردار نے جسے میں نے مہربانی سے نیا نیا امیر بنایا تھا۔ کئی دفعہ تنبل کے رسد لانے والوں کو زیر کیا اور ان کے سر کاٹ کاٹ لایا۔

اوش اور اندجان کے جوانمرد سپاہیوں نے بھی دشمن کو متواتر پریشان کیا۔ دھوکے سے ان کے علاقوں کو تباہ کرتے رہے۔ ان کے گھوڑے پکڑ لائے۔ آدمیوں کو مار ڈالا اور انھیں خوب پریشان کیا۔

تنبل کی ضد | ہم سارے جاڑے وہیں رہتے تو تعجب نہ تھا کہ گرمیوں کے آتے آتے دشمن کو بے لڑے بھڑے تباہ کر دیتے۔ اتنے قلیل عرصہ ہی میں ہم نے اسے تنگ کر دیا اور عاجز بنا دیا تھا۔

عین اس موقع پر قنبر علی نے اپنے علاقہ میں واپس جانے کی اجازت مانگی۔ اس کو ہر چند اونچ نیچ سمجھائی اور منع کیا۔ مگر وہ اور بھی ضد کرنے لگا۔ بہت بے وقوف اور ضدی آدمی تھا۔ مجبوراً اُسے جانے کی اجازت دینی پڑی۔

قنبر کا علاقہ | اس کے علاقے میں پہلے خجند تھا۔ اس دفعہ جواندجان لیا۔ تو اسفرہ اور کند بادام بھی اُسے دے دئے۔

ہمارے اُمراء میں قنبر علی کے پاس ہی سب سے زیادہ علاقہ اور سب سے زیادہ آدمی تھے۔ جتنا وہ ذی مقدور تھا۔ اتنا کوئی اور نہ تھا۔

مجبوراً واپس ہونا پڑا | ہم چالیس پچاس دن تک وہاں رہے۔ قنبر علی کی وجہ سے اور لوگوں کو بھی رخصت دینی پڑی اور بالآخر ہم بھی اندجان چلے گئے۔

ماموں کو ورغلانے کی کوشش | جتنے عرصے ہم وہاں ٹھیرے۔ تنبل کے آدمی جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ اور خان کے پاس تاشقند بھی لوگ آتے جاتے رہے۔

تنبل کے دو ادر بھائی | احمد بیگ (جو سلطان محمود خاں کے بیٹے سلطان محمد سلطان کی سرکار کا مختار کل اور خان کا ٹرامنہ لگا سردار اور تنبل کا چچیرا بھائی تھا) اور بیگ تلبہ (جو خان کے ہاں داروغہ دیوان خانہ تھا اور تنبل کا سگا بڑا بھائی تھا) نے خان اور تنبل کے پاس آ جا کر خان کو آمادہ کر لیا کہ وہ تنبل کی مدد

کرے۔

بیگ تلبہ جب سے پیدا ہوا مغلستان ہی میں رہا۔ اور مغلوں ہی میں رہ کر چھوٹے سے بڑا ہوا۔ نہ کبھی ہمارے ملک میں آیا۔ اور نہ اس ملک کے کسی بادشاہ کی خدمت میں رہا۔ اس نے ہمیشہ ان ہی خان بھائیوں کی خدمت کی تھی۔

اب وہ اپنے گھر بار اور بیوی بچوں کو تاشقند میں چھوڑ کر خود اپنے چھوٹے بھائی تنبل کے ساتھ ہو گیا۔

قاسم عجب کی گرفتاری | اسی عرصہ میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ میں قاسم عجب کو عارضی طور پر آخشی میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چند آدمیوں کے ہمراہ دشمنوں کے تعاقب میں نکلا اور دریائے خجند پار کر کے ہجرآتا پہنچا۔ کہ ایکا ایکی تنبل کے ایک بڑے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا اور وہ فوراً ہی پکڑا گیا۔

سلطانیم نے کاشان گھیرا | تنبل نے جب ہمارے لشکر کی واپسی کی خبر سنی، اور اس کا بڑا بھائی بیگ تلبہ، خان سے معاملہ طے کر کے آ گیا اور اس کو کمک آنے کا یقین ہو گیا تو تنبل اور کند سے میان دو آب جا پہنچا۔

اسی عرصہ میں کاشان سے تحقیق خبر آئی۔ کہ خان نے تنبل کی مدد کے لئے اپنے بیٹے محمد سلطان خانیکہ (عرف سلطانیم) کو معہ احمد بیگ کے مقرر کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ پانچ چھ ہزار آدمی ہیں۔ اور انھوں نے ارچہ کنت کے راستے سے کاشان کو جا گھیرا ہے۔

بلا کی سردی | ہم نے بھی ان لوگوں کا انتظار نہیں کیا۔ جو ادھر ادھر گئے ہوئے تھے۔ جتنے آدمی موجود تھے۔ ان ہی کو ساتھ لیا۔ اور اللہ پر توکل کر کے بے توقف اسی کڑکڑاتے جاڑے میں چل پڑے۔ اور اندجان سے سلطانیم اور احمد بیگ پر حملہ کرنے کے لئے بند سالار کے راستے سے روانہ ہوئے۔

رات بھر دم لینے کو کہیں نہ ٹھیرے۔ دوسرے دن آخشی میں قیام کیا۔ اس رات ایسی بلا کی سردی تھی کہ بعض آدمیوں کے ہاتھ پاؤں ٹھٹر گئے اور بہت سے آدمیوں کے کان ایسے ہو گئے جیسے

ہجرآتا، اوزکند، ارچہ قند

مرجھائے ہوئے سیب ہوتے ہیں۔

یارک طغائی آخشی میں ہم زیادہ نہ ٹھیرے۔ یارک طغائی کو عارضی طور پر قاسم عجب کی جگہ چھوڑا۔ اور ہم کاشان پر جا پہنچے۔

احمد بیگ۔ اور سلطانیم کی بزدلی کاشان تقریباً کوس بھر ہوگا۔ جو خبر ملی۔ کہ احمد بیگ اور سلطانیم ہمارے آنے کی خبر سن کر پریشان ہوگئے اور فوراً بھاگ کھڑے ہوئے۔

تنبل آن پہنچا تنبل کو جو ہمارے پہنچنے کی خبر ملی۔ تو وہ اپنے بڑے بھائی کی مدد کے لئے آن پہنچا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا کہ تنبل کے لشکر کے سپاہی توکند[1] کی طرف سے نمودار ہوئے۔ تنبل اپنے بڑے بھائی کے بے موقعے اور جلدی پلٹ جانے اور ہمارے یکایک پہنچنے پر حیران رہ گیا۔

سنہری امیدیں میں نے کہا کہ خدا کی کارسازی ہے کہ وہ ان کو اس طرح لایا۔ کہ ان کے گھوڑوں میں تھکن کے سبب دم نہیں رہا ہے۔ لڑائی ہو جانے تو خدا سے امید ہے کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہ جا سکے گا۔

ویس لاغری کا مشورہ ویس لاغری وغیرہ نے عرض کیا کہ دن تمام ہوا۔ آج مقابلہ نہ بھی ہو۔ تو یہ بچ کر کہاں جائیں گے۔ کل یہ جہاں ہوں گے۔ ہم وہیں ان کا بھرتہ بنا دیں گے۔

قابو میں آیا ہوا دشمن یہی فیصلہ ہوگیا اور اس وقت لڑائی مناسب نہ جانی۔ اس طرح دشمن کا قابو میں آکر بچ نکلنا اس ترکی مثل کا مصداق ہوا کہ قابو میں آجانے والے کو چھوڑ دیا جائے۔ تو بڑھاپے تک افسوس کرنا پڑتا ہے۔

قلعہ ارخیان دشمن نے صبح تک کی فرصت کو غنیمت جانا۔ اور راتوں رات وہ کہیں ٹھیرے بغیر ارخیان کے قلعے میں چلا گیا۔

بمسکان صبح جب ہم نے دشمن پر چڑھائی کی تو وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ لیکن ہم نے ارخیان کے قلعے کے پاس محاصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کوس بھر کے

---

[1] توکند، اوزکند اور کاشان کے بیچ میں ستر کے شمال میں ہے۔

فاصلے پر منسکان[1] نام کے گاؤں میں ڈیرے ڈالے۔

شب خون | تیس چالیس دن تک ہم اسی پڑاؤ میں پڑے رہے اور تنبل ارخیان کے قلعے میں رہا۔ کبھی کبھی دونوں طرف کے کچھ لوگ آپس میں اُلجھ جاتے۔ اور دو دو ہاتھ کر کے اُلٹے پھر جاتے۔ ایک رات انھوں نے شب خون مارا۔ لیکن ہمارے لشکر کے چاروں طرف خندق کھدی ہوئی تھی۔ اور جھانکڑ لگے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ لشکر تک نہ پہنچ سکے اور تھوڑے سے تیر مار کر واپس چلے گئے۔

قنبر کے نخرے | ہم جب وہیں تھے تو قنبر علی نے دو تین دفعہ بگڑ کر اپنے علاقے میں واپس جانا چاہا۔ ایک دفعہ تو چل ہی دیا تھا۔ بعض اُمراء کو بھیج کر بڑی مشکل سے اُسے واپس بلایا۔

یوسف کی بغاوت | اسی دوران میں سید یوسف مچمی[2] نے سلطان احمد تنبل کے پاس آدمی بھیجے۔ اور اس سے ساز باز کر لی۔

اندجان کے پہاڑوں کے دامن میں جو ضلعے ہیں۔ ان میں سے ادی عوز اور مچم[3] دو ضلعے بہت مشہور ہیں۔ سید یوسف مچم میں بڑا آدمی تھا۔ رفتہ رفتہ میری سرکار میں روشناس ہوا۔ اور اپنی حد سے بڑھ گیا۔ اسے کسی نے امیر نہیں بنایا۔ لیکن وہ خود امیری کا دعویٰ کرنے لگا۔ وہ بے حد منافق اور تلون مزاج آدمی تھا۔

اس مرتبہ جب سے میں نے اندجان لیا۔ وہ دو تین دفعہ تنبل سے باغی ہو کر مجھ سے مل گیا اور دو تین دفعہ مجھ سے بغاوت کر کے تنبل سے جا ملا۔

اس خیال سے کہ وہ تنبل کے پاس نہ پہنچ جائے۔ ہم نے اس کو راستے ہی میں گھیرنا چاہا اور اور ہم سوار ہو گئے۔

پشت خاران | تیسرے دن ہم پشت خاران[4] پہنچے۔ لیکن تنبل کا لشکر پشت خاران کے قلعے میں داخل ہو چکا تھا۔

قوچ بیگ کی بہادری | اس حملے میں جو سردار ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں سے علی درویش بیگ اور

[1] منسکان یا منس کان [2] مچمی [3] مچم [4] بیش خاران

قوچ بیگ اپنے بھائیوں کے ساتھ پشت خاران کے دروازے پر جا پہنچے۔ اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔

قوچ بیگ اور اس کے بھائیوں نے اکثر معرکوں میں بہادری کے جوہر دکھا کر ناموری حاصل کی ہے۔

علی دوست اور قنبر کی بے ایمانی ہم پشت خاران سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ اترے۔ تنبل بھی جہانگیر مرزا کو لئے ہوئے آگیا۔ اور پشت خاران کے قلعے کو پیٹھ کے پیچھے چھوڑ کر اتر پڑا۔

تین چار دن بعد ہمارے ان امراء میں سے جو ہمارے مخالف تھے۔ علی دوست اور قنبر علی سلاخ نے اپنے ساتھیوں اور رشتے داروں سمیت صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ ہمارے طرف داروں میں سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہم بالکل راضی نہ تھے۔ لیکن بڑے دو امیر وہی مردود تھے ان کی بات نہ مانتے اور صلح نہ کرتے تو اور مصیبت تھی۔

بھائی سے دب کر صلح کرنی پڑی مجبوراً اس طرح صلح کرنی پڑی کہ دریائے خجند سے آخشی تک کا علاقہ جہانگیر مرزا لے لے اور اندجان کی طرف جو علاقہ ہے۔ وہ میرے پاس رہے۔ اور کند سے وہ اپنے بال بچوں کو بلا لے اور پھر اسے میرے قبضے میں دے دے۔

اس تقسیم کے بعد میں اور جہانگیر مرزا مل کر سمرقند پر حملہ کریں۔ سمرقند فتح ہو جائے تو اسے میں لے لوں اور اندجان جہانگیر مرزا کو دے دیا جائے۔

صلح کی شرطیں طے ہو جانے کے بعد دوسرے دن جہانگیر مرزا اور تنبل آئے رجب[1] کی آخری تاریخیں تھیں جب وہ میرے ہاں آئے تھے اور مقررہ شرائط پر عہد و پیمان ہوا تھا۔

قیدیوں کی رہائی جہانگیر مرزا کو آخشی جانے کی اجازت دی اور میں اندجان پہنچا۔

اندجان پہنچتے ہی تنبل کے چھوٹے بھائی خلیل وغیرہ جو قید تھے۔ ان کو میں نے چھوڑ دیا۔ اور سب کو خلعت دے کر رخصت کیا۔

انھوں نے بھی ہمارے امراء اور مصاحبوں کو (مثلاً طغائی بیگ، دوست محمد، میر شاہ قوچین سیدی بیگ، قاسم عجب، پیر ویس اور میرم دیوان جو قید تھے) رہا کر کے بھیج دیا۔

---

[1] آخر فروری ۹۹ء

قومی اور جماعتی زندگی کے نفسیاتی مؤثرات

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۲)

چوتھا تربیت ہے۔

تربیت کا براہِ راست تعلق قلب سے ہے جو زندگی اور حرکت کا سرچشمہ ہے۔ تربیت ہی کے ذریعہ قوم فلسفۂ حیات کی حقیقت کو سمجھتی ہے اور اعلیٰ مقصد کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔

تربیت کا مقصد ضبطِ نفس اور جذبات پر حکومت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے

تربیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ ضبط نفس اور جذبات وخیالات پر حکومت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو تاکہ وراثت کے غلط اثرات سے بچنے اور ماحول پر قابو پانے کی ہمت ہو[1]

قرآن حکیم میں تربیت کی بنیاد یہ آیت ہے

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۶۲/۲

اللہ ہی نے ان پڑھ لوگوں میں انھیں میں کا ایک رسول بھیجا جو لوگوں کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے

دوسری آیت یہ ہے

---

[1] افلاطون - ارسطو - نیوتسکیو کے نزدیک تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو بہترین حکومت مرتب کرسکیں ابن خلدون اور اسپنسر کے نزدیک یہ ہے کہ ایسے اشخاص تیار کئے جائیں جو زندگی اچھی طرح بسر کرسکیں۔

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۲/۱۴۷

وہ رسول تمھارے آگے ہماری آیتیں پڑھتا ہے تمھیں پاک کرتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور جو تم نہیں جانتے وہ سکھاتا ہے

آیت میں داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے چار کام گنائے گئے ہیں

(۱) تعلیم کتاب ۔ نظام زندگی اور قانون حیات کی تعلیم ۔

(۲) تعلیم حکمت ۔ نظام عملی کی حقیقت اور اس فلسفہ کی تعلیم جس پر قانون کی بنیاد ہے

(۳) اس کے علاوہ اور دیگر معلومات کی تعلیم جو حالات و تقاضے کے مناسبت سے وقتی ہوں یا دائمی ۔

(۴) تزکیہ ۔ عقائد و خیالات کی صفائی اور اعمال و اخلاق کی درستی یعنی غلط نظریات و عقاید سے شیشۂ دل و آئینۂ دماغ کی پاکی و صفائی اور صحیح اصول و نظریات کو اس کی جگہ بٹھانا اسی طرح برے اخلاق و گندے اعمال سے پرہیز اور اچھے اعمال و عمدہ اخلاق کا خوگر بنانا ۔

عام طور پر تربیت کا تعلق صرف تزکیہ سے سمجھا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جاتے تو اس کا تعلق ان چاروں سے ہے کیوں کہ تربیت کے بغیر ہر قسم کی تعلیم بے جان ہو کر رہ جاتی ہے خواہ وہ حکمت و فلسفہ کی ہو یا نظام زندگی و قانون کی ۔

رسول اللہ ؐ نے صحابۂ کرام کی تربیت جس طرح کی تھی دنیا سے ان کا تعلق برقرار رہنے کے ساتھ دنیا ان کے لئے مقصود نہ تھی

بلکہ مقصد اعلیٰ کے حاصل ہونے کا ذریعہ اور اس کے لئے عمل کی جولانگاہ تھی، اسی قسم کی تربیت قومی اور جماعتی زندگی کے لئے مفید ہوتی ہے اور صالح انقلاب کے لئے پیش خیمہ بنتی ہے جس تربیت سے جمود و تعطل کی زندگی پیدا ہو وہ اغیار کے لئے تو مفید بن سکتی ہے لیکن زندگی اور حرکت کے جوہر نہیں پیدا کر سکتی ہے،

تربیت کے ذریعہ اوصاف کے استعمال کا رخ بدلا جا سکتا ہے اور عادتیں چھڑائی جا سکتی ہیں

رہی یہ بات کہ تربیت کے ذریعہ جذبات وخیالات پر کس حد تک قابو پایا جا سکتا ہے اس کو فنی اصطلاحات سے ہٹ کر اس طرح سمجھیے کہ انسان کے اندر دو قسم کی صفتیں پائی جاتی ہیں

(۱) وہ جن کا تعلق مزاج اور طبیعت سے ہے اس میں انسان کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے بلکہ وہ اس کی سرشت اور خمیر میں داخل ہیں مثلاً غصہ اور شہوت کی کمی بیشی ذکاوت وذہانت کند ذہنی قوت یادداشت معاملہ فہمی وغیرہ اس قسم کی صفتوں کو "جبلت" کہتے ہیں۔

علمی اصطلاح میں یہ اس کی نفسیاتی بنیادیں ہیں ان میں تبدیلی تقریباً ناممکن ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ غصہ اور شہوت کو تربیت کے ذریعہ ختم کر دیا جائے یا کند ذہن کو اعلیٰ قسم کا ذہین بنا دیا جائے البتہ ان کے استعمال کا رخ پھیرا جا سکتا ہے ان میں نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے رسول اللہ کی درج ذیل حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل تغیر عن خلقہ فلا تصدقوبہ فانہ یصیر الی ماجبل علیہ[1]

اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کو صحیح مان لینا لیکن اگر کسی شخص کے بارے میں سنو کہ اس کی خلقت بدل گئی تو اس کو صحیح نہ ماننا کیوں کہ بالآخر وہ اپنی جبلت کی طرف پھر لوٹ آئے گا۔

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تبدیلی نہ ہونے کی خبر دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی صفت بالکلیہ ختم ہو کر اس کی جگہ دوسری نہیں آسکتی ہے لیکن اگر تعلیم وتربیت کے ذریعہ استعمال کا رخ پھر جائے اور مظاہرہ کی شکل بدل جائے تو وہ اس حدیث کے خلاف نہ ہوگا۔

مربی اور مصلح کو چاہیے کہ ایسی صفتوں کے ختم کرنے کے درپے نہ ہو بلکہ ان کے استعمال کا رُخ بدلنے کی کوشش کرے اس کی صورت یہ ہے کہ قلب کی اصلاح ودرستی کے بعد زیادہ سے زیادہ اخلاق حمیدہ کا خوگر بنائے تاکہ غلط استعمال کا موقع نہ مل سکے۔

---

[1] مشکوٰۃ

(۲) وہ جن کا تعلق مزاج اور طبیعت سے تو نہیں ہے لیکن بار بار کرنے کی مشق سے ایسی عادت پڑگئی ہے کہ گویا طبیعت ثانیہ بن گئی ہے اس قسم کی صفتیں انسان کی اختیاری ہیں جس طرح قصد ارادہ سے عادت ڈالی گئی ہے اسی طرح طبیعت پر جبر اور سختی کے ذریعہ عادت چھوڑی بھی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں مربی اور مصلح کو چاہیئے کہ حسب حال نفسیات کا تجزیہ کرکے ان کے چھڑانے کے لئے مناسب صورتیں اختیار کرے[۱]

دراصل یہی دو قسم کی صفتیں ہیں جن کی بنا پر انسان جذبات و خیالات کا محکوم کہا جاتا ہے جب ان میں مذکورہ بالا طریقے پر تربیت کا اثر ظاہر ہو سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت حد تک تربیت کے ذریعہ جذبات و خیالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ کی حدیث اور صحابۂ کرام کی زندگی سے اس کا ثبوت

رسول اللہ کے درج ذیل فرمان سے یہی حقیقت ثابت ہوتی ہے

الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا[۲]

لوگ سونے اور چاندی کے کانوں کے مثل ہیں جو زمانہ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں جب کہ انھوں نے تفقہ حاصل کیا۔

حدیث میں اذا فقھوا کی قید نہایت غور و فکر کی مستحق ہے اس سے نہ صرف یہ کہ تربیت کی حقیقت و ماہیت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تربیت کا اثر بہر حال ظاہر ہوتا ہے خواہ کوئی صورت ہو اور کسی شکل و درجہ میں ہو۔

کلام عرب میں فقہ اور تفقہ کا استعمال بالعموم وہاں ہوتا ہے جہاں قلبی بصیرت اور ضمیر و وجدان کی بیداری کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں اسی بنا پر قرآن حکیم میں منکرین حق کے لئے کہا گیا ہے۔

لھم قلوب لا یفقھون بھا (۷ : ۱۷۹) ان کے پاس دل ہیں مگر تفقہ سے خالی ہیں

اس آیت میں سمجھ بوجھ کی اس قسم سے انکار کیا گیا ہے جس کا تعلق دل سے ہے ان کی عقل و خرد سے

---

[۱] کشف الظنون و اخلاق جلالی ص ۲۱ تا ۲۴ [۲] مسلم و مشکوٰۃ کتاب العلم۔

انکار نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ بسا اوقات انسان عقل کی بلندی پر پہنچنے کے باوجود قلبی بصیرت سے محروم رہتا ہے۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں رسول اللہؐ نے نسلی اوصاف اور وراثتی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ پہلے تشریح گذر چکی ہے پھر فرمایا کہ جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں (جاہلیت کے معیار کے مطابق) اچھے تھے وہ اسلام میں (اسلامی معیار کے مطابق) اچھے ہیں جب کہ وہ قلبی بصیرت حاصل کریں۔

یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ تربیت سے قلبی بصیرت حاصل ہونے کے بعد اوصاف وخصوصیات کے استعمال کا رُخ پھر جاتا ہے۔ ان کے مظاہرہ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔

صحابہ کی زندگی میں رسول اللہؐ کی تربیت کا جو اثر ظاہر ہوا تھا وہ اس سے زیادہ کیا تھا کہ ان کی زندگی کا رخ پھر گیا تھا صلاحیتوں اور خاصیتوں کے استعمال کے مواقع بدل گئے تھے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ وغیرہ وہی تھے جو اسلام سے پہلے تھے لیکن اسلام لانے کے بعد قوت و بہادری کے استعمال کا میدان بدل گیا تھا، سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں تبدیلی ہوگئی تھی۔

جسمانی ساخت پر قوت ارادی کی وسعت کی وجہ سے ذہنی ساخت کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ انسان کی ذہنی ساخت قوت ارادی کی بنا پر جسمانی ساخت سے کہیں زیادہ لچک دار اور جذب و انجذاب کو قبول کرنے والی ہے، اس لئے باطن کو ظاہر پر قیاس کر کے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا جب جسمانی تربیت سے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے تو ذہنی تربیت سے ذہن میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جسم اپنی سختی اور بے لوچ ہونے کے باوجود جسمانی تربیت سے کسی حد تک سڈول اور خوشنما بن جاتا ہے جسم کے کسی حصہ کو غلط استعمال کرتے رہنے کی وجہ سے وہ حصہ بے ڈول اور اسی قدر بدنما ہو جاتا ہے تو ذہنی اور نفسی تربیت سے ارادہ کے میدان کی وسعت کی وجہ سے نفسی قویٰ کے استعمال کا رُخ پھر جانے سے بڑی حد تک جذبات وخیالات پر قابو پالینے اور سیرت کی تشکیل ہو جانے میں کوئی دشواری اور نا ممکن

کو ممکن بنانے کا دعویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹھیک تربیت ہو جانے کے بعد انسان کا وہ فطری شعور اور وجدان بیدار ہو جاتا ہے جو ابتدائی مرحلہ میں ہر انسان کو بلا تفریق من جانب اللہ عطا کیا جاتا ہے۔ اس طرح داخلی وخارجی مؤثرات (وراثت ماحول وغیرہ) کے پردے درمیان سے ہٹ کر اصل تعلق فطرت سے جڑ جاتا ہے اور پھر اعمال و افعال میں فطری حالت کا مظاہرہ ہونے لگتا ہے۔

جن لوگوں نے اصل فطرت ہی کو ناپاک اور گنہگار قرار دے کر انسان کو پیدائشی مجرم گردانا ہے۔ اگر ان کے سمجھ میں یہ حقیقت نہ آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

البتہ قابل تعجب بلکہ قابل رحم وہ لوگ ہیں جو ان کی اتباع اور پیروی میں کہیں سے کہیں چلے جا رہے ہیں اور انہیں یہ تک خبر نہیں کہ ان کے امانت خانہ میں کیا کیا چیزیں اور کس کس طرح سے محفوظ ہیں۔

جان بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر　　　افسوس کہ باقی نہ مکیں ہے نہ مکاں ہے

العلم والعلماء

ایک شاندار کتاب

یہ جلیل القدر امام حدیث "علامہ ابن عبد البرؒ کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ علم اور فضیلت علم، اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی۔ اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے۔ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک مرتبہ ضرور پڑھیے۔

کتاب کا ترجمہ مشہور ادیب اور مترجم مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے کیا ہے۔ موصوف نے یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا۔ صفحات ۳۰۰۔ بڑی تقطیع۔ قیمت غیر مجلد للعہ۔ مجلد صہ۔

ادبیات

"منزلِ محبّت"

از

(جناب مولوی ابو البیان حمّاد)

جادۂ محبت میں ہم قدم بڑھاتے ہیں
خیر ہو الٰہی پھر اُن سے دل لگاتے ہیں

دل پہ چوٹ کھاتے ہیں اور مُسکراتے ہیں
مُسکراتے جاتے ہیں چوٹ کھاتے جاتے ہیں

پھر جہانِ الفت میں انقلاب، لاتے ہیں
داستانِ غم اپنی ہم انھیں سُناتے ہیں

جھیلتے ہیں ہر مشکل نقدِ جاں گنواتے ہیں
اُن کے چاہنے والے خون میں نہاتے ہیں

ظلمتِ شبِ غم کا چیر کر جگر ہمدم!
مشعلِ تمنا کی لو زبس بڑھاتے ہیں

کاش اور بڑھ جائے اپنی یہ خلش، یارب
اک عجیب لذت سی، دردِ دل میں پاتے ہیں

حادثاتِ سنگین و واقعاتِ غم آگیں
جس قدر بھلاتا ہوں یاد آتے جاتے ہیں

دور ہوتے جائیں گے اور بھی وہ منزل سے
راہ زن کو جو راہی، راہ بر بناتے ہیں

ناز کیوں نہ ہو ہم کو اپنے بختِ روشن پر
بارگاہِ الفت میں بار، پھر جو پاتے ہیں

منزلِ محبت کی جستجو ہمیں بھی ہے
ساتھیو! ٹھہر جاؤ ہم بھی ساتھ آتے ہیں

اپنی، اپنی، قسمت ہے اپنا اپنا حصہ ہے
کھوتے والے کھوتے ہیں، پانے والے پاتے ہیں

آج بھی زمانے کو جستجو ہماری ہے
ہم بھٹکنے والوں کو راستہ بتاتے ہیں

جان کر گہر اُن کو رولتے ہیں سب حمّاد
اشک اپنی پلکوں پر جب بھی جھلملاتے ہیں

"تخلیقِ انسان"

از

(جناب شمس تو ید)

پھینکتی انجم و مہتاب پہ ذرّوں کی کمند
جو عناصر سے بھی آزاد، عناصر میں بھی بند
ایک گردش اُٹھی سیاروں کی گردش سے بلند
کوہ میں جوالا مکھی، بحر میں طوفان بنا
اور ــــ "انسان" بنا!

دل کی دھڑکن نہ تھی کونین کی رعنائی کے پاس
زندگی جنّتِ تخلیق میں سوئی تھی اُداس
میکدہ سرد تھا مفقود تھی عرفاں کی پیاس
گمشدہ خلد میں اللہ کا ارمان بنا
اور ــــ "انسان" بنا!

آگ اور نور کے مابین جگہ پاتا ہوا
بھوک اور تیاگ کے جذبات سے ٹکراتا ہوا
خود تڑپتا کبھی ماحول کو تڑپاتا ہوا
خطرہ جنگ لئے امن کا امکان بنا
اور ــــ "انسان" بنا!

تبصرے

تدوین حدیث از مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ تقطیع کلاں ضخامت ۷۴۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔ پتہ:- ادارہ مجلس علمی کراچی (سابق ڈابھیل)

منکرین حدیث کا سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ احادیث کی تدوین دوسری تیسری ہجری میں ہوئی ہے اس لئے جو ذخیرہ تقریباً ایک صدی تک ادھر ادھر غیر مدون و مرتب پڑا رہا۔ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیوں کر کیا جا سکتا ہے کہ وہ حذف و ترمیم اور جعل و تنسیخ سے بالکل محفوظ ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں مولانا گیلانی نے تدوینِ حدیث کے موضوع پر جامعہ عثمانیہ میں توسیعی لکچررز کی صورت میں چار خطبات پڑھے تھے۔ بعد میں یہ خطبے برہان اور بعض دوسرے رسالوں میں بھی گاہ گاہ جزءاً شائع ہو گئے تھے اور علم و نظر کے طبقہ میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ ادارہ مجلس علمی نے انھیں خطبات کو کتابی شکل میں چھاپ کر ان کو محفوظ کرنے کے علاوہ اس لائق بنا دیا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اگرچہ اس کا موضوع تدوین حدیث ہے۔ لیکن مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قلم جب چل پڑتا تھا تو پھر سرگشتہ خمار رسوم و قیود" رہنا نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی خاص موضوع بحث کے علاوہ فن حدیث و فقہ۔ تاریخ و سیر سے متعلق سیکڑوں وقائق و لطائف ہیں جو علما اور طلبا کے لئے بڑے کام کی چیزیں ہیں جہاں تک نفسِ موضوع کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے مولانا مرحوم نے اس کو اس قدر بسط و تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مشکل سے ہی کوئی شخص اس پر اضافہ کر سکتا ہے۔

موطا امام محمد مترجم اردو تقطیع کلاں ضخامت ۷۵۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد درج نہیں۔ پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایات حضرت یحییٰ ابن یحییٰ اللیثی سے لی تھیں ان کے مجموعہ کا

نام موطا امام مالک ہے اور امام عالی مقام نے جو روایات امام محمد بن حسن الشیبانی سے اخذ کی تھیں۔ ان کا مجموعہ موطا امام محمد کے نام سے مشہور ہے۔ بہرحال اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ موطا امام محمد کی حیثیت بھی دراصل وہی ہے جو موطا امام مالک کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی موطا کا سلیس و عام فہم اردو ترجمہ مع متن کے ہے۔ لائق مترجم خواجہ عبدالوحید صاحب نے ترجمہ کے علاوہ جگہ جگہ بہت مفید حواشی اور نوٹ بھی لکھے ہیں۔ شروع میں مولانا عبدالرشید نعمانی کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں موطا کی تاریخ اس کی خصوصیات اس کے نسخے اور بعض اور ضمنی مباحث بیان کی گئی ہیں ان سب امور کے پیش نظر یہ اردو ترجمہ صرف اردو خوانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ حدیث کے عام طلبا کے لئے بھی معلومات میں اضافہ کا سبب ہوگا۔

سیرت اشرف | از جناب منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۱۰۵ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت بارہ روپے۔ پتہ: ادارہ نشر المعارف چھلیک ملتان شہر مغربی پاکستان۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر اس وقت تک متعدد اچھی اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک مولانا مرحوم کی شخصیت کی مصوری کا تعلق ہے خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کی اشرف السوانح آج بھی حرف آخر کا حکم رکھتی ہے اور جو کیف و اثر سرور و شوق اور جذب و مستی اس میں ہے کسی اور میں نہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت مجذوب کو مولانا کے ساتھ اور مولانا کو مجذوب صاحب کے ساتھ جو باہمی ربط و تعلق تھا وہ کسی مرید کو مولانا کے ساتھ ہوا اور نہ مولانا کو کسی اور کے ساتھ تھا۔ تاہم اس کتاب کا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ یہ سب سے آخر میں لکھی گئی ہے اس لئے اس کی حیثیت ایک کشکول کی سی ہے جس میں رطب و یابس سب ہی کچھ ہوتا ہے جیسا کہ لائق مؤلف نے خود لکھا ہے اس کتاب کی اصل اساس اشرف السوانح ہی ہے تاہم عام فہم انداز نگارش کی وجہ سے اس کا افادہ زیادہ عام ہوگا۔ منشی صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے حضرت تھانوی کو دیکھا بھی نہیں اور اس کے باوجود ان کا قلم عقیدت و ارادت کے پھول نچھاور کرتے ہیں کسی بڑے سے بڑے مرید سے پیچھے نہیں۔

انتخاب صحاح ستہ مترجم اردو تقطیع کلاں ضخامت ۲۴۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت پانچ روپے۔

پتہ: قرآن محل مقابل مولوی مسافرخانہ کراچی۔ (مغربی پاکستان)

پاکستان میں انکار حدیث کا فتنہ جس زور شور سے برپا ہے اُسی قدر ترویج و اشاعت حدیث کے لئے اہل حق نے اپنی کوششوں کی رفتار تیز کردی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں صحاح ستہ سے منتخب آٹھ سو احادیث جو عقائد عبادات اور معاملات و اخلاق سے متعلق ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح صرف اردو خواں حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ترجمہ صاف سلیس اور عام فہم ہے۔ شروع میں حدیث اور محدثین پر ایک مختصر سا مقدمہ ہے۔

مختارات فی ادب العرب قسم النثر از مولانا ابوالحسن علی الندوی تقطیع کلاں ضخامت ۱۵۵ صفحات کاغذ اعلیٰ اور ٹائپ جلی و روشن۔ قیمت درج نہیں۔ دمشق میں چھپی ہے ہندستان میں ملنے کا پتہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ کتاب قرن اوّل سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک کی عربی نثر کا نہایت عمدہ اور مفید انتخاب ہے جس میں اس بات کی رعایت رکھی گئی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد عربی زبان و ادب کے مختلف ادوار۔ ہر دور کی لسانی۔ تہذیبی خصوصیات۔ اور ہر دور کے اکابر علماءِ مصنفین سے واقفیت پیدا ہوجائے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ ادب برائے زندگی، کے بجائے اس انتخاب میں "ادب برائے دین" کا برابر خیال رکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عربی نثر کے جو انتخابات اب تک ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ یہ انتخاب مختلف وجوہ سے ان سب سے بہتر ہے اور اس لائق ہے کہ مدارس عربیہ اور یونیورسٹیاں اس کو عربی ادب کی متوسط کلاسوں کے نصاب میں شامل کریں۔ اصل متن کے علاوہ مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی استاذ ندوۃ العلماء نے تقریباً ہر صفحہ میں جو تعلیقات و حواشی لکھے ہیں وہ بجائے خود مستقل افادیت کے حامل ہیں۔ امید ہے کہ مدارس و جوامع اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

دروس فارسی از مولوی حبیب اللہ صاحب تقطیع خورد کتابت طباعت بہتر ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲/ پتہ: کتب خانہ محمودیہ (دیوبند) یہ رسالہ فارسی زبان کے چالیس اسباق پر مشتمل ہے جن میں

فارسی کے افعال واسمار کی پہلے تعریف کر کے اس کی مثالیں دی گئی ہیں اور پھر اردو سے فارسی میں اور اس کے برعکس ترجمہ کی مشق کرائی گئی ہے۔ ترتیب اور انداز بیان متقدمین کے طریقہ پر ہے لیکن جدید اصول تعلیم کے پیش نظر بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق مثالیں دی گئی ہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے اور صاف وسپاٹ ہے۔ مکاتب ومدارس اس کو بے تکلف اپنے نصاب فارسی میں شامل کر سکتے ہیں۔

معین فارسی از مولوی حبیب اللہ صاحب ضخامت ۵۶ صفحات قیمت ۱۱ر۔ یہ رسالہ درحقیقت صفوۃ المصادر کی نئی تشکیل ہے اس میں مصادر کے ساتھ ساتھ ان کی گردانہائے صغیر وکبیر بھی درج ہیں اس ایک رسالہ کو یاد کرنے کے بعد بچہ آسانی سے افعال اور صیغے بنا سکتا ہے۔

برکات الاسلام از عبدالحمید خاں صاحب ارشد تقطیع کلاں ضخامت ۶۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ: مکتبہ الصدیق بیرون بوہڑ دروازہ ملتان (پاکستان) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اسلام کی برکات شمار کرائی گئی ہیں اور چونکہ یہ برکات علمی۔ عملی۔ اخلاقی۔ روحانی مادی۔ سیاسی اور اقتصادی ومعاشی ہر طرح کی ہیں اس لئے جناب مصنف نے ہر ایک کے کچھ کچھ نمونے نقل کئے ہیں۔ اس کی وجہ سے کتاب کوئی مرتب کتاب نہیں رہی۔ بلکہ متفرق اور منتشر معلومات کی ایک کشکول ہو گئی ہے۔ بہرحال جو کچھ لکھا ہے حوالہ سے لکھا ہے۔ جو اکثر وبیشتر مستند ہے۔

تصحیح

برہان بابت ماہ مارچ ۵۷ء صفحہ ۱۷۵ سطر ۱۷

اب ان میں سے ہر ایک کی بالترتیب تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل عبارت پڑھی جائے۔

فطرت قبول حق کی اس قوت واستعداد کا نام ہے جو پیدائش کے ابتدائی مرحلہ میں ہر فرد کو بلا تفریق منجانب اللہ عطا کی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت تخم الخ

بُرہان

جلد ۳۸ شمارہ ۵

مئی سنہ ۱۹۵۷ء مطابق شوال المکرم سنہ ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسلامی جماعت کو آپ اچھا کہیں یا بُرا لیکن اپنی جگہ پر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جماعت کا نفوذ واثر بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے بعض ممتاز اداروں اور علمائے اعلام کی سینکڑوں مخالفانہ تحریروں اور فتووں کے باوجود پاکستان میں تو یہ عالم ہے کہ حکومت کے چھوٹے سے لے کر بڑے محکموں تک میں، دفتروں میں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔ کارخانوں اور تجارت گھروں میں اس جماعت کے باقاعدہ ممبر یا رکن یا کم از کم اس کے ہمدرد موجود ہیں اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی نوجوانوں اور خاص کر انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اس جماعت کا بڑا اثر ہے۔ ان لوگوں کے انگریزی اور اُردو کے اخبارات ورسائل ہیں۔ لٹریچر کی اشاعت ہو رہی ہے۔ ہفتہ وار یا ماہانہ ان کے جلسے ہوتے ہیں اور اُس میں ارکان و ہمدردانِ جماعت بڑی دلچسپی اور ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ابھی دو سال پہلے تک اس جماعت کے ارکان بڑی اقلیت میں تھے اور اپنی اسلامی وضع قطع۔ ڈاڑھیوں اور مسجد میں نماز باجماعت کی پابندی کی وجہ سے سب سے ممتاز اور الگ تھے۔ لیکن ابھی پچھلے دنوں یونیورسٹی کے طلبار کی یونین کے جو انتخابات ہوئے ہیں اُن میں یونین کے صدر اور سکریٹری کے لئے اُن امیدواروں کا انتخاب ہوا جو اسلامی جماعت کے ارکان ہیں ان لوگوں کا ایک دوماہہ انگریزی رسالہ بھی ہے جو "اسلامک تھاٹ" کے نام سے نکلتا ہے اور جس کی اشاعت روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہند و پاک کے علاوہ مشرق وسطیٰ تک اُس کے خریدار موجود ہیں۔ یہ جماعت کس چیز کی داعی ہے؟ اُسی اسلام کی جس کا داعی قرآن ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو لے کر مبعوث ہوئے۔ ان کا قبلہ وہی قرآن کا قبلہ ہے۔ یہ بھی نماز، روزہ۔ زکوٰۃ، حج اور اسلامی اخلاق واعمال کے اُسی طرح قائل ہیں جس طرح اور دوسرے مسلمان ہیں۔ بلکہ اسلامی احکام کی بجا آوری کے معاملہ میں جو تشدد اور سختی ان کے

ہاں ہے دوسروں کے ہاں نہیں ہے۔ تو اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ سینکڑوں مخالفتوں کے باوجود اس جماعت کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور عام مسلمانوں کا عموماً اور تعلیم یافتہ فرزندانِ توحید کا خصوصاً رجحان و میلان اس جماعت کی طرف بڑھ رہا اور ترقی کر رہا ہے

اصل سوال یہ ہے کہ اسلام ہے کیا؟ کیا عیسائیت، یہودیت اور بودھ مت کی طرح وہ ایک ایسا مذہب ہے جو صرف چند رسوم اور عبادت کے چند مخصوص طور طریقوں کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل و معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور اس بناء پر وہ ہر نئے فکر کے ساتھ مصالحت کر سکتا ہے ہر جدید نظریۂ اجتماع کو تمدن کو اپنا سکتا ہے۔ گویا خود اُس میں اس بات کی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اجتماعی اور تمدنی مسائل میں قیادت کا فرض انجام دے اور نظریات و افکار کی بین الاقوامی مجلس میں بیٹھ کر اپنا کوئی مستقل اور ٹھوس نظریۂ حیات پیش کرے۔ یا اس کے برخلاف اسلام درحقیقت ایک جامع اور ہمہ گیر نظامِ اجتماع و تمدن کا حامل ہے۔ وہ کسی وقت بھی منجمد و ساکن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور ہر عہد اور ہر دور کے باطل نظامہائے حیات اور غلط افکارِ زندگی کے خلاف مسلسل دعوتِ انقلاب و احتجاج دیتا رہتا ہے قرآن میں فرمایا گیا (۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (۲) لتکونوا شہداء علی الناس (۳) کونوا قوامین بالقسط، یہ اور اسی طرح کی دوسری آیتیں اس بات پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسلمان صرف اپنے لئے زندگی بسر نہیں کرتا۔ بلکہ ساری دنیا اور سارے جہان کی خدمت کرنے اور انھیں امن و سلامتی کی راہ دکھانے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں فتنہ و فساد ہوگا۔ باطل کا غلبہ ہوگا، شر کو فروغ ہوگا۔ جہاں انسانی معاشرہ تباہ و برباد ہوتا ہوگا۔ انسانیت پر ظلم و ستم ہوگا۔ اور انسانی عظمت مجروح ہوتی ہوگی۔ اسلام اس کے خلاف احتجاج کرے گا۔ اور اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ جب کہ دنیا میں آگ لگ رہی ہو اور انسانیت کی متاع گرانمایہ اس میں جلی جارہی ہو اسلام ایک خاموش تماشائی کی طرح اُس کا نظارہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرے گا اور اس کارِ خیر کو سرانجام دینے کے

لئے صلاح و نکوکاری کی جتنی طاقتیں ہیں اُن کو اپنے ساتھ لے کر میدان عمل میں آجائے گا۔

اگر اسلام نام درحقیقت اُسی دوسری صورت کا ہے اور وہ ہر زمانہ اور ہر دور کی ایک متحرک انقلابی طاقت ہے تو اب سوچنا چاہیئے کہ اسلام اتنی بڑی اور ایسی طاقت کب بن سکتا ہے؟ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اسلام موجودہ عہد کے تمام اجتماعی اور تمدنی۔ اقتصادی اور سیاسی مسائل جن کا براہِ راست تعلق انسانی معاشرہ کے صلاح و فساد سے ہے اُن کا بہترین اور کامیاب حل پیش کرے۔ اور یہ حل اُسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ غیر اسلامی افکار و نظریات کی خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر تحلیل و تنقید کی جائے اور اُن کے ہر ہر پہلو پر بحث کر کے انسانی سماج کے لئے اُن کے مہلک ہونے کو ثابت کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسری چیز جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس اسلامی تفکر کی حامل ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو فکر و عمل۔ اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہو۔ اپنے مخصوص نظامِ فکر و عمل کے ساتھ وابستگی میں سخت کٹر اور متعصب ہو۔ یعنی کسی ایسے فکر یا عمل کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہو جو خود اس کے نظامِ حیات (اسلام) کے ساتھ ٹکراتا ہو۔ جب تک کسی جماعت میں یہ کٹرپن اور تعصب پیدا نہیں ہوتا اُس میں کسی تحریک کو لے کر چلنے کی صلاحیت ہرگز پیدا نہیں ہوتی۔

پس اسلامی جماعت کی مقبولیت اور اُس کی روز افزوں ترقی کا اصل راز یہی ہے کہ اس جماعت کے زعمائے اسلام پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور اُن کی تمام جدوجہد اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہے۔ اس کوشش میں ان حضرات نے اسلامی تعلیمات کی جو تشریحات و توضیحات کی ہیں آپ کو کلاً یا جزاً اُن سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل نقطۂ نظر اور اصل مقصد بالکل درست اور قرآن کی دعوت کے عین مطابق ہے آپ کو اگر ان تشریحات سے اختلاف ہے تو اس کے مقابلہ میں اپنی تشریحات اور آج کل کے اجتماعی اور تمدنی مسائل کا حل پیش کیجئے اور بتایئے کہ اس حل کو دنیا سے منوانے کی صورت کیا ہے؟ لیکن خدا کے لئے میدان میں تو آیئے ذرا دیکھئے تو دنیا کدھر جا رہی ہے؟ اُس کا رخ کیا ہے؟ کیسی تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں اور اسلام کی شمع حقانیت و ربانی ان آندھیوں میں کس طرح پھنس کر رہ گئی ہے اور اس کو ان ہواؤں کی زد سے بچانے کے لئے آپ کا کیا فرض ہے؟ جب کبھی دنیا میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں تو اسلافِ کرام نے کیا کیا ہے۔ اور ہم آج کے حالات میں کیا کر رہے ہیں؟ ان سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

نقشہ

مرتد، منکرزکاۃ اور متذبذب قبائل ذوالقصہ، ربذہ، بُزاخہ، بطاح، یمامہ، مدینہ، مکہ، بدر اور قافلوں کی شاہ راہ

عبس و ذبیان
بنو اسد
بنو طی
بنو قضاعہ
بنو غطفان و فزارہ
بُزاخہ
شمع و مرہ
اُحد پہاڑ
ربذہ
مدینہ
ذو القصہ
بنو سلیم
یمامہ
بنو حنیفہ
بطاح
بدر
بنو عامر
بنو ھوازن
مکہ
جدہ
بحر الاحمر
الخلیج الفارسی
ملک عرب
حضرموت
الیمن
المحیط الہندی

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

ہجرت کے بعد چند سال کے اندر رسول اللہؐ نے عربوں کے لمبے چوڑے ملک میں اسلام کی دعوت پہنچا دی اور تعلیم قرآن کی بنیاد رکھی۔ ذہنی انقلاب کا کام ابھی ابتدائی منزلوں میں تھا کہ آپ نے وفات پائی۔ آپ کے انتقال سے جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ نکلا۔ عربوں کا سواد اعظم اسلام سے باغی ہو گیا۔ قریش اور ثقیف اور دوسرے چند چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے علاوہ جو رسول اللہ کی صحبت اور تربیت سے زیادہ فیض یاب ہوئے تھے،[1] بر عظیم کے بیشتر عربوں نے یا تو زکوٰۃ روک لی یا مرتد ہو گئے۔ رسول اللہ کے محصّلِ زکاۃ اور معلّمِ قرآن اپنے اپنے صدر مقاموں سے بھاگ آئے۔ اسلام سے بغاوت کے کئی سبب تھے:

نئے مذہب کی اخلاقی و اجتماعی پابندیوں سے عربوں کا عام انحراف۔

(۲) زکاۃ سے بددلی اور

(۳) قبائلی سرداروں کی اپنے اقتدار میں کمی اور مدینہ کی ماتحتی سے ناگواری۔ رسول اللہ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے آپ کے تین بڑے حریف تھے: یمن میں اَسْوَدِ عَنْسی، یمامہ میں مُسَیلِمہ اور نجد میں طُلَیحہ۔ اسود عنسی کا خاتمہ تو جلد ہو گیا لیکن مُسیلمہ اور طُلیحہ کا زور برابر بڑھتا رہا۔ مُسیلمہ کے قبیلہ کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی، اس کا مرکز یمامہ، مکہ اور مدینہ کے بعد ملک کا سب سے بڑا اور خوش حال شہر تھا جس میں کئی مضبوط قلعے بھی تھے۔ طُلیحہ کا نفوذ اتنا بڑھا کہ مرکزِ خلافت سے قریب کے کئی قبیلے باغی ہو کر اس سے مل گئے اور مدینہ پر خطرہ منڈلانے لگا۔

بارہ ربیع الاول ۱۱ھ کو حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو حالات بہت نازک تھے، اسلام کا نوخیز

[1] ان قبیلوں کے نام یہ ہیں: اسلم، غِفار، مُزَینۃ، جُہَینۃ، بنو کعب، بنو اشجع، الاکتفاء بما تضمّنہ من مغازی المصطفٰی و مغازی الخلفاء، تالیف ابن سالم الکلاعی ۶ البلنسی، مخطوط دار الکتب المصریہ قاہرہ رقم ۵۲۷، ۲۴۱

پودا حوادث کی صرصر سے کانپ رہا تھا۔ رسول اللہ کے ساتھیوں میں سے کئی سرآوردہ لیڈر نئے خلیفہ کے انتخاب سے ناراض ہو کر ترکِ موالات کئے ہوئے تھے، مدینہ کے منافق خوش تھے کہ نئے مذہب کی بساط الٹ رہی ہے، مدینہ سے باہر ملک کے گوشہ گوشہ میں خاص وعام اسلام کی بندشوں سے نکلنے کا اعلان کر رہے تھے، سرکاری آمدنی جو زکاۃ کی صورت میں آتی بہت کم ہو گئی تھی، مختصر یہ کہ خلافت کی کشتی بھنور میں آپھنسی تھی۔

ابوبکر پر خدا کا خاص کرم تھا کہ وہ ان تمام خطروں اور مشکلات سے زیادہ متاثر نہ ہوتے، بلکہ خطروں اور مشکلات نے ان میں ہمیشہ سے زیادہ عزم پیدا کر دیا۔ رسول اللہ کی صحبت اور اسلام کی محبت نے اُن کو حیرت انگیز سکونِ قلب اور وثوق عطا کیا تھا۔ بارہ ربیع الاول ۱۱ھ کو خلیفہ ہو کر انھوں نے خطرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اُسامہ (بن زید) کی وہ مہم روانہ کی جس کو رسول اللہ اپنے آخر ایام میں مشرقی اُردن بھیجنا چاہتے تھے لیکن جو ان کی علالت اور موت کی وجہ سے رُک گئی تھی۔ اس مہم کو بہت سے سمجھ دار لوگ خلاف مصلحت خیال کر رہے تھے، کیوں کہ خطرہ کی گھنٹی بج چکی تھی اور مدینہ بلکہ خود اسلام پر سیاہ بادل چھانے لگے تھے، لیکن حضرت ابوبکر مصلحت اندیشی کی جگہ حکمِ رسول بجالانا زیادہ ضروری سمجھتے تھے، ان کے اعتقاد میں بجاآوری حکم ساری خیر وبرکت کا سرچشمہ تھا، چنانچہ آخر ربیع الاول میں اپنی خلافت کے دس پندرہ دن کے اندر اندر انھوں نے ایک فوج اُسامہ کی سرکردگی میں شام بھیج ہی دی۔ اُسامہ کے نکلنے کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی، مشہور ہوا کہ مرکزِ خلافت بالکل ننگا ہے، نہ وہاں باغیوں سے لڑنے کے لئے فوج ہے نہ خود اپنی حفاظت کے لئے۔ ہمارے بعض مورخ اس وقت کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:- "جب رسول اللہ کا انتقال ہوا اور اُسامہ اپنی مہم کو روانہ ہوئے تو عرب مرتد ہو گئے، کہیں عام عرب اور کہیں خاص طور پر سردارانِ قوم۔ مُسیلمہ اور طُلیحہ نے اپنی سرگرمیاں بڑھادیں اور خوب قوی ہو گئے۔ قبائل طی اور اَسد کے عوام (مدینہ کے شمال مشرق میں) طلیحہ کے جھنڈے تلے آگئے، غطفان، اشجع اور ان عربوں نے بھی جو مختلف قبیلوں سے آجمع ہوئے تھے (مدینہ کے شمال مشرق میں) اس کی بیعت کرلی، قبیلۂ ہوازن (مکہ اور مدینہ کے وسط میں) متذبذب تھا پر زکاۃ اُس نے بھی بند کر دی، صرف ثقیف (مشرقی مکہ) اور اس کے ساتھ جو مختلف قبیلوں کے

لوگ رہتے تھے، اسلام پر قائم رہے، جدیلہ اور اعجاز بھی ثقیف کی دیکھا دیکھی اسلام کے وفادار رہے (مدینہ کے مغرب میں) بنو سُلیم کے امراء مرتد ہو گئے اور ملک عرب کے باقی عربوں کا حال بھی یہی تھا کہ کہیں ان کے عوام نے بغاوت کی اور کہیں خواص نے۔ رسول اللہ کے سفیر یمن، یمامہ اور بنو اسد کے علاقہ سے لوٹ آئے، ان امراء کے وفد بھی واپس آ گئے جن کے پاس رسول اللہ نے خط بھیجے تھے اور ان سے اسود عنسی اور طُلیحہ کی خبر لینے کو لکھا تھا۔ ان سفیروں اور وفدوں نے صورتِ حال سے ابو بکر کو مطلع کیا اور جو خطوط لائے تھے ان کو دکھائے۔ ابو بکر نے کہا: بس کوئی دم جاتا ہے کہ تمھارے حاکموں کے قاصد ہر طرف سے اس سے بھی زیادہ کڑوی اور سخت خبریں لے کر آتے ہوں گے۔ ایسا ہی ہوا بہت جلد ہر سمت سے رسول اللہ کے حاکموں کے مراسلے آئے کہ ہماری عملداری کے خاص یا عام عربوں نے بغاوت کر دی ہے، اور مسلمانوں کو طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دے رہے ہیں۔ (تین ماہ تک ابو بکر نے رسول اللہ کی طرح سفیروں کے ذریعہ بگڑتے حالات کا مقابلہ کیا، یعنی حاکموں کے قاصدوں کو بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب احکام بھیجے اور پے در پے ہدایات بھیجتے رہے اور اُسامہ کی واپسی تک اسی وقتی تدبیر پر عمل کرتے رہے۔" (سیف بن عمر۔ طبری ۳/ ۳۲۱-۳۲۲)

مدینہ کے شمال، شمال مشرق اور شمال مغرب کے چھوٹے بڑے تقریباً ایک درجن قبیلوں نے جن میں کئی طُلیحہ کے براہِ راست زیرِ اثر تھے، اُسامہ کی مہم کے خروج کے بعد آزاد ہونے یا زکاۃ سے نجات پانے کے لئے باہم معاہدہ کر کے مدینہ کو گھیر لیا۔ یہ متحالف قبیلے دو بڑے گروہوں میں بٹ گئے: ایک گروہ جس میں بنو اسد شامل تھے، اور جس کی قیادت طُلیحہ کا نامزد جنرل حِبال کر رہا تھا مدینہ سے سات میل شمال مشرق میں بمقام ذو القصّہ خیمہ زن ہوا اور دوسرے گروہ نے جس میں عبس اور ذُبیان کے قبیلے شامل تھے، ذو القصّہ کے عقب میں مغرب کی طرف ابرق کی چراگاہوں میں فوجیں اتاریں، ان متحالف قبیلوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور شہر کے ممتاز صحابہ سے کہا کہ ہم زکاۃ نہیں دے سکتے، نماز ادا کر سکتے ہیں، آپ خلیفہ سے ہماری سفارش کیجیے، اگر زکاۃ معاف نہیں کی گئی تو ہم طاقت سے کام لیں گے۔ ممتاز صحابہ نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ابو بکر سے کہا کہ جب تک حالات

سازگار ہوں زکاۃ معاف کر دیجئے، مگر ابو بکرؓ جو عادۃً مرنجان مرنج، نرم، متواضع اور فیاض دل آدمی تھے، اس معاملہ میں کسی کی بات سننے کو تیار نہ ہوئے، ان کا موقف تھا کہ جب رسول اللہ نے زکاۃ معاف نہیں کی تو میں کیسے کر سکتا ہوں: اگر ان لوگوں نے زکاۃ کے اونٹوں کی رسی تک روکی تو میں ان سے لڑوں گا۔" وفد لوٹ گیا اور اپنی قوم کو بتایا کہ مدینہ میں نہ فوج ہے، نہ ہتیار، حملہ کا بہترین موقع ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے وفد کے جانے کے بعد حملہ کی توقع میں تیاری شروع کر دی مدینہ آنے جانے والے سب راستوں پر چار صحابیوں (حضرت علی، زبیر، طلحہ اور ابن مسعود) کی قیادت میں مورچے بٹھادئے اور اہل مدینہ کو جمع کر کے صورتِ حال سے باخبر کیا اور تیار رہنے کی تاکید کی۔ وفد کی واپسی کی تیسری رات کو ان متحالف قبیلوں نے مدینہ پر حملہ کیا جس کو صحابہ کے مورچوں نے سنبھالا اور خلیفہ سے مدد مانگی ابو بکرؓ نے کہلا بھیجا: ڈٹے رہو، مدد آتی ہے۔" مدینہ میں نہ گھوڑے تھے، نہ تیز رو اونٹ، دودھ دیتی اونٹنیاں تھیں، ایک فوج تیار کی اور ان اونٹنیوں پر سوار کر کے ابو بکرؓ جلد جلد مدد کے لئے نکلے، لڑائی ہوئی، مخالفوں کی ایک چال سے اونٹنیاں بدکیں اور مسلمانوں کو لے کر بھاگ پڑیں، ابو بکرؓ نے سنبھل کر دوبارہ مقابلہ کیا، مخالفین کے پیر اکھڑ گئے، طلیحہ کا مامور کردہ جنرل حبال جو بنو اسد کی قیادت کر رہا تھا، مارا گیا، ابو بکرؓ ان کے تعاقب میں مدینہ کے شمال مشرق میں ذی القصہ نامی منزل پہنچے اور وہاں کیمپ لگایا، عرب قبائل تتر بتر ہو گئے۔

اس فتح نے مدینہ کی آبرو بچالی، اسلام کے ڈگمگاتے قدم سنبھل گئے، مرتد قبیلوں میں جو مسلمان گھرے تھے ان کے ڈوبتے دلوں کو سہارا ملا، ذو القصہ میں فوجیں چھوڑ کر ابو بکرؓ مدینہ لوٹ آئے۔ متحالف قبیلے اپنی تازہ شکست سے ایسے بوکھلائے کہ اپنے اپنے قبیلوں کے مسلمان عربوں پر ٹوٹ پڑے اور بے دردی سے ان کو قتل کیا، پہلے عبکس وذبیان نے خون کی ہولی کھیلی، پھر دوسرے قبائل نے، اس کی خبر مدینہ پہنچی تو غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، ابو بکرؓ نے قسم کھائی کہ مشرکوں کو بے دریغ ماریں گے، جتنے مسلمان مارے گئے ہیں، اتنے بلکہ اس سے زیادہ مرتد قبائل کے افراد کو قتل کریں گے۔ (طبری ۳/۲۲۴) جنگ کی تیاری شروع ہو گئی، خوش قسمتی سے اس وقت تین جگہ سے زکاۃ آگئی جس سے ہتیار وں اور

ضروری سامان کی فراہمی میں آسانی ہوئی۔ سوا دو ماہ باہر رہ کر اُسامہ اور ان کی فوج بھی آگئی، حضرت ابو بکر نے اب دیر بالکل نہ کی، اُسامہ اور اُن کی تھکی فوج کو آرام کرنے اور شہر کی اندرونی و بیرونی حفاظت سونپ کر دہ محاذ پر چلے گئے۔ ربیع الاول ۱۱ھ۔ اس وقت صحابہ نے کہا: جان جوکھوں میں نہ ڈالئے، خدا نخواستہ اگر لڑائی میں مارے گئے تو خلافت کا شیرازہ بکھر جائے گا، کسی کو سالار بنا کر بھیج دیجئے۔" آپ نہ مانے اور فرمایا: خدا کی قسم یہ نہ ہوگا، میں اپنی جان و تن سے تمھاری قربانیوں میں حصہ لوں گا۔" ذوالقصّہ کے فوجی اڈے آئے، وہاں سے فوجیں لے کر رَبذہ کے گاؤں کا رُخ کیا جس کے پاس قبیلہ مُرّہ، ثعلبہ اور عبس و ذُبیان جمع تھے۔ لڑائی ہوئی، چاروں قبیلے شکست کھا کر بھاگ گئے۔ ان کی چراگاہوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ عبس و ذُبیان طُلیحہ سے جا ملے جو ابو بکر کی پیش قدمی کی خبر پا کر سمیرا نامی نخلستان سے شمال کی طرف ہٹتا ہوا بزاخہ کے نخلستان میں فروکش تھا۔ خلیفہ نے زیادہ آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور مدینہ لوٹ آئے۔

یہ آخری معرکے تعزیری نوع کے تھے، عبس و ذُبیان اور اُن کے حلیفوں نے اپنے کئے کی سزا پائی، اور ان کی چراگاہیں بھی ضبط کر لی گئیں، لیکن وہ نہ تو ارتداد سے تائب ہوئے اور نہ اُن کا استیصال ہوا، مُسیلمہ، طُلیحہ اور دوسرے باغی بھی بدستور موجود تھے، اس لئے حضرت ابو بکر نے بڑے پیمانہ پر قوت کا استعمال ضروری سمجھا، اُسامہ کی فوج جب تازہ دم ہو گئی اور زکاۃ کی بڑھتی ہوئی آمدنی سے جب سامان جنگ جمع ہو گیا تو آپ فوجیں لے کر ذوالقصّہ کی چھاؤنی میں خیمہ زن ہوئے۔ گیارہ[1] محاذ بنائے اور ہر محاذ کے لئے سالار مقرر کئے۔ اس موقع پر خلیفہ نے دو فرمان لکھے ایک عرب قبائل کے نام اور دوسرا سپہ سالاران فوج کی ہدایت کے لئے۔ پہلے فرمان کا مضمون یہ تھا:-

---

[1] اتنے محاذوں کے لئے فوجیں کہاں سے آئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت مدینہ اور اس کے آس پاس جو فوج جمع ہو سکی اس کی تعداد زیادہ نہ تھی، اگرچہ سامانِ جنگ وافر تھا، ہر محاذ کے لئے تھوڑے تھوڑے مجاہد فراہم ہو سکے، جن کی گنتی سیکڑوں سے آگے نہ جاتی تھی، ہر محاذ کے لئے فوج مقرر کرنے میں اس محاذ کی اہمیت کو ملحوظ رکھا گیا تھا، مثلاً مُسیلمہ اور طُلیحہ کے مقابلہ میں فوج کی تعداد سب محاذوں سے زیادہ تھی، اور اس کے سالار خالد بن ولید تھے، منصوبہ یہ تھا کہ مرکز کی طرف سے مقرر کی ہوئی فوجیں روانہ ہوں اور ان کے راستہ میں جو قبیلے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، خلیفۂ رسول اللہ ابو بکر کی طرف سے خاص و عام کے نام، خواہ وہ اسلام پر قائم ہوں، خواہ مرتد ہو گئے ہوں۔ سلامتی ہو ان پر جو راہ پر ثابت قدمی سے قایم ہیں اور گمراہی کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا جو یکتا اور بے شریک ہے کوئی عبادت کے لایق نہیں، گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، اور جو تعلیم وہ لائے اس کی حقانیت کا معترف ہوں، اور جو لوگ اس تعلیم کو نہیں مانتے ان کو کافر قرار دیتا ہوں، اور اُن سے برسرِ پیکار ہوں۔ واضح ہو کہ اللہ نے محمد کو سچی تعلیم کے ساتھ ایک روشن چراغ اور بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تاکہ انسانوں کو برائی سے ڈرائیں، اور کافروں کے خلاف حجت قایم ہو۔ (لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ) جن لوگوں نے محمد کی دعوت مانی، اللہ نے اُن لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا، اور جو لوگ سیدھے راستہ سے روگرداں ہوئے ان کو رسول نے خدا کے اذن سے مار لگائی، حتیٰ کہ ان کو چار و ناچار مسلمان ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد جب رسول، خدا کا حکم نافذ کر چکے، اور قوم کی خیر خواہی کا کام انجام دے چکے اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے تو آپ کا انتقال ہوا، موت کی خبر اللہ آپ کو اور سارے مسلمانوں کو اپنی نازل کی ہوئی کتاب میں دے چکا تھا: تم کو مرنا ہے اور ان سب کو بھی مرنا ہے، (إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ) تم سے پہلے ہم نے کسی بشر کو دائمی زندگی نہیں دی، اگر تم مرو گے تو وہ ہمیشہ تھوڑا ہی رہیں گے، (وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ، أَفَإِنْ مِتَّ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آئیں وہاں کے مسلمانوں کو محاذ پر چلنے کی دعوت دیں، سالار فوج کو حکم تھا کہ جن لوگوں کے پاس ہتھیار نہ ہوں ان کو ہتیار دئے جائیں، اگر ان کے پاس سواری نہ ہو تو سواری بھی دی جائے، خیال یہ تھا کہ مرکزی فوجوں کو دیکھ کر وہ سارے مسلمان جو مرتد قبیلوں میں گھرے تھے، یا جو متذبذب تھے، یا بھوکوں مر رہے تھے، سب فوج میں شامل ہو جائیں گے، یہ خیال صحیح نکلا۔

فھم الخالدون") [ہر شخص کو مرنا ہے، ہم شر اور خیر میں ڈال کر تم کو آزماتے ہیں، اور تم کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت، ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ، والینا ترجعون۔ الاکتفاء"] محمد بس رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں، اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں، تو کیا تم اسلام چھوڑ دو گے، اور جو اسلام چھوڑے گا وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شاکرین نعمت کو اچھا انعام دے گا۔ (وما محمد الا رسول، قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم، ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین)

پس جو کوئی محمد کی عبادت کرتا ہو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ محمد کا انتقال ہو گیا اور جو اللہ یکتا اور بے شریک کی عبادت کرتا ہو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے زیر نظر ہے اللہ جو زندہ ہے، قائم بالذات ہے، جاوداں ہے، نہ اُسے نیند آتی ہے، نہ غنودگی، اپنے سب کاموں کا خوب دھیان رکھتا ہے، نافرمانوں کو سزا دیتا ہے۔

لوگو! میں تاکید کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اور اس خوش بختی اور انعام کے مستحق بنو جو اللہ تم کو دینا چاہتا ہے اور اس دستورِ زندگی پر عمل کرو جو تمھارا نبی تمھارے لئے لایا ہے اور اس راستہ پر چلو جو نبی نے دکھایا ہے اور اللہ کے دین کو مضبوط پکڑ لو، کیوں کہ جس کی اللہ رہبری نہ کرے وہ گمراہ ہے، اور جس کو اللہ فکر و روح کے مرض سے شفا نہ دے وہ روگی ہے، اور جس کا وہ دستگیر نہ ہو وہ خوار ہے (کیوں کہ اللہ جس کی حفاظت نہ کرے وہ تباہ ہے، جس کی اللہ تصدیق نہ کرے وہ کاذب ہے، جس کو اللہ خوش بخت نہ بنائے وہ بدنصیب ہے، جس کو اللہ رزق نہ دے وہ محروم ہے... الاکتفاء صفحہ ۲۴۵) اس گمراہ کا دنیا میں کیا کوئی کام مقبول نہ ہوگا جب تک وہ اللہ کا معترف نہ ہو، اور آخرت میں بھی (خدا فراموشی کی تلافی کے لئے) اس کا کوئی معاوضہ یا بدل قبول نہیں کیا جائے گا۔

تم میں سے جو لوگ، اسلام کا اقرار اور اس کے مطابق عمل کر کے اسلام سے منحرف ہوئے

ہیں ان کی خبر مجھے ملی، یہ انحراف اس لئے ہے کہ اللہ کی گرفت کا انھیں یقین نہیں ہے، اس کی سزا اور قوت کا ان کو صحیح اندازہ نہیں ہے، اور پھر شیطان نے بھی ان کو بہکا دیا ہے۔ اللہ جل ثناؤہ کہتا ہے: جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا پر ابلیس نے نہیں کیا، وہ جنوں کی نسل سے تھا اس لئے اس نے اپنے رب کا حکم نہ مانا، کیا مجھے چھوڑ کر تم شیطان اور اس کی آل اولاد کو اپنا آقا اور متبوع بنا لوگے؟ حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔

دوسرے موقع پر اللہ فرماتا ہے: بلاشبہ شیطان تمھارا دشمن ہے، اس کو دشمن سمجھو، وہ اپنی پارٹی والوں کو ایسے کاموں کی دعوت دیتا ہے جو انھیں دوزخی بنائیں (وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَھُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ... اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَہٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ)

میں نے فلاں کو (خالد بن ولید کو ... الاکتفاء) مہاجرین، انصار اور تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمھارے پاس بھیجا ہے، اس کو میرا حکم ہے کہ کسی سے اس وقت تک نہ لڑے نہ کسی کو اس وقت تک قتل کرے جب تک اس کو "کلمۂ شہادت" کی دعوت نہ دے دے، جو شخص اس دعوت کو مان لے اور اس کا معترف ہو اور شیطانی کاموں سے باز آئے اور نیک عمل بن جائے، اس کا اسلام قبول کرلے اور اس کو اسلام پر قایم رہنے میں مدد دے۔ لیکن جو لوگ "کلمۂ شہادت" سے انکار کریں ان کے لئے سالار اعلی کو میرا حکم ہے کہ ان سے جنگ کرے، اور ان میں سے جن جن پر اس کا قابو چل جائے اس کے ساتھ مطلق نرمی نہ برتے، اس کو آگ میں جلا دے اور ہر ممکن طریقہ سے قتل کرے، ان کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو غلام بنا لے اور کسی سے کلمۂ شہادت کے سوا کوئی بات قبول نہ کرے۔ [میں

نے خالد کو حکم دیا ہے کہ میرا خط ہر مجمع میں پڑھ کر سنائے، جو خط کی پیروی کرے گا نفع اُٹھائے گا، جو اس کی خلاف ورزی کرے گا نقصان اُٹھائے گا۔ الاکتفاء] جو اسلام لائے گا اس کے اسلام سے خود اسی کا بھلا ہوگا، اور جو اسلام نہیں لاتے گا وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

میں نے اپنے قاصد (مراد سپہ سالار) کو حکم دیا ہے کہ تمھارے ہر مجمع میں یہ خط پڑھ کر سنائے۔ [اسلام کی دعوت اذان ہے، اگر مسلمانوں کی اذان سن کر قبائلی عرب بھی اذان دیں گے، تو اسلامی فوج ان سے تعرض نہ کرے گی اور اگر وہ اذان نہیں دیں گے تو اسلامی فوج بے تاخیر ان کی خبر لے گی، اور جب قبائلی عرب اذان دیں گے تو اسلامی فوج ان سے زکاۃ کی رقم مانگے گی، اگر وہ رقم دینے سے انکار کریں گے تب بھی ان کی خبر لی جائے گی اور اگر رقم دینے کو تیار ہوں گے، تو وہ (سپہ سالار) ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، اور ان پر مناسب عامل مقرر کرے گا]۔[1]

طبری، ۳/۲۲۶-۲۲۷ و صبح الاعشیٰ ۶/۳۸۴، بین القوسین حصہ الاکتفاء میں نہیں ہے۔ اور زیادہ قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ خط کشیدہ عبارت مراسلۂ ابوبکر کا حصہ نہیں بلکہ راویانِ مراسلہ کی طرف سے مسلمانوں کے اُس طریقِ کار کی توضیح و تشریح ہے جو وہ مرتد قبائل میں اذان سننے یا نہ سننے کی حالت میں اختیار کرتے تھے۔ اس صورت میں عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا: "پس جب مسلمان اذان دیتے اور قبائلی عرب ان کی اذان سن کر خود بھی دیتے، تو مسلمان ان کو کوئی نقصان نہ پہنچاتے، اور اگر مسلمانوں کی اذان سُن کر وہ اذان نہ دیتے تو فوراً ان کی خبر لیتے اور اگر قبائلی عرب اذان دیتے تو مسلمان اُن سے زکاۃ مانگتے اگر وہ دینے سے انکار کرتے تب بھی اُن کی بے درنگ خبر لیتے اور اگر وہ زکاۃ دینے کا اقرار کرتے تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جاتی اور سپہ سالار ان پر کوئی مناسب حاکم مقرر کر دیتا۔"

---

[1] اصل میں وَحَمَلَهُمْ عَلٰى مَا يَنْبَغِي لَهُمْ ہے، جس کا کوئی مناسب حال مفہوم نہیں نکلتا میں نے اس جملہ کو وَعَمِلَ عَلَيْهِمْ مَنْ يَنْبَغِي لَهُمْ قرار دے کر ترجمہ کیا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

۲- سپہ سالاروں کو ہدایت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - خلیفۂ رسول اللہ ابو بکر کی طرف سے یہ ہدایت نامہ ہے فلاں کے لئے (خالد بن ولید کے لئے - اکتفاء) جب اس کو مرتدوں سے لڑنے بھیجا گیا، اس کو ہدایت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے سارے کاموں میں خواہ چھپے ہوں یا ظاہر خدا سے ڈرتا رہے، اس کو حکم ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے تن دہی سے کام لے اور سنجیدگی کے ساتھ ان لوگوں کی سرکوبی کرے جو اسلام سے پھر گئے ہیں، اور شیطانی آرزوئیں دل میں بسائے ہوئے ہیں، لیکن سرکوبی سے پہلے ان کو سنبھلنے کا ایک موقع دے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کو "کلمۂ شہادت" کی دعوت دے، اگر وہ یہ دعوت مان لیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے، لیکن اگر وہ یہ دعوت نہ مانیں تو ان پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہونے کا اقرار کریں، اس کے بعد ان کو بتائے کہ بحیثیت مسلمان ان پر کیا پابندیاں ہیں اور ان کے کیا حقوق ہیں۔ پابندیوں کے مطابق ان سے وصول کرے (زکاۃ) اور حقوق کے مطابق ان کو دے (مال غنیمت) اور اس کام میں تاخیر و مہلت روا نہ رکھے، اور مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے نہ روکے۔ لڑائی کے بعد جو اسلام لے آئے، اور اس کی حقانیت کا معترف ہو، اس کا اسلام مان لے اور اسلام پر قائم رہنے میں اس کی بہتر طریقہ پر مدد کرے۔ (اس کو خوب یاد رہے کہ) اس کی لڑائی خدا کے باغیوں سے صرف اس لئے ہے کہ وہ اُس تعلیم کا اعتراف کریں جو خدا کی طرف سے آئی ہے، جوں ہی وہ اس تعلیم کا اعتراف کریں گے اور "کلمۂ شہادت" پڑھ لیں گے، اُس کو اُن کے خلاف کارروائی کا حق نہ رہے گا، اور اگر وہ خفیہ طور پر (ان کے خلاف) کوئی نامناسب سلوک کرے گا تو خدا اس سے سمجھے گا۔ اور جو لوگ "کلمۂ شہادت" نہیں پڑھیں گے، مار ڈالے جائیں گے، جہاں ہوں گے اور جہاں کہیں بھی بھاگ کر جائیں گے ان سے جنگ

کی جائے گی، اسلام کے سوا کوئی بات نہیں مانی جاتے گی۔ جو اسلام لے آئے گا اور دل سے اُس کا معترف ہوگا، سالارِ اعلیٰ اس کا اسلام قبول کرلے گا اور اس کو اسلام کی تعلیم دے گا۔ اور جو لوگ اسلام سے انکار کریں گے ان سے لڑے گا۔ اور منکرینِ اسلام پر اگر اللہ اس کو غلبہ دے گا تو وہ ہر طرح ان کو ہتیاروں اور آگ سے قتل وغارت کرے گا، اس کے بعد مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کرکے باقی فوج میں تقسیم کردے گا اور خُمس (یا پنچواں حصہ) ہمارے پاس بھیج دے گا۔ سپہ سالار کو ہدایت ہے کہ اپنے ساتھی مسلمانوں کو جلد بازی اور لوٹ مار سے باز رکھے، اور اپنی فوج میں بلا تحقیق گھٹیا درجہ کے عربوں کو داخل نہ کرے، مبادا وہ جاسوس ہوں اور ان کی کسی چال سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ جائے۔ اس کو ہدایت ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، کوچ اور پڑاؤ دونوں حالتوں میں ان کے ساتھ لطف ورحمت سے پیش آئے، ان کی راحت وجذبات کا خیال رکھے، اور فوج کا کچھ حصہ بہت آگے .... اور کچھ بہت پیچھے نہ رکھے اور مسلمانوں کو فہمایش کرے کہ باہم محبت ورواداری سے رہیں اور نرمی سے باہم بات چیت کیا کریں"۔ سیف بن عمر۔ طبری ۳/ ۲۲۷

طبری کے یہ دونوں مراسلے سیف بن عمر کی روایت پر مبنی ہیں، اس روایت کی رو سے جیسا کہ ہم نے اوپر پڑھا۔ خلیفہ اول نے اہل ردّہ کی سرکوبی کے لئے گیارہ محاذ قائم کئے تھے اور ہر محاذ کے لئے ایک سپہ سالار مقرر کیا تھا اور ہر سالار کو دو خط دیے تھے۔ ایک اہلِ ردّہ کے نام اور دوسرا خود اُن کے لئے ہدایت نامہ، دارالکتب المصریہ قاہرہ میں الکتفاء کے نام سے مغازی اور فتوح پر جو قیمتی مخطوط ہے اس میں نہ گیارہ محاذوں کا ذکر ہے، نہ گیارہ سالاروں کا۔ الکتفاء کی رو سے خلیفہ اول نے سب سے پہلے طُلیحہ اور مُسیلمہ کی طرف توجہ کی اور ساری قوت ان کے مقابلہ پر لگادی، اس مہم کے لئے خالد کو سالارِ اعلیٰ مقرر کیا اور ان کو دو فرمان دیتے: ایک ہدایت نامہ اور دوسرا اہلِ ردّہ کے نام خط، دوسرے خط کا مضمون طبری اور الکتفاء میں (مابین القوسین حصہ چھوڑ کر) مشترک ہے اور دوسرے خط کا بھی بیشتر حصہ لفظی نہیں تو معنوی اعتبار سے دونوں کتابوں میں یکساں ہے۔ ذیل میں الکتفاء کی وہ عبارت پیش

کی جاتی ہے جو کیا لفظاً اور کیا معنیً طبری کے نسخہ سے مختلف ہے :-

"خالد کو حکم ہے کہ اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ یمامہ پہنچے، اور پہلے بنی حنیفہ اور اُن کے نبی مُسیلمہ کذّاب کی خبر لے، لڑنے سے پہلے ان کو اور اس کو دعوت اسلام دے، اور خلوص سے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے، اگر وہ دعوت قبول کرلیں، اور کلمۂ شہادت پڑھیں، تو ان سے کچھ تعرض نہ کرے، اور اس کی اطلاع مجھے دے اور یمامہ میں مقیم رہے اور میرے حکم کا انتظار کرنے۔ اگر بنو حنیفہ اور مُسیلمہ مسلمان ہونے اور کلمہ پڑھنے اور اپنے کذّاب کی خدا پر بہتان تراشیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں تو ان سے سخت لڑائی لڑے، اللہ یقیناً اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے دین کو سارے دینوں پر غالب کرے گا، جیسا کہ اُس نے قرآن میں کہا ہے، کافروں کو یہ بات خواہ کتنی ہی ناپسند ہو۔ اگر خدا کے حکم سے وہ بنی حنیفہ پر فتح پائے تو اُن کو ہتیار اور آگ دونوں سے قتل و غارت کرے اور ان کا کوئی فرزند زندہ نہ چھوڑے۔ مال غنیمت اور ان کی دولت خُمس نکال کر مسلمانوں میں بانٹ دے۔ خُمس میرے پاس بھیج دے تاکہ میں قانونِ اسلام کے مطابق اس کو ٹھکانے لگاؤں۔ اس کو ہدایت ہے کہ اس کے ساتھیوں کے اتحاد میں اختلاف رائے کی وجہ سے کمزوری نہ پیدا ہو، اور نہ جلد بازی میں آکر وہ کوئی غلط قدم اٹھائیں"۔ اس کے بعد بدو عربوں کی فوج میں بھرتی اور عام مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وہ ہدایات ہیں جو طبری کے خط میں بیان ہوئیں، آخر میں انصار کے ساتھ خصوصی برتاؤ کی سفارش ہے...... جو انصاری تمھارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ قول و فعل میں نرمی اور مدارات سے پیش آؤ کیوں کہ وہ بد دل اور کبیدہ خاطر ہیں (ابوبکر کے خلیفہ ہونے سے) وہ حسن سلوک کے مستحق بھی ہیں، ان میں بڑی خوبیاں ہیں، ان کی بڑی خدمات ہیں، رسول اللہ نے ان کے لئے وصیت بھی کی ہے لہذا ان میں جو صالح ہوں ان کی بات مانو۔ اور اگر کسی سے خطا سرزد ہو تو درگذر کرو، جیسا کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے الکفاء صفحہ ۲۵

ابن خلدون اور اس کا مقدمہ

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

نگاہِ اولیں

یہ بات افسوس ناک نہیں ہے کہ یورپین اقوام نے ابن خلدون کی فضیلت اور اس کی قدر وقیمت کو اہلِ مشرق سے پہلے جانا پہچانا اس لئے کہ یہ صورت تو بہت سے بڑے بڑے مفکرین کے لئے پیش آئی ہے۔ ہاں یہ بات یقیناً موجب تاسف ہے کہ بعض مشرقی حضرات ابن خلدون کی قدرو قیمت کو گھٹانے کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ مغربی اہلِ علم اس کے فضائل کے اظہار میں پوری کوشش کر چکے ہیں۔ جن مسلمانوں نے ابن خلدون کی سیرت بالخصوص عربی زبان میں لکھی ہے وہ تین ہیں۔

ایک گروہ تو وہ ہے جسے اپنی عربی انشا پردازی پر بڑا ناز ہے، اس نے اپنے فہم کی رسائی کے مطابق جو کچھ لکھا وہ اپنے مقصد کی نیکی کی بنار پر شکریہ کا مستحق ہے لیکن ملامت کا سزاوار ہے تشویش اور خبط کے ان نتائج کی وجہ سے جو "فلاسفۂ اسلام" سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسرا وہ گروہ ہے جو ایک بات پڑھتا ہے تو اس میں ایک مقالہ لکھ دیتا ہے وہ اپنے وہم و خیال میں کوئی نظریہ سوچتا ہے اس کے متعلق دو جلدیں لکھ مارتا ہے، وہ ہمیشہ مفہوم اور غیر مفہوم "کمزور اور محکم رائے" ممکن اور غیر ممکن امر کے درمیان میں متردد رہتا ہے۔ تم کو وہ کتاب اور مقالے میں شک کا داعی اور ایسے خیال کا اخذ کرنے والا نظر آئے گا جو ابن خلدون کی سوانح حیات میں ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا مقصد پہلے گروہ کی طرح اچھا ہے اور اندازِ بیان میں دوسرے گروہ کے قدم بہ قدم ہے اس کی نظر میں قصہ کی شکل وصورت بہ نسبت قدر و قیمت و نتائج کے زیادہ اہم ہے

اور یہ تحریر جو اس وقت اس معمولی شکل میں تمھارے پیش نظر ہے اس کی غرض وغایت صرف اس قدر ہے کہ ابن خلدون کی کچھ رائیں مختصر طریقہ پر ذکر کی جائیں اور کسی قدر ان کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالی جائے۔ اور اس قیمت کی مقدار کا فیصلہ قارئین کی رائے پر چھوڑ دیا جائے۔

یہ امر مسرت بخش ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ابن خلدون کے لئے ایک بڑے عالم کو توفیق عطا فرمائی ہے وہ عنقریب عربی داں اصحاب کے لئے ایک ایسی کتاب شائع کرے گا جو نہایت محکم وکامل اور تفتیش حالات میں ایک نمونہ اور انصاف میں ایک مثال اور علمی خزانہ کے لئے ایک دولت ہوگی۔ اُس وقت ابن خلدون اپنی قوم میں ایسے مرکز میں آجائے گا جو اس کے لایق ہے اور یہ کتاب اس کو ایسے مرکز کی طرف چڑھا دے گی جس میں وہ مغرب کی نگاہ میں ہے۔

ابن خلدون کے زمانہ کی کیفیت

ابن خلدون نے وہ زمانہ پایا جو تمام ممالک اسلامیہ میں سیاسی واجتماعی وفکری ضعف کا زمانہ تھا اس سے پہلے کا زمانہ اور اس کے بعد کا زمانہ فکری قحط اور سیاسی اختلاطِ شدید کا دور تھا۔ اندلس کی یہ حالت تھی کہ عرب کا سایہ اس کے زیادہ حصہ سے جدا ہو چکا تھا پھر غرناطہ کے جنوبی حصہ میں کچھ خفیف حرکت نمودار ہوئی اور خود ابن خلدون نے محسوس کیا تھا کہ یہ سایہ (حمایت عرب) عنقریب زوال پذیر ہے جہاں جب وہ اپنے مقدمہ کے صفحہ ۱۴۷ میں کہتا ہے۔ . . جیسا کہ اس زمانہ میں اندلس کا حال جلالقہ (اندلس کے نصاریٰ) کے ساتھ ہے تم ان کو (اندلس کے مسلمانوں کو) پاؤگے کہ وہ جلالقہ کی مشابہت لباس میں اور ہیئت وعنع میں اور بہت سی عادات وکیفیات میں یہاں تک کہ دیواروں میں اور مصنوعات میں اور گھروں میں تصادیر بنانے میں کرتے ہیں جسے چشم دانش سے دیکھنے والا محسوس کر لیتا ہے کہ یہ (مخالفین کے) غلبہ کی علامات میں سے ہے "والامر للہ"

مغرب (شمالی افریقہ) کی یہ حالت تھی کہ موحدین کی حکومت جس کی پیداوار ابن باجہ اور ابن الطفیل اور ابن رشد تھے۔ شروع ساتویں صدی ہجری سے ہی کمزور ہوگئی تھی اس کے توڑنے پر مراکش میں بنو مرین

اور جزائر میں حکومت بنی عبدالواد اور تونس میں بنو حفص تلے ہوئے تھے۔ ابن خلدون کی پیدائش کے زمانہ میں ان سب حکومتوں پر ضعف اور نزاعات کا غلبہ تھا پھر ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) میں بنو مرین کا زوال ہوگیا اور بنی عبدالواد کی حکومت ۷۳۷ھ (۱۳۳۷ء) میں ٹوٹ گئی پھر از سر نو تھوڑے زمانے کے لئے سبتہ" میں آٹھویں صدی ہجری میں قائم ہوئی۔ اور بنو حفص کی حکومت زمانہ دراز تک زندہ رہی۔ لیکن کم زوری اور جھگڑوں میں مبتلا رہی۔ پھر مغرب کے حکمران متفرق ہوگئے ہر حکمران کسی شہر پر قناعت کر کے اس میں اور اس کے متصل بستیوں میں یا اس کے بغیر حکم رانی کرتا تھا اور لڑائیوں اور فتنوں میں کبھی سکون نہ ہوا۔

مشرق کی یہ حالت تھی کہ صلیبی جنگوں کے زخم سے ابھی اس کے حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ مصر اور سوریہ اور حجاز ممالیک برجیہ کے حکم کے تحت میں ٹیکسوں کی زیادتی اور آبادی کی کمی سے نالاں تھے اور عراق ترکی سرداروں کے درمیان میں منقسم تھا۔ پھر تیمور لنگ مغلوں کی جماعتوں کو لے کر حملہ آور ہوا اور ۷۹۶ھ (۱۳۹۳ء) میں بغداد پر غالب ہوگیا اور کل ما بین النہرین پر قابض ہوگیا اور تکریت میں انسانی کھوپڑیوں کا مینارہ بنایا اس کے بعد سوریہ پر ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) میں آندھی بگولا کی طرح چڑھ آیا اور خوف اور بربادی اور قتل کی تخم ریزی ہر جگہ کر دی۔

یورپ اس زمانہ میں اصلاح اجتماعی اور تنظیم سیاسی اور فکری ترقی کی دولت سے مالا مال تھا۔

ابن خلدون کے سوانح حیات بطریق اختصار

ابن خلدون کا سلسلۂ نسب ایک یمنی خاندان تک جو عرب حضرموت (جنوبی بلاد عرب) سے ہے پہنچتا ہے۔ اس کے اجداد میں حجر (بضم حا) ہے جو غالباً یمن کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے بیٹے وائل بن حجر مشرف باسلام ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے حدیث روایت کی پھر وہ اور ان کی اولاد کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے، وائل رضی اللہ عنہ کی وفات معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوئی۔

ابن خلدون کے قریبی اجداد میں خالد بن خطاب ہے جو فتح اسلامی کے وقت ۹۲ھ (۷۱۱ء)

میں اندلس میں داخل ہوا۔ خطاب کی اولاد نے پہلے "قرمونہ" میں سکونت اختیار کی پھر اشبیلیہ میں،
وہاں وہ لوگ خلدون (تصغیر خالد) کے نام سے مشہور ہوئے۔ ، تقریباً ۶۲۵ھ (۱۲۲۷ء) میں اشبیلیہ
پر اسپین کا خطرہ شدید ہوا تو ان لوگوں نے اشبیلیہ سے ہجرت کی، بیس سال قبل اس کے کہ فردینانڈ ثالث
شاہ قشتالہ کا تسلط اشبیلیہ پر ہو (۶۴۶ھ - ۱۲۴۸ء) تو وہ لوگ سبتہ (مراکش کا بندرگاہ بحر متوسط پر)
میں مقیم ہوئے۔ پھر ابن خلدون کا دادا، محمد، تونس کی طرف منتقل ہوا اور ابو حفص کا وزیر ہوا اس کے بعد
اس کے بیٹے المستنصر کا وزیر رہا۔ ابن خلدون کا باپ بھی سول اور ملٹری عہدوں پر
مقرر ہوتا رہا لیکن پھر اس کی حالت پلٹی اور وہ علم کا شیفتہ ہو گیا آخر وہ فقہ اور لغت کا پکا عالم ہو گیا۔ اس کی
وفات بعارضہ طاعون مہلک ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) میں ہوئی۔ اس طاعون جارف کی وبا میں کثیر التعداد
علماء عالم فانی سے دار البقا کی طرف چل دیئے۔ غفر اللہ لہم۔ اب خود ابن خلدون کا حال لکھا جاتا ہے۔ (وہ
ولی الدین ابو زید عبد الرحمن محمد بن محمد... بن خالد ابن الخطاب ہے) تونس میں غرہ رمضان ۷۳۲ھ
کو پیدا ہوا اس نے اپنے باپ سے اور بعض علمائے تونس سے یا ان سے جو باہر سے آتے تھے قرآن عظیم
حفظ کیا اور تفسیر و حدیث و فقہ و لغت و نحو پڑھا اور بہت شعر یاد کیے ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں اس نے
اکثر علوم دینیہ و لغویہ کو پورے طور پر حاصل کر لیا پھر جو علم سیکھا تھا اس کو وسیع بنایا اور منطق و فلسفہ کے
علوم سے بہت سی چیزیں حاصل کر لیں۔ اور ۷۴۸ھ میں ابو الحسن سلطان مراکش کی مصاحبت میں
پہونچ گیا۔ مگر عملی طور پر حکومت کے عہدے پر پہلے پہل ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں فائز ہوا۔ اس کو "کتابۃ العلامۃ"
(دیوان الرسائل) کا کام ابی محمد بن تافراکین کے لئے جو کہ اس زمانہ میں تونس میں حکومت پر مستقل تھا متور
کیا گیا۔ پھر اس کا وصف ابو عنان حاکم 'فاس' سے بیان کیا گیا ابو عنان علما کو اپنے دربار میں جمع کیا کرتا تھا
اس نے ابن خلدون کو ۷۵۵ھ میں طلب کیا اور آخر ۷۵۶ھ (آخر ۱۳۵۵ء) میں اسے ملازم رکھ لیا لیکن
اس کے دوسرے ہی سال میں ابو فارس سے اس کی شکایت کی گئی اور وہ قید کر دیا گیا پورے دو
سال قید میں رہا۔ جب ابو فارس کا بتاریخ ۲۴ ذی الحجہ ۷۵۹ھ انتقال ہو گیا تو قائم بالدولۃ وزیر حسن
بن عمر نے فوراً قیدیوں کی ایک جماعت کو رہا کر دیا ابن خلدون بھی اس جماعت کا ایک فرد تھا۔ اور

جب سلطان ابوسالم نے فاس فتح کیا اور بنی مرین کو وہاں سے نکال دیا تو ابن خلدون اس کا کاتب راز و خط و کتابت و انشاء (نصف شعبان ۷۶۰ھ میں) ہو گیا پھر اس کو خطۃ المظالم کا کام مل گیا۔ اور جب بنو عبدالواد نے دوبارہ تلسان میں اپنی حکومت قائم کرلی تو ابن خلدون ان کے پاس پہنچا اور یہ روز عید الفطر ۷۶۳ھ ان کے بادشاہ ابا حمو کی مدح کی لیکن اس نے وہاں ٹھہرنا پسند نہ کیا اس سابق منافرت کی وجہ سے جو اس کے اور ان کے درمیان تھی بلکہ اپنے شہر میں واپس جانا پسند کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اسے منع کیا اور ارض مغرب سے اسے دور کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور اس نے اسی درمیان میں قائد محمد بن الحکیم متوطن قسطنطنیہ (شمالی جزائر) کی بیٹی سے شروع ۷۶۴ھ میں شادی کرلی جس کے بطن سے ابن خلدون کے تین بچے ہوئے۔ ابن خلدون تلسان میں بنی عبدالواد سے ترک تعلق کر کے شروع ۷۶۴ھ میں اندلس آیا اور ابن الاحمر والیِ غرناطہ اور اس کے مشہور وزیر لسان الدین بن الخطیب کے دربار میں باریاب ہوا وہ اندلس میں بماہ ربیع الاول ۷۶۴ھ (آخر ۱۳۶۲ء) پہنچا وہاں اس کی بڑی عزت ہوئی۔ پھر اس کو ابن الاحمر نے ۷۶۵ھ (۱۳۶۳ء) میں سفیر بنا کے سرکش بادشاہ قشتالہ "پطرہ بن الہنشہ بن اوقونش (پطرس چہارم سنگدل جو اپنے باپ فونس یازدہم کا ۱۳۵۰ء میں جانشین ہوا اور ۱۳۶۹ء میں مرگیا) کے پاس اس صلح کے معاملہ کو پورا کرنے کے لئے بھیجا جو اس کے اور شاہانِ عدوہ (شمالی افریقہ) کے درمیان ہونے والی تھی۔ پھر اسے ابن الخطیب کی جانب سے رنجش کا احساس ہوا اس لئے وہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۷۶۶ھ کو اندلس کو چھوڑ کر دوسرے مہینہ میں مغرب پہونچا اور "بجایہ" گیا کیوں کہ سلطان ابوعبداللہ کو اس پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا رمضان ۷۵۵ھ میں۔ اس نے ابن خلدون کو عہدۂ وزارت عطا کرنے کو بلایا تھا ۷۶۶ھ و ۷۶۷ھ کے درمیان میں ارضِ مغرب میں بہت فتنہ و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے ابن خلدون سیاسی تکالیف کی وجہ سے اکتا گیا اس لئے اس نے عہدوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور قلعہ ابن سلامۃ (شرقی تلسان الجزائر کی شمال میں) کا راستہ لیا اور ایک سردار کی اولاد کے پاس تقریباً چار سال ۷۷۶ھ سے ۷۸۰ھ تک مقیم رہا۔ وہیں اس نے اپنی مشہور تاریخ کی

کی تالیف شروع کی پھر اسے تالیف کے مواد کی حاجت محسوس ہوئی جو وہاں میسر نہ تھا اس لئے وہ پھر تونس واپس آیا۔ ۷۷۴ھ (۱۳۷۲ء) میں اس کا خیال حج کو جانے کا ہوا مگر جب وہ مصر پہنچا تو ارادہ بدل گیا وہاں وہ مالکی مذہب کا قاضی القضاۃ ہوگیا اور جامع ازہر میں درس دینے لگا پھر ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں اس کو حج کرنے کا شرف حاصل ہوا جب لوٹ کر قاہرہ پہنچا تو صرف درس دینے کا کام اختیار کیا لیکن پھر ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں وہ دوبارہ قاضی ہوگیا۔ اور جب تیمور لنگ سوریہ پر حملہ آور ہوا تو الملک الناصر فرج ابن الملک الظاہر برقوق تیمور سے گفتگو کرنے کے لئے دمشق گیا اور اپنے ساتھ عالموں کو جس میں ابن خلدون بھی تھا لے گیا پھر ناصر فرج نے اپنے خلاف مصر میں پروپگنڈہ ہونے کی خبر سنی تو وہ واپسی پر مجبور ہو گیا۔ تب ابن خلدون نے موقع کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور پوشیدہ طور پر ایک وفد کا سردار بن کر تیمور سے گفتگوئے صلح کرنے کو گیا اور بہت پسندیدہ تقریر کی۔ تیمور نے اس کی بہت عزت کی اور مصر واپس کر دیا۔ ابن خلدون اس کے بعد بارہا مصر کا قاضی مقرر ہوا۔ ابن خلدون کی وفات قاہرہ میں ۲۵ رمضان ۸۰۸ھ کو ہوگئی۔ غفرلہ اللہ و رحمہ۔

(ابن خلدون کی کتابیں)

مورخین نے ابن خلدون کی کئی کتابوں کا حساب و منطق و تاریخ وغیرہ میں ذکر کیا ہے، ان میں سے ہمارا مطمح نظر اس کی مشہور کتاب "کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر و من عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر" ہے۔ یہ کتاب آٹھ بڑی ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کے آخر میں اس نے خود اسکی تعریف کی ہے (نفح الطیب ۴۰۷) اس کتاب میں سے خصوصیت کے ساتھ جزو اول ہمارا مطمح نظر ہے جس کو مقدمہ ابن خلدون" یا صرف "مقدمہ" کہتے ہیں۔ اس جزو اول کے حصے حسب تفصیل ذیل ہیں۔

۱۔ دیباچہ (ص ۳-۹) اس میں ابن خلدون ذکر کرتا ہے کہ اس نے مورخین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کو تحقیق سے دور پایا اس لئے اس کتاب کو ترتیب دیا اور اس کو مشتمل کیا بحث پر آبادیوں کے بارے

ہیں پھر عرب اور مشرق کی تاریخ پر پھر بربر اور مغرب کی تاریخ پر۔

ب۔ مقدمہ (جزء اول کا مقدمہ ص ۹-۳۵) علم تاریخ کی فضیلت میں اور اس کے مذاہب کی تحقیق اور روشنی ڈالتے ہیں ان غلطیوں کی جو مورخین کو پیش آتی ہیں مع ان کے چند اسباب کے ذکر کے۔

ج۔ الکتاب الاول (ص ۳۵-۵۸۰، یہ حصہ جزء اول کا آخر ہے) عمران کی طبیعت (اجتماع بشری) کا بیان اور ان چیزوں کا ذکر جو عمران (آبادی) میں پیش آتی ہیں مثلاً بدویت وحضارۃ اور زبردستی قبضہ کر لینا اور کسب و معاش اور صناعات وعلوم وغیرہ اور ان کی علتیں اور اس میں چھ فصل ہیں۔

۱- الفصل الاول جغرافیہ طبیعیہ وبشریہ میں (ملک کا انسان کے ابدان واخلاق واحوال میں اور جس کا ظہور آبادی سے ہوتا ہے۔ ص ۳۵-۱۱۹،

۲- الفصل الثانی۔ بدوی آبادی کے ذکر میں (اور اس میں اہل بدو اور اہل حضر کے درمیان موازنہ ہے اور ان کے خصائص کا ذکر ہے پھر اس میں عصبیت اور تغلب اور ملک پر کلام ہے) ص ۱۲۰-۱۵۳،

۳- الفصل الثالث۔ حکومت کے بیان میں۔ (حکومت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور قوی ہوتی ہے پھر کمزور ہو جاتی ہے۔ اور ان چیزوں کا بیان جس کی حاجت حکومت کو ہوتی ہے مثلاً مناصب (عہدے) اور خشکی وتری میں وسائلِ دفاع اور تفصیلی کلام ٹیکسوں اور خراج کے متعلق) ص ۱۵۴-۳۴۲،

۴- الفصل الرابع۔ شہری آبادی کے بیان میں مخصوص (شہروں کا بنانا بلند وبڑی عمارتوں کی تعمیر۔ شہروں میں آسائش اور صنعتیں۔ پھر شہروں کی ویرانی جب کہ ان کی آبادی زیادہ ہو جائے یا وہاں کی سلطنتیں جاتی رہیں) ص ۳۴۲-۳۸۰،

۵- الفصل الخامس۔ بیان میں معاش کے اور اس کے طریقوں کے اور ان احوال کے جو

ان سب میں پیش آتے ہیں۔ (اور حکومتوں کے وظائف سے اور کاشت کاری سے اور تجارت سے اور صناعات مثلاً تعمیر مکانات اور بڑھئی کے کام اور سلائی اور صناعۂ تولید اور فنِ موسیقی سے کمانے کے بیان میں) ص ۳۸۰ - ۴۲۹ -

۶- **الفصل السادس** - بیان میں علوم کے اور ان کے اقسام کے اور تعلیم کے اور اس کے طریقوں اور کل وجوہ کے اور ان احوال کے جو ان سب میں پیش آتے ہیں۔ ص ۴۲۹ - ۵۸۸ -

تاریخ فلسفہ میں ابن خلدون کا درجہ

ابن خلدون صرف فلسفی اجتماعی نہ تھا بلکہ وہ عالم اجتماعی اور علم اجتماع کا موجد بھی تھا اس سے پہلے کسی نے اس علم میں کلام نہیں کیا پھر اہلِ یورپ کے علماء اجتماع جو ابن خلدون کے بعد ہوئے وہ ہمیشہ بعض نظریاتِ اجتماعیہ میں اس سے الگ رہے یا آبادی کے ان قوانین میں سے جن کو ابن خلدون نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں ظاہر کیا تھا بعض قوانین سے بالکل بے خبر رہے اور جب کہ انیسویں[19] صدی عیسوی قریب ہوئی اور علم اجتماع یورپ اور امریکہ میں وسیع پیمانہ پر پہونچا۔ تو زمانہ جدید کے علماء نے اس چیز میں گہری نظر ڈالنے کے بعد جسے عبد الرحمن بن خلدون نے اپنے مقدمہ مشہور بہ مقدمۂ ابن خلدون میں شرح وبسط سے بیان کیا ہے اس کے صائب رایوں اور قوانین شاملہ کی قدر وقیمت کو سمجھا۔ اور "اعتنت مولر من" (دہ بور ۲۰۷) کا یہ ذکر کرنا کہ ابن خلدون کا مسلک صرف تاریخ اسپین اور مغربی افریقہ اور صقلیہ پر وہ بھی جس کا تعلق گیارہویں صدی مسیحی اور پندرھویں صدی میلادی کے درمیانی زمانہ سے ہے منطبق ہوتا ہے ہمارے فیلسوف ابن خلدون کو کچھ بھی مضر نہیں ہے کیوں کہ سب مفکرین اور فلاسفہ اور علماء جب حیاتِ اجتماعیہ کے اطراف ذکر نے کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ اس چیز کے پابند ہو گئے جسے انھوں نے اپنی سرزمین میں جانا یا تو اس وجہ سے کہ دوسرے ملکوں کے حال سے وہ ناواقف تھے جیسا کہ ابن خلدون کا حال ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ جس سرزمین کی تصویر پیش کرنا اور اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اس میں منہمک ہو گئے تھے جیسا کہ یہ بھی ابن خلدون کا حال ہے۔ اب یہ بھی سمجھ لو کہ ابن خلدون کے بعض قوانین اس زمانہ میں عالمِ اسلامی کے علاوہ پہ بھی

منطبق ہونے تھے اور برابر کم و بیش بہت سے ممالک پر مختلف زمانوں میں صادق آتے رہے ہے
اس بنا پر ابن خلدون فقط عرب اور مسلمانوں کا پہلا اجتماعی فیلسوف نہ ہوا اور نہ وہ صرف فلسفۂ اجتماع
کے اکابرین سے ہے بلکہ وہ مطلقاً پہلا عالم اجتماع اور سب سے بڑا آبادی کے حقائق اولی کا پہلا
فکر انسانی کی تاریخ میں سمجھنے والا ہوا ہے۔ اور جب ابن خلدون حضارۃ اسلامیہ عربیہ کا مورخ
نہیں ہے تو وہ بلا اختلاف اس حضارۃ کی تاریخ کی بنیادوں کا بنانے والا ہے اور ان بنیادوں
کا وضع کرنے والا ہے جن پر عموماً تاریخ کی کتابت کا قائم ہونا ضروری ہے۔

بے شک ابن خلدون نے تاریخ کے حوادث کا تابع ہونا ان علل و اسباب کو سمجھا ہے
جو اجتماع انسانی سے پیدا ہوتے ہیں مع ہر اس چیز کے جو اجتماع میں ہیں یعنی کیفیت طبیعیہ اور اقتصاد
اور سیاست و دین" پھر مع ان چیزوں کے جو اجتماع سے متفرع ہوتی ہیں مثلاً عصبیت و نفسیت
اور افراد و جماعات کے درمیان میں تنازع۔ اور مختصر الفاظ میں یہ کہ تاریخ ابن خلدون کے نزدیک
ہے بشری آبادی اور اجتماع انسانی کا زمانہ گزرنے پر طرح طرح کے طریقے اختیار کرنا ہر اس چیز کے ساتھ
جس کا تعلق ان دونوں سے ہوتا ہے یعنی جہت مادیہ محسوسہ سے اور جو ان دونوں میں عارض ہوتا ہے
جہت عقلیہ معنویہ ہے اور "فون کریمر" نے غلطی نہیں کی جب کہ اس نے ابن خلدون کو مورخ فیلسوف
قرار دیا۔ اور نہ "اکر ونالد" نے مبالغہ کیا جب کہ اس نے ابن خلدون کو نویں صدی میلادی تک کے مورخین میں
سب سے اوّل و اعظم بتایا۔ ابن خلدون کے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ اس نے "علم العمران" (علم الاجتماع)
میں کل مظاہر اجتماع انسانی کو داخل کر دیا اس بنا پر کہ وہ نظام واحد شامل کے مظاہر ہیں ان کو اس نے مستقل
اقسام منظم بہ تنظیم عرفی نہیں سمجھا جیسا کہ بہت سے علماء اجتماع نے ابن خلدون کے بعد گذر رہے ہیں گمان کیا ہے۔

ابن خلدون کے خصائص

ابن خلدون مورخ فیلسوف اور عالم اجتماعی تو تھا ہی مفکر ادیب عالم بھی تھا۔ وہ چند
خوبیوں میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ وسعت واقفیت۔ اس نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ غور و خوض اور نظر دقیق سے کیا

جس سے اس کو یہ قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ ہر وقت ان میں اپنی زبردست قوتِ حافظہ کو کام میں لائے ان کی رایوں کی تلخیص کرے ان کو پرکھے اور ان کی قدر وقیمت بتائے۔ اور تم کو اس کے مقدمہ کو مطالعہ کرتے ہوئے اس امر سے حیرت ہوگی کہ مقدمہ میں ایسی معلومات دیکھو گے جو ایسی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کے متعلق یہ خیال دل میں نہیں گزرتا کہ ابن خلدون نے ان کو ایسے تجر کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ مطالعۂ کتب میں اس کے فکر کی آزادی باوجود مولفین کتب کے اختلاف طرُق کے۔ حتیٰ کہ وہ ان رایوں کو بھی درج کر دیتا ہے جن کا وہ معتقد نہیں ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ مقدمہ میں ان کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۳۔ اس کی قدرت رایوں کو پیش کرنے پر اور ان کے نقد پر اور رایوں کے صحیح اور فاسد میں امتیاز پر بہ اعتبار رائی جانچ کے یا باعتبار قوانینِ منطق کے۔

۴۔ اس کے ملاحظہ کی شدت اثنار مطالعہ میں عموماً اور خصوصاً زندگی کی پیچیدگیوں کے مطالعہ میں "ابن خلدون" کو بڑا حصہ ملا ہے اس تعجب خیز قدرت کا جس سے ان اثرات پر وہ مطلع ہو سکا جو زندگی پر غالب ہو گئے ہیں اور اس کو زندگی کے مظاہر متفقہ یا مختلفہ کا دیکھنا اور ان کے ان مراتب کا جو اس کے ایجاد کردہ نظامِ اجتماعی میں ہیں ظاہر کرنا ممکن ہوا۔

۵۔ ملاحظات اور رایوں کے درمیان مقارنہ و موازنہ پر اس کا قادر ہونا قوانین کے استخراج کے لئے۔ پھر ان قوانین کا حتی الامکان شامل بنانا کہ کثیر قضایا پر وہ صادق آئیں۔

۶۔ سیاسی اور دفتری زندگی میں اس کا وسیع تجربہ حکومت اور قضا کے زمانے میں اس نے اندلس اور شمالی افریقہ اور مصر اور حجاز اور سوریہ میں بہت سفر کرنے سے جدید تجربہ حاصل کیا۔ اور بے شک اس کی کتاب تاریخ میں پنجاہ سالہ مطالعہ و غور و خوض و تجربہ سے بھری ہوئی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

محقق دوانی

۸۳۰ھ تا ۹۰۸ھ
۱۴۲۶ء ۱۵۰۲ء

از

جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم۔ اے علیگ،
(استاذ السنۂ فارسی وعربی الہ آباد یونیورسٹی)

اسلام میں جن اہم شخصیتوں نے فکر انسانی کی ثروت میں بیش بہا اضافے کئے ان میں سے ایک محقق دوانی ہیں۔ آپ کی نمایاں خدمات کے صلے میں قوم کی طرف سے محقق کا خطاب ملا۔ فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں صرف معدودے چند خوش نصیب ایسے گزرے ہیں جو محقق کے خطاب سے سرفراز ہوئے مثلاً محقق طوسی اور محقق سید شریف جرجانی۔ دوانی کی کتاب اخلاق جلالی آج بھی درسیات عالیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر وقت کی ناقدری دیکھئے کہ آج دوانی کو عام طور پر محض ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے لوگ جانتے ہیں، حالانکہ نہ صرف اخلاق بلکہ معقولات و منقولات کے مختلف شعبوں میں آپ نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی تبحر علمی اور فضل وکمال کے متعلق خوندمیر اپنی کتاب حبیب السیر میں لکھتا ہے:۔

"از غایت تبحر در علوم معقول و منقول واز کمال مہارت در مباحث فروع واصول بر جمیع فضلائے عالم وتمامی علمائے بنی آدم فائق بود"

۱۔ حالاتِ زندگی

نام ونسب: آپ کا نام محمد اور لقب جلال الدین تھا۔ والد کا نام سعد الدین اسعد تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تک پہنچتا ہے اسی لئے صدیقی کہلاتے تھے۔

جائے پیدائش | آپ کی ولادت صوبۂ شیراز کے ضلع کازرون کے مضافات میں "دوان" نام کے ایک گاؤں میں ہوئی اسی کی طرف نسبت کی وجہ سے دوانی کہلاتے ہیں۔ یہ گاؤں کازرون کے شمال میں تقریباً دو فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا۔ سال ولادت ۸۳۰ھ ہے جیسا کہ بحساب جمل قرۃ العین کے حروف (باسقاط الف ولام تعریفی) کی مجموعی تعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔ لفظ "دوان" کے تلفظ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ یاقوت۔ براکلمن اور فرصت شیرازی نے ذوّان، بتشدید واد لکھا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر ریو نے بغیر تشدید لکھا ہے۔ اسی طرح فارسی کی مستند لغات مثلاً برہان قاطع انجمن آرائے ناصری، فرہنگ آنندراج، اور فرہنگ رشیدی میں بھی 'دوان' کا تلفظ بغیر تشدید داو بتایا گیا ہے۔ غالباً موخر الذکر رائے صحیح ہے کیوں کہ دوانی کے جو فارسی اشعار ہیں ملتے ہیں ان میں بعض مقام پر آپ کا تخلص دوانی پایا جاتا ہے جسے اگر بتشدید واو پڑھا جاتا ہے تو شعر ناموزوں ہو جاتا ہے۔

تحصیل علم | ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا سعد الدین سے حاصل کی جو اپنے زمانے میں علم وفضل کے لئے مشہور تھے اور قریۂ دوان میں قضا کے عہدے پر مامور تھے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ شیراز تشریف لے گئے۔ اس وقت شیراز میں محقق سید شریف جرجانی کے دو ممتاز تلامذہ تعلیم وتدریس کا کام انجام دیتے تھے جن میں سے ایک خواجہ حسن بقال تھے اور دوسرے ملا محی الدین انصاری کوشکناری جو مشہور صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ کی اولاد میں سے تھے۔ محقق دوانی نے ان دونوں بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور وقت کے اہم علوم مروجہ ان سے حاصل کئے۔ بعض درسی کتابیں مولانا ہمام الدین گلباری سے پڑھیں جنہوں نے طوالع الانوار پر ایک مفید شرح لکھی تھی، علم حدیث کی تحصیل کے لئے شیخ صفی الدین ایجی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے چوں کہ آپ کے اندر فطری طور پر قابلیت اور ذہانت موجود تھی اور توفیق ایزدی بھی شامل حال تھی اس لئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ جملہ علوم وفنون سے فراغت حاصل کرلی اور ابھی عنفوانِ شباب ہی کا زمانہ تھا کہ آپ کا شمار علمائے کرام وفضلائے عظام میں ہونے لگا اور ملک کے مختلف اطراف میں آپ کی شہرت

کا بازار گرم ہوگیا۔

طرز زندگی | طلب علم کی خاطر جب آپ شیراز پہونچے تو شروع میں عسرت و تنگدستی کی زندگی گزارتے تھے، افلاس کا یہ عالم تھا کہ شب کو مطالعہ کے لئے تیل خریدنے کی بھی مقدرت نہ تھی۔ مگر چوں کہ طلب صادق تھی، آپ ان مالی مشکلات سے ہمت نہیں ہارے اور تحصیل علم کے لئے برابر جد و جہد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات شیراز کی جامع مسجد میں جاکر وہاں کی دہلیز میں جو چراغ رات کو جلتا رہتا تھا اس کے پاس کھڑے ہوکر دماغ سوزی کرتے تھے۔ یہ مسجد جامع عتیق کہلاتی تھی اور خاندان صفاریہ کے امیر عمرو لیث کے ہاتھوں ۲۸۱ھ میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ آپ کی حالت درست ہوتی گئی اور بالآخر ایک وہ وقت آیا جب آپ کی لیاقت و فضیلت کا سکہ ہر خاص و عام پر بیٹھ گیا اور علمی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ساز و سامان میں بھی کافی اضافہ ہوگیا اور خوش حال زندگی گزارنے لگے مگر باوجود کثرتِ مال و منال کے آپ دولت و ثروت حاصل کرنے میں پوری سرگرمی سے کام لیتے تھے کیوں کہ آپ کے نزدیک علوم کی ترویج و اشاعت اور اُن کی قدر و قیمت کے لئے مال بہت ضروری ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر میں فرمایا ہے۔

مرا بہ تجربہ روشن شد این در آخر حال ✻ کہ قدر مرد بہ علم است و قدر علم بہ مال

اشتغال زندگی | جب محقق دوانی کی شہرت زیادہ ہوئی تو طالبانِ علم و معرفت دوسرے مقامات مثلاً عراقین، روم، اران، آذربیجان، ہرموز، کرمان، طبرستان، جرجان اور خراسان وغیرہ سے دور دراز سفر طے کرکے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور آپ کے انوارِ کمالات سے مستفید ہوتے لگے ایام جوانی میں کچھ دنوں تک خاندان قراقونیلو کے امیر مرزا جہان شاہ کے بیٹے مرزا یوسف کے یہاں صدر مجلس تھے۔ اس کے بعد وہاں سے استعفا دے دیا اور شیراز کے مدرسہ بیگم میں جو دارالایتام کہلاتا تھا، ایک استاذ کی حیثیت سے مقرر ہوگئے اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

سلطان یعقوب بایندری (مدت حکومت ۸۸۳ھ - ۸۹۶ھ) نے جو اس وقت عراق، فارس اور آذربیجان کا حاکم تھا، محقق دوانی کو شیراز سے اپنے دارالسلطنت تبریز میں بلایا اور شاہی انعام و

اکرام سے نواز کر سارے ممالک فارس کے اقضی القضاۃ (Chief Justice) کا عہدہ آپ کے سپرد کیا۔ چنانچہ سلاطینِ بایندری (آق قینلو) کے دورِ حکومت میں آپ مستقل طور پر عہدۂ قضا پر مامور رہے۔ مدرسہ کے اوقات میں آپ تعلیم کا کام انجام دیتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر لوگوں کے باہمی منازعات و قضایا کو شرعی نقطۂ نظر سے فیصل کرتے تھے۔ اور فرصت کے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت تصنیف و تالیف کے لئے بھی نکال لیتے تھے جس کا مفصل تذکرہ آئندہ آرہا ہے

اب فاضل محقق کی شہرت اطرافِ عالم میں پھیلنے لگی اور نہ صرف عوام بلکہ خواص جن میں سلاطین بھی شامل ہیں آپ کے عقیدتمند ہو گئے۔ اگر ایک طرف عثمانی سلاطین کے دربار میں آپ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا تو دوسری جانب ہندوستان کے بادشاہوں نے بھی آپ کو دادِ تحسین و آفریں دی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ چنانچہ آپ نے ایک رسالہ انموذج العلوم سلطان محمود شاہ بیگڑہ گجراتی (مدت حکومت ۸۶۳ھ ـ ۹۱۷ھ) کے نام معنون کیا تھا اور اُسے اپنے ایک تلمیذ رشید میر شمس الدین محمد کے ہمراہ سلطان مذکور کی خدمت میں روانہ کیا۔ سلطان نے ایک ہزار درہم محقق دوانی کے لئے بطور انعام ارسال کیا۔ لیکن وہ رقم راستہ میں کسی دریا میں غرق ہو گئی اور اس میں سے کوئی معتدبہ حصہ آنجناب کو نہیں پہنچا۔ اس کے بعد محقق فاضل نے ایک دوسرا رسالہ تحقیق عدالت کے متعلق لکھ کر سلطان مذکور کے دربار میں بھیجا اور اس کے دیباچہ میں انعام مفقود کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ سلطان نے اس مرتبہ پھر ایک ہزار درہم مع دیگر ہدایا و تحائف کے فاضل محقق کی خدمت میں روانہ کیا۔

سیر و سیاحت | محقق دوانی نے عربستان، تبریز اور بغداد وغیرہ کا سفر بھی کیا تھا۔ اسی سفر میں بغداد سے باہر دریائے دجلہ سے قریب ایک مقام پر آپ خواب میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ چنانچہ آپ نے طے کیا کہ ایک رسالہ لکھ کر حضرت امیرؓ کے نام معنون کریں اور اسے نجف اشرف میں روضۂ مقدسہ پر حاضری کے وقت پڑھیں۔ لیکن اس رسالہ کے موضوع کے متعلق متردد تھے۔ کوئی خاص موضوع دماغ میں متعین نہیں ہوتا تھا۔ اسی حیص بیص میں آپ حضرت امیرؓ کے روضۂ مقدسہ پر پہنچ کر آستان بوسی کے شرف سے مشرف ہو گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ایک

شاگرد رشید نے جس کا نام شیخ شرف الدین حسن نقال تھا اور جس نے آپ سے کتاب حکمۃ الاشراق پڑھی تھی، آپ سے درخواست کی کہ اس کتاب کو پڑھاتے وقت جو نکات آپ نے بیان فرمائے تھے ان کو ایک رسالہ میں جمع کر دیں۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کے اندر رسالہ زورار تصنیف کیا اور تکمیل کے بعد جب نظر ثانی کی تو معلوم ہوا کہ وہ بعینہ وہی تھا جو اصل مقصود تھا۔ لہذا فاضل محقق کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کی ترتیب میں حضرت امیرؓ (باب مدینۃ العلم) کے فیض روحانی کی معونت شامل تھی۔

علمی معرکے محقق دوانی کے معاصرین میں میر صدر الدین شیرازی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کو معقولات میں بڑا کمال حاصل تھا اور فلسفہ و منطق میں متعدد رسائل و حواشی ان کی یادگار ہیں۔ ان دونوں بزرگوں میں اکثر علمی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تصنیف و تالیف میں بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ محقق دوانی نے مولانا علاء الدین علی قوشجی کی شرح تجرید پر ایک فاضلانہ حاشیہ لکھا جس کو دیکھ کر خود مولانا قوشجی نے بڑی تعریف کی۔ لیکن میر صدر الدین نے بھی اسی زمانے میں شرح تجرید پر ایک اپنا حاشیہ لکھا جس میں فاضل محقق کے حاشیہ پر اعتراضات کئے۔ یہ دیکھ کر محقق دوانی نے ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے ایک دوسرا حاشیہ لکھا جو پہلے سے زیادہ اچھا تھا۔ اس کے بعد صدر الدین شیرازی نے بھی ایک دوسرا حاشیہ لکھا اور پھر کچھ اعتراض کئے۔ اس کے جواب کے لئے فاضل محقق نے تیسری بار اس کا حاشیہ لکھا۔ پہلے دونوں حواشی حاشیۂ قدیمہ و حاشیۂ جدیدہ کہلاتے ہیں اور موخر الذکر حاشیۂ اجد کے نام سے موسوم ہے۔ شرح تجرید کے علاوہ شرح مطالع اور شرح عضدی کے حواشی کے سلسلے میں بھی ان دونوں حضرات میں بحثیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ صدر الدین شیرازی کے فرزند ارجمند غیاث الدین منصور شیرازی نے منجملہ دوسری کتابوں کے حسب ذیل تین کتابیں تصنیف کی تھیں:

(۱) محاکمات درمیان نحریرین عالمین در حواشی بر شرح تجرید۔

(۲) محاکمات درمیان نحریرین عالمین در حواشی بر شرح مطالع

(۳) محاکمات درمیان نحریرین عالمین در حواشی بر شرح عضدی

ان دونوں عالموں کے درمیان اسی طرح برابر مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے چنانچہ یہ رسم پڑ گئی

تھی کہ جو شخص بھی والیٔ شیراز ہوتا وہ ان دونوں بزرگوں کے کمالات سے مستفید ہونے کی غرض سے علمی مجالس منعقد کرتا اور ان کے علمی مناظرے سے بہرہ ور ہوتا تھا۔

اسی طرح جس وقت محقق دوانی سلطان یعقوب بایندری کے دربار میں تھے، شاہی دربار میں مولانا اسحٰق نیریزی سے جن کا شمار فضلائے وقت میں ہوتا تھا، ایک علمی مباحثہ چھڑ گیا۔ فاضل محقق مولانا اسحٰق کے سوالات کے معقول اور مدلل جوابات دیتے رہے۔ لیکن چوں کہ مولانا نیریزی کو لسانی میں بڑا کمال تھا اور اثنائے مناظرہ میں قدم دائرۂ تہذیب سے باہر نکال دیتے تھے اس لئے قریب تھا کہ فاضل محقق کو مغلوب کر دیں اور آپ کی فضیلت و دانشمندی کو خاکِ مذلت میں ملا دیں اس وقت قاضی میر حسین یزدی جو محقق دوانی کے افاضل تلامذہ میں سے تھے اور اس مجلس عالی کے حاشیہ نشینوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، انتہائی غیرت کی وجہ سے بے قابو ہو گئے اور بول اُٹھے کہ "میں ناچیز مولانا محقق کا ادنیٰ شاگرد ہوں۔ میری گزارش ہے کہ استاذ محقق کا احترام کیا جائے اور مولانا نیریزی کا مناظرہ مجھ پر چھوڑ دیا جائے اگر وہ مجھ کو مغلوب کر دیں تو ہم سب کو ان کی فوقیت تسلیم ہے" سلطان یعقوب نے اجازت دی اور قاضی میر حسین نے پہلے آدابِ مناظرہ کو مختصراً بیان کیا اور پھر مباحثہ شروع ہو گیا ہر چند مولانا اسحٰق نے چاہا کہ دائرۂ تہذیب سے قدم باہر نکالیں اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پرواز کریں۔ لیکن قاضی میر حسین نے ان پر سب راستے بند کر دئے اور آخر کار بفضلِ خدا ان پر غالب آئے۔ جملہ حاضرین نے قاضی میر حسین کا فضل و کمال دیکھ کر تعریف و تحسین کی۔ اس وقت قاضی صفی الدین عیسٰی تبریزی[1] نے جو سلطان یعقوب کی مجلس کے صدر تھے، قاضی میر حسین یزدی کے مولد و مسکن کے متعلق دریافت کیا تو محقق دوانی نے فرمایا کہ وہ یزد کے شرفا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عیسٰی تبریزی نے سلطان سے استدعا کی کہ یزد اور اس کے ملحقات کا عہدۂ قضا ان کو سپرد کیا جائے الغرض میر حسین یزدی شاہی خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز ہو کر یزد کی طرف قاضی کی حیثیت سے روانہ ہو گئے۔

---

[1] حبیب السیر میں ان کا نام قاضی مسیح الدین عیسٰی لکھا ہے۔

محقق دوانی نے عمر کا بیشتر حصہ سلاطینِ بایندری کی سرپرستی میں گزارا۔ سلطان یعقوب کے بعد اس کے بیٹے بائسنقر نے تقریباً ڈیڑھ سال حکومت کی۔ اس کی برطرفی کے بعد رستم بیگ نے عنانِ حکومت سنبھالی اور پانچ سال سے زیادہ حکمرانی کی۔ اس کے بعد احمد پادشاہ بایندری نے عثمانی سلطان یلدرم بایزید کی مدد سے ایران پر حملہ کیا اور ذی قعدہ ۹۰۲ھ میں ایک جنگ میں رستم بیگ مارا گیا اور احمد پادشاہ ولایتِ ایران پر قابض ہو گیا۔ اس بادشاہ نے بھی محقق دوانی کی بڑی قدر و منزلت کی۔ مگر اسی زمانے میں قاسم بیگ پرناک نے جسے احمد پادشاہ سے عداوت تھی، آنجناب سے بہت کافی مال لے لیا۔ آخر کار اس مصیبت سے نجات پاتے ہی آپ نے شیراز کو ترک کر دیا اور لار اور جرون کے علاقے میں جا کر اقامت گزیں ہو گئے۔ چنانچہ عمر کے آخری چند سال آپ نے اسی علاقے میں گزارے۔

وفات | ۹۰۸ھ میں جب سلطان ابو الفتح بیگ بایندری نے شیراز پر قبضہ کیا تو یہ خوشخبری سن کر محقق دوانی نے کازرون کا رخ کیا اور قول آبگینہ میں ابوالفتح بیگ کے لشکر سے جا ملے۔ سلطان نے پہلے سے بھی زیادہ آپ کی تعظیم کی لیکن چند ہی دنوں کے بعد بتاریخ ۹ ربیع الثانی ۹۰۸ھ بروز سہ شنبہ بمرضِ اسہال آپ نے پیامِ اجل کو لبیک کہا۔ چونکہ وہ مقام قریۂ دوان سے نزدیک تھا اس لئے آپ کی نعش دوان لے جا کر وہیں شیخ علی دوانی کے بغل میں دفن کی گئی۔ وفات کے وقت محقق دوانی کی عمر اٹھتر سال کی تھی۔ فرصت شیرازی جس نے ۱۳۱۱ھ میں سلطان ناصر الدین شاہ قاجار کے حکم سے ممالک فارس کا سفر کیا تھا لکھتا ہے کہ محقق دوانی کا مقبرہ قریۂ دوان کے نزدیک واقع ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ایک چھوٹے صحن میں ایک بلند گنبد ہے۔ اس کے بغل میں ایک مجوف بلند منارہ ہے جس کا حجم تقریباً ۱۰×۱۲ ذراع ہے۔ منارہ کی چھت پر جانے کے لئے اندر سے زینے لگے ہیں۔ اس کی بلندی پر سے وہاں کا پورا احاطہ اور جنگلات نظر آتے ہیں

۲۔ محقق دوانی کی تصنیفات

فاضل محقق نے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے اکثر حواشی ہیں اور بعض مختلف کتابوں کی شرحیں۔ ان کے علاوہ کچھ مستقل تصانیف بھی ہیں سب

سے پہلے ان کی عربی تصانیف پیش کی جاتی ہیں۔

رسائل وکتب ۱۔ رسالۂ قدیم در اثبات واجب تعالیٰ۔ یہ رسالہ ۸۹۸ھ میں تصنیف کیا تھا۔

۲۔ رسالۂ جدید در اثبات واجب تعالیٰ۔ یہ رسالہ آخر عمر میں لار کے علاقہ میں تصنیف کیا تھا۔

۳۔ انموذج العلوم۔ یہ رسالہ دس علوم کی تحقیق پر مشتمل تھا اور اس میں حدوثِ عالم کے مسئلہ کی بھی پوری وضاحت کی تھی۔ اسے سلطان محمود شاہ گجراتی کے نام معنون کر کے اپنے شاگرد رشید میر شمس الدین محمد کے ہمراہ اس کے دربار میں بھیجا تھا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔

۴۔ رسالہ در تحقیق عدالت۔ یہ رسالہ بھی سلطان مذکور کے پاس روانہ کیا تھا۔ اس کی بھی تفصیل اوپر گزر چکی۔

۵۔ رسالۂ زوراء۔ یہ رسالہ مختلف فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر مشتمل تھا۔ اور چونکہ اس کی تصنیف کا خیال بغداد اور نجف اشرف کے سفر میں ہوا تھا جو دجلہ سے قریب ہے، اس لئے اس کا نام زوراء رکھا جس کے معنی دجلہ ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ ۱۳۲۶ھ میں قاہرہ سے تعلیقات کے ساتھ شائع ہو چکا ہے (محقق نے اس کا حاشیہ بھی لکھا تھا جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے)

۶۔ رسالہ در تعریف علم کلام۔ قاضی عضد الدین ایجی کی کتاب المواقف میں علم کلام کی جو تعریف دی گئی ہے اس کی توضیح و تشریح کے لئے یہ رسالہ لکھا اور اس میں کتاب مذکور کے شارح سید شریف جرجانی پر ملا علی عران طوسی نے جو اعتراضات کئے تھے ان کا جواب دیا۔ یہ رسالہ امیر نعیم الدین نعمت اللہ کے صاحبزادے میر محب اللہ کے نام معنون کر کے ان کی خدمت میں ہندوستان روانہ کیا تھا۔

۷۔ رسالہ در خلق اعمال۔ خلقِ اعمال کے متعلق یہ رسالہ سعد الدین محمد استرابادی کی درخواست پر کاشان میں تصنیف کیا تھا۔

۸۔ رسالہ در حل مغلطہ مشہور بہ جذر اصم۔

۹۔ رسالۂ قلمیہ۔ یہ رسالہ اکثر فنونِ بلاغت اور تشبیہ کے مختلف اقسام پر مشتمل تھا۔

۱۰۔ بستان القلوب۔

۱۱۔ رسالہ در ایمانِ فرعون ۔ ملا علی قاری نے اس رسالے کی شرح لکھی تھی۔

۱۲۔ رسالۃ فی التنبیہات الواقعۃ فی دعاء الصلوٰۃ ۔

۱۳۔ الرسالۃ العشریۃ ۔ ابن المؤید کے ہمراہ یہ رسالہ سلطان بایزید خاں عثمانی کے پاس روانہ کیا تھا۔

۱۴۔ رسالۃ فی علم النفس ۔ یہ رسالہ ماہیتِ روح اور خلودِ نفس (Immortality of soul جیسے معرکۃ الآرا مباحث پر مشتمل تھا۔

۱۵۔ رسالۃ فی مسائل من الفنون ۔ اس رسالے میں اپنے مشائخ اور سلسلۂ تلمذ کا بھی ذکر کیا تھا۔

۱۶۔ العشر الجلالیۃ ۔

۱۷۔ شرح ہیاکل ۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب ہیاکل النور پر یہ شرح لکھ کر ایک ہندوستانی بادشاہ ملک التجار کے نام معنون کی تھی ۔ یہ شرح شواکل الحور کے نام سے ۱۹۵۳ء میں مدراس گورنمنٹ کی طرف سے اورینٹیل پبلیکیشن سیریز میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۸۔ شرح خطبۂ طوالع ۔ علم کلام میں قاضی بیضاوی کی کتاب طوالع الانوار کے دیباچہ پر یہ شرح تھی۔

۱۹۔ تفسیر آیہ یاایّھا الذین آمنوا خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا ۔ تیموری سلطان شاہرخ کے بیٹے سلطان بائسنقر کے صدر مجلس ملا شمس الدین محمد بدخشی کے نام یہ تفسیر معنون کی تھی۔

۲۰۔ تفسیر سورۂ اخلاص ۔ یہ تفسیر سلطان ابوالفتح بایندری (آق قونیلو) کے نام معنون کی تھی۔

۲۱۔ تفسیر سورۂ قل یاایھا الکافرون ۔

۲۲۔ تفسیر المعوذتین ۔

چاروں قل کی تفاسیر کو مجموعی طور پر تفسیر القلاقل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۳- شرح عقائد عضدی - قاضی عضد الدین ایجی کی کتاب العقائد العضدیہ کی یہ شرح شہر جرون میں ربیع الاول سنہ ۹۰۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی اور غالباً محقق دوانی کی یہ آخری تصنیف تھی، یہ شرح استنبول سے سنہ ۱۸۱۷ء میں اور پیٹرسبرگ سے سنہ ۱۳۱۱ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

۲۴- شرح اربعین حدیث نووی۔

۲۵- شرح رسالہ نصیریہ - یہ شرح نفس الامر کے مفہوم کی وضاحت کے لئے لکھا تھا۔

۲۶- شرح رسالہ در جوہر مفارق - اصل کتاب محقق طوسی نے لکھی تھی۔

۲۷- شرح کلمتی الشہادۃ۔

۲۸- شرح القصیدۃ القافیۃ فی احوال النفس - اس قصیدہ کا مطلع درج ذیل ہے۔

ولقد تقضی من ریاض ذوق بیقاء ذات تنوق وتأنق

حواشی ۲۹- حاشیہ قدیم بر شرح جدید تجرید - محقق طوسی کی کتاب تجرید پر مولانا علاء الدین علی قوشجی نے جو شرح لکھی تھی اس پر یہ حاشیہ لکھ کر سلطان خلیل بایندری کے نام معنون کیا تھا۔

۳۰- حاشیہ جدید بر شرح تجرید - میر صدر الدین شیرازی کے جواب میں یہ حاشیہ سنہ ۸۹۶ھ میں لکھا تھا

۳۱- حاشیہ اجد - شرح تجرید مذکور پر یہ تیسرا حاشیہ سنہ ۹۰۴ھ میں لکھا تھا۔

۳۲- حاشیہ تہذیب منطق - علامہ سعد الدین تفتازانی کی کتاب تہذیب المنطق والکلام پر یہ حاشیہ لکھا تھا جو سنہ ۱۲۶۳ھ اور اس کے بعد سنہ ۱۲۹۳ھ میں لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۳- حاشیہ قدیم بر شرح مطالع و حواشی شریفیہ - علم منطق میں قاضی سراج الدین ارموی کی کتاب مطالع الانوار کی شرح بنام لوامع الاسرار ملا قطب الدین رازی نے کی تھی جس پر سید شریف جرجانی نے حاشیہ لکھا۔ مولانا دوانی نے اس کے اوپر حاشیہ لکھا تھا۔

۳۴- حاشیہ جدید بر شرح مطالع - یہ حاشیہ میر صدر الدین شیرازی کے جواب میں لکھا تھا۔

۳۵- حاشیہ بر اوائل شرح عضدی و حواشی شریفیہ۔ علامہ ابن حاجب کی کتاب مختصر الاصول پر قاضی عضد الدین ایجی اور سید شریف جرجانی نے شرحیں لکھیں۔ اس کے بعد سید شریف جرجانی نے اس کے حواشی بھی لکھے۔ اس کے ابتدائی مباحث پر فاضل محقق نے حاشیہ لکھا جس میں فاضل مدقق ملا علی عران طوسی کے ان اعتراضات کو دفع کیا تھا جو انھوں نے سید شریف جرجانی پر وارد کئے تھے۔

۳۶- حاشیہ بر اوائل کتاب محاکمات۔

۳۷- حاشیہ حکمۃ العین۔ محقق طوسی کے شاگرد علامہ نجم الدین کاتبی قزوینی کی کتاب حکمۃ العین پر مختلف لوگوں نے شروح و حواشی لکھے منجملہ ان کے محقق دوانی نے بھی سواد العین کے نام سے ایک حاشیہ لکھا تھا۔

۳۸- حاشیۂ زوراء۔ چوں کہ رسالہ زوراء مختصر اور مغلق تھا اس لئے ایک مخلص عقیدتمند طالبعلم جس کا نام علی تھا اس کی درخواست پر یہ حاشیہ تصنیف کیا۔ یہ حاشیہ بھی ۱۳۲۶ھ میں متن کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۳۹- حاشیۂ صغیر۔ ملا قطب الدین محیوی انصاری نے رسالۂ زوراء کے خطبہ کی ایک عبارت پر اعتراض کیا تھا اس کے جواب میں یہ مختصر حاشیہ لکھا۔ یہ بھی رسالۂ زوراء کے ساتھ ۱۳۲۶ھ میں شائع ہو چکا ہے

۴۰- حاشیہ بر اوائل شرح چغمینی قاضی زادہ۔ یہ حاشیہ غالباً کسی کتاب کے کنارے لکھا تھا اور علیحدہ سے ترتیب نہیں دیا تھا۔ میر غیاث الدین منصور شیرازی نے اس کا اکثر حصہ اپنے حاشیہ میں نقل کر کے اس کا جواب لکھا تھا۔

۴۱- تعلیقات بر اوائل شرح شمسیہ حواشی شریفیہ۔ محقق طوسی کے شاگرد نجم الدین عمر کاتبی قزوینی کی کتاب شمسیہ کی شرح قطب الدین رازی نے لکھی تھی جس پر سید شریف جرجانی نے حاشیہ لکھا جو میر قطبی کے نام سے مدارسِ عربیہ میں متداول ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ پر تعلیقات مولانا دوانی نے لکھا تھا۔

۴۲ - حاشیہ انوار فقہ شافعی۔

فارسی تصانیف | ۴۳ - کتاب اخلاق - اس کتاب کا پورا نام لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے اور عام طور پر اخلاقِ جلالی کے نام سے موسوم ہے۔ اسے سلطان خلیل اور اس کے والد سلطان حسن بیگ بایندری کے نام معنون کیا تھا۔ اخلاق جلالی ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے اور ۱۲۸۳ھ میں نولکشور سے شائع ہو چکی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ تامسن (Thompson) نے ۱۸۹۳ء میں لندن سے شائع کیا ہے

۴۴ - رسالہ تہلیلیہ - یہ رسالہ کلمۂ توحید کی تشریح میں لکھ کر سلطان مذکور کے نام معنون کیا تھا۔

۴۵ - رسالۂ دیگر - شیراز کے بند امیر میں سلطان مذکور کی فوج کے مظاہرہ کے متعلق لکھا تھا۔ اس رسالے میں حُسنِ عبارت کا التزام پایا جاتا ہے۔

۴۶ - رسالہ در عدالت - یہ رسالہ عراق کے ایک سلطان کے نام لکھ کر میر شمس الدین محمد کے ہمراہ اس کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

۴۷ - رسالہ در تحقیق معنی خبر و اخبار (؟) یہ رسالہ میر میران قاضی اصفہانی کے نام معنون کیا تھا۔ غالباً اس کا صحیح نام "رسالہ در جبر و اختیار" ہے جیسا کہ فرصت شیرازی نے لکھا ہے۔

۴۸ - رسالہ خواص حروف - یہ رسالہ سلطان غیاث الدین غیاث شاہ مندوی کے نام تصنیف کر کے سید جمال الدین نصر اللہ کے ہمراہ سلطان مذکور کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

۴۹ - رسالہ در دیوانِ مظالم - لار کے علاقہ میں یہ رسالہ لکھ کر وہاں کے حاکم ملک علاء الملک کے نام معنون کیا تھا۔

۵۰ - رسالہ موسوم بہ صیحہ وصدا۔

۵۱ - نور الہدایہ۔

۵۲ - رسالہ در شرح غزل حافظ شیرازی - اس غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

در ہمہ دیر مغاں نیست چو من شیدائے   خرقہ جائے گرو بادہ و دفتر جائے

۵۳ - رسالہ در شرح بیت حافظ شیرازی -

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت — آفریں بر نظر پاک و خطا پوشش باد

۵۴ - رسالہ در شرح بیتے از ابیات شیخ جیستری قدس سرہٗ -

۵۵ - شرحِ رباعیات - اپنی چند رباعیوں کی شرح لکھ کر قیصرِ روم کے نام معنون کیا تھا۔

۳ - محقق دوانی کے اشعار

نثر نگاری کے ساتھ ساتھ محقق دوانی کو شعر گوئی میں بھی اچھا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے اشعار جن میں تصوف اور عشقِ حقیقی کا رنگ جھلکتا ہے اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ لفظی محاسن سے بھی آراستہ ہیں۔ ذیل میں آپ کی غزل و رباعیات کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فاضل محقق کا قلب عشقِ رسول اور اہل بیت اطہار کی محبت سے معمور تھا۔

غزل

روئے بنما کہ جہاں ظلمتِ انکار گرفت — صیقلی زن کہ مرا آئینہ زنگار گرفت

توئی آں شاہ کہ از کشور حسنت بےخلے — ملک جان و دل و دیں جملہ بیکبار گرفت

آفتاب ازل از مشرقِ رویت چو دمید — ہمہ ذرات جہاں لمعۂ انوار گرفت

صدق دعویٰ تو از نور جبینت پیداست — منکر از کور دلی شیوۂ انکار گرفت

چوں دوانی نخورد درد غم از کاسۂ چرخ — ہر کہ جامے ز کفِ ساقی ابرار گرفت

ولہٗ ایضاً

عارفاں قدر ترا مقصدِ اعلیٰ خوانند — طاق ابروئے ترا مسجد اقصیٰ خوانند

تیز بینانِ جہاں خاک سر کوئے ترا — توتیائے نظرِ مردم بینا خوانند

قامتِ دلکش و رخسار دلفروز ترا — اہلِ عرفاں شجر و آتشِ موسیٰ خوانند

سخن از قد تو گفتم چو دوانی زاں رو — سخنانم ہمہ در عالم بالا خوانند

ولہٗ ایضاً

بنورِ خاطر خود می رویم در رہِ عشق — چراغِ خاطرِ دوں ہمتاں چہ نور دہد

اگرچہ فیضِ خدا شامل است یکساں نیست نہ ہر جبل کہ تو بینی صدا چو طور دہد

رباعیات

اے مصحفِ آیاتِ الٰہی رویت وے سلسلۂ اہلِ ولایت مویت
سر چشمۂ زندگی لب دلجویت محرابِ نمازِ عارفاں ابرویت

دیگر

از مہر علی کسے کہ یابد عرفاں نامش ہمہ دم نقش کند بر دل وجاں
ایں نکتۂ طرفہ بیں کہ اربابِ کمال یابند ز بینات نامش ایماں

دیگر

خورشید کمال است نبی ماہ ولی اسلام محمد است وایمانست علی
گر بینتے بریں سخن می طلبی بنگر کہ زبینات اسما است جلی

دیگر

رو رخت طلب بہ ساقی کوثر کش وز کوثر کثرت مئے وحدت درکش
لا یظمأ اصلاً ابداً شاد بھا رمزے است دریں مے ارتوانی درکش

دیگر

در ملک حقیقت است آں شاہ مدار دست از طلب دامن آں شاہ بدار
او باب مدینۂ علوم است در آئے زاں درگہ رسی زود بمسندگہ یار

محقق دوانی نے سلطان ابوسعید کے قتل کے متعلق یہ تاریخی قطعہ لکھا تھا۔

سلطان ابوسعید کہ در فرخی چشم سپہر پیر جوانے چو نہ دید
الحق چگونہ کشتہ نگردد کہ گشتہ بود تاریخ قتل (مقتل سلطان ابوسعید)

اس سے تاریخ قتل بحساب جمل ۸۷۳ = ۶۹ - ۱۴۶۸ نکلتی ہے۔

مصادر و مراجع

اس مقالہ کی ترتیب میں مندرجہ ذیل کتابیں استعمال کی گئیں :-

۱۔ حبیب السیر
۲۔ مجالس المومنین
۳۔ تحفۂ سامی
۴۔ ہفت اقلیم
۵۔ لب التواریخ
۶۔ آثار عجم
۷۔ احسن التواریخ
۸۔ کشف الظنون
۹۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
۱۰۔ برٹش میوزیم کیٹلاگ (فارسی مخطوطات)

تزکِ بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۱۳)

علی دوست کا فتنہ اندجان پہنچنے کے بعد علی دوست کا ڈھنگ بدلنے لگا۔ جو لوگ مصیبتوں اور لڑائیوں میں میرے رفیق تھے۔ وہ ان سے بُرا سلوک کرنے لگا۔ پہلے خلیفہ کو نکال باہر کیا۔ پھر ابراہیم ساڑو اور ویس لاغری کو بے وجہ اور بے گناہ مجرم ٹھہرایا۔ اور ان کے گھر بار لوٹ لئے۔ اور انھیں ان کے علاقوں سے نکال دیا۔ آخر میں قاسم بیگ کی بھی خبر لی۔ اور یہ الزام دھر کر خلیفہ اور ابراہیم ساڑو خواجہ قاضی کے یار غار ہیں۔ مجھ سے ان کا بدلہ نہ لے لیں۔

محمد دوست کی فرعونیت اس کا بیٹا محمد دوست تو حد سے بڑھ گیا۔ بادشاہت کے ڈھنگ برتنے لگا۔ اس کی مجلسوں اور دعوتوں کے طریقے، آرائشی ساز و سامان اور دربار کے قرینے سب ہو بہو بادشاہوں جیسے ہو گئے۔

تنبل دشمنوں کو اکساتا رہا دونوں باپ بیٹے، تنبل کے برتے پر یہ حرکتیں کر رہے تھے۔ مجھ میں اتنی قدرت بھی نہ تھی۔ کہ انھیں ان نامعقول حرکتوں سے روک سکوں۔ تنبل جیسا دشمن میری بغل میں بیٹھا تھا اور انھیں اُکسا رہا تھا۔ وہ جو جی چاہتا کر گزرتے۔ بڑا نازک موقعہ تھا۔ مجھ میں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس زمانے میں ان دونوں باپ بیٹوں سے مجھے بڑی ذلت برداشت کرنی پڑی۔

پہلی شادی عائشہ سلطان بیگم سے جو میرے چچا سلطان احمد مرزا کی بیٹی تھی۔ میرے والد اور چچا کی زندگی میں میری منگنی ہو گئی تھی۔ وہ خجند میں جو آئی۔ تو شعبان میں اُس سے میری شادی ہو گئی۔

بیوی سے شرم و حجاب شروع میں نئی نئی شادی ہوئی۔ تو مجھے اس سے بہت زیادہ محبت تھی مگر شرم

کے مارے میں دس پندرہ، بیس دن بعد اس کے پاس جاتا تھا آخر آپ ہی آپ وہ محبت ختم ہوگئی اور شرم زیادہ آنے لگی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے بعد میری والدہ خانم نے بہت ڈانٹا اور بڑی مشکل سے مجھے اس کے پاس بھیجا۔

ایک لڑکے سے عشق | بابری نام اُردو بازار میں ایک لڑکا تھا۔ اس سے ایک مناسبت یہ تھی۔ کہ وہ میرا ہمنام تھا۔ میں ان ہی دنوں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

اس سے پہلے میں کسی پر شیدا نہ ہوا تھا۔ نہ کسی سے محبت و الفت کی بات چیت تک ہوئی تھی۔ نہ یہ جانتا تھا کہ دل لگانا کسے کہتے ہیں۔

میں اس زمانے میں فارسی کا ایک آدھ شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد　　ہیچ محبوبے چو تو بے رحم و بے پروا مباد

مگر حال میرا یہ تھا کہ کبھی بابری میرے سامنے آنکلتا۔ تو میں شرم کے مارے اسے نگاہ بھر کے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس سے ملنا جلنا اور باتیں کرنا تو دور کی بات ہے۔ دل کے اضطراب کی حالت یہ تھی کہ اس کے آنے کا شکریہ تک ادا نہ کر سکتا تھا۔ نہ یہ کہ اس کے نہ آنے کا شکوہ زبان پر لا سکتا اور زبردستی بلانے کی تو مجال کس کو تھی۔

اسی وارفتگی کے زمانے میں ایک دن میں پوری شان و شوکت کے ساتھ ایک گلی میں چلا جا رہا تھا کہ ایکا ایکی بابری سے آمنا سامنا ہو گیا۔ عجیب حالت ہوئی۔ قریب تھا کہ غش آ جائے۔ نظر بھر کے دیکھنا یا بات کرنی ممکن نہ ہوئی۔ جھینپتا اور گھبراتا ہوا آگے نکلا چلا گیا اور بے اختیار محمد صالح کی بیت یاد آگئی ؎

شوم شرمندہ ہر گہ یار خود را در نظر بینم　　رفیقاں سوئے من بینند و من سوئے دگر بینم

یہ بیت ہو بہو میرے حسب حال تھی۔ اس زمانے میں عشق و محبت کا وہ زور ہوا اور جوانی اور جنون کا ایسا تاثر تھا کہ کبھی ننگے سر ننگے پاؤں محلوں اور باغ باغیچوں میں مارا مارا پھرتا اپنے بیگانے برے لگنے لگے اور کسی کی کوئی پرواہ نہ رہی۔

دیوانوں کی طرح کبھی تن تنہا پہاڑوں اور جنگلوں کو کھنگالتا پھرتا۔ کبھی باغوں اور محلوں میں کوبکو بھٹکتا رہتا۔ اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا اپنے اختیار میں نہ رہا۔ نہ چلنے میں قرار آتا اور نہ بیٹھنے میں سکون ملتا۔

ترخانوں کا اقتدار | اسی سال سلطان علی مرزا اور محمد مزید ترخان میں ان بن ہو گئی۔ ترخانوں کا اقتدار اور اعتبار بہت بڑھ گیا تھا[1]۔ باقی پورے بخارا کو دبا بیٹھا۔ حد یہ کہ بخارا کی آمدنی میں سے ایک کوڑی کسی کو نہ دیتا تھا۔ محمد مزید ترخان سمرقند کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے تمام علاقہ اپنے ٹبوں، عزیزوں اور اپنے ساتھیوں کے لئے گھیر لیا۔ شہر کی آمدنی میں سے جو تھوڑی سی رقم وظیفہ کے طور پر مقرر تھی۔ اس کے سوا کسی طرح کوئی پیسہ سلطان علی مرزا کو نہ پہنچتا تھا۔

سلطان علی مرزا جوان ہو گیا تھا۔ اس رنگ ڈھنگ کو کب تک برداشت کرتا۔ اپنے رفیقوں کے بل بوتے پر محمد مزید خاں کی فکر کرنے لگا۔

مزید کی سوجھ بوجھ | محمد مزید ترخان تاڑ گیا۔ وہ اپنے نوکروں چاکروں، عزیزوں، ساتھیوں اور ان امراء کو جو اس سے ملے ہوئے تھے۔ جیسے سلطان حسین ارغون، پیر احمد، اوزون حسن کا چھوٹا بھائی خواجہ حسین، قرابرلاس، صالح محمد اور بعض اور امراء اور سپاہیوں سمیت شہر سے باہر چلا گیا۔

مزید کی مغل لشکر سے سازباز | اسی زمانے میں سلطان محمود خاں نے محمد حسین دغلت، احمد بیگ اور اپنے بہت سے مغلوں کو خان مرزا[2] کے ساتھ سمرقند بھیجا۔

حافظ بیگ دولدائی اور اس کا بیٹا طاہر بیگ توخاں کے بیگ آتکہ تھے ہی حسن نبیرہ، ہندو بیگ اور کچھ وہ لوگ جو حافظ بیگ اور طاہر بیگ سے لگاؤ رکھتے تھے سلطان علی مرزا کے ہاں سے بھاگ کر خان مرزا کے ہاں چلے گئے۔

---

[1] وجہ یہ تھی کہ ترخانوں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اور انھوں نے تمام ملک بخارا دبا لیا تھا۔ اور اس کی آمدنی میں سے ایک کوڑی کسی کو نہ دیتے تھے۔ [2] خان مرزا کو ویس مرزا بھی کہتے تھے۔ وہ سلطان محمود مرزا کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں اس کو اپنے بھائی کے پاس تاشقند لے گئی تھی۔ خان مرزا کی ماں بابر کی چھوٹی خالہ مہر نگار خانم تھی۔

محمد مزید ترخان نے آدمیوں کو بھیج کر خان مرزا اور مغل لشکر کو بلایا۔ اور شادوار کے پاس خان مرزا اور مغل امرار سے ملاقات کی۔

ترخانوں اور مغلوں کا بگاڑ مغل امرار اور محمد مزید بیگ ایک دوسرے پر اعتماد نہ کر سکے۔ بلکہ مغلوں نے محمد مزید ترخان کو پکڑ لینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن مزید ترخان اور اس کے امرار اس چال کو بھانپ گئے اور انھوں نے بہانہ سازی کر کے مغلوں سے کنارہ کر لیا۔

ان کے جاتے ہی مغلوں کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔

علی مرزا کا کارنامہ جب وہ یار ییلاق میں جا کر ٹھیرے تو سلطان علی مرزا نے تھوڑی سی فوج ساتھ لی اور ایکا ایکی خان مرزا اور مغلوں کے لشکر پر جا پڑا۔ مغل بے لڑے بھڑے بھاگ نکلے۔

آخر میں سلطان علی مرزا نے یہی ایک کارنامہ دکھایا۔

مزید کا سفیر آیا محمد مزید ترخان اور دیگر امرار، علی مرزا اور اُس کے بھائیوں سے مایوس ہو گئے۔ اور عبدالوہاب مغل کو میرے پاس بھیجا۔ وہاب اس سے پہلے میرے پاس رہ چکا تھا۔ اور جب اندجان گھر گیا تھا تو اس نے خواجہ قاضی کا ساتھ دینے میں جان لڑا دی تھی۔

جہانگیر کو مدد کے لئے بلایا انھوں نے اپنی مدد کے لئے مجھے بلایا تھا۔ لیکن میں خود بھی اسی جستجو میں مبتلا تھا۔ سمرقند حاصل کرنے ہی کے لئے جہانگیر مرزا سے صلح کی تھی اس لئے فوراً میر مغل کو جہانگیر مرزا کے پاس ڈاک چوکی میں آخشی بھیجا۔ اور خود سمرقند جانے کی تیاریاں شروع کیں۔

خلیل نے اوش چھین لیا ذیقعدہ کے مہینے میں ہم سمرقند روانہ ہوئے۔ اور چوتھے دن قبا پہنچے۔ ظہر کے وقت خبر ملی کہ تنبل کے چھوٹے بھائی خلیل نے چپکے سے جا کے اوش کا قلعہ چھین لیا۔

خلیل کے حیلے بہانے وہ قیدی جب چھوڑ دئے گئے جن کا سردار تنبل کا چھوٹا بھائی خلیل تھا۔ تو تنبل نے خلیل کو اوزکند بھیجا۔ کہ جا کے بال بچوں کو لے آئے۔ وہ وہاں ایسا جم کے بیٹھا کہ ہلنے کا نام نہ لیا۔ حیلے بہانے کرتا رہا۔ کہ آج آتا ہوں۔ کل آتا ہوں۔ جب میں لشکر لے کر سوار ہو گیا۔ تو اس نے میدان صاف اور اوش خالی پایا۔ اس لئے راتوں رات چپکے سے جا کے ایکا ایکی اوش چھین لیا۔

سمرقند کے لئے اندجان چھوڑا | ہم نے یہ خبر سنی - لیکن ٹھہرنا اور لڑنا مصلحت کے خلاف تھا - ہماری پوری توجہ سمرقند کی طرف تھی - اس کے علاوہ ہمارے سپاہی سامانِ جنگ ٹھیک ٹھاک کرنے اپنے اپنے گھروں کو مختلف مقامات کی طرف گئے ہوئے تھے اور ہم صلح کے بھروسے پر دشمنوں کے فریبوں سے غافل اور بے خبر تھے - اور علی دوست اور قنبر علی جیسے ہمارے دو بڑے سردار ایسی حرکتیں کر چکے تھے - کہ ان پر اعتماد نہ رہا تھا - اور محمد مزید ترخان نے جو سمرقند کے امراء کا سردار تھا - عبدالوہاب مغل کو مجھے بلانے کے لئے بھیجا - اس لئے سمرقند جیسے پایۂ تخت کو چھوڑ کر اندجان جیسی چھوٹی سی جگہ کے لئے کون وقت ضائع کرتا

مرغینان میں | میں قبا سے مرغینان پہنچا - وہاں قوچ بیگ کے باپ سلطان احمد بیگ کا تقرر کیا گیا تھا - وہ اپنے بال بچوں کے سبب میرے ساتھ نہ چل سکا - اس لئے وہیں رہ گیا - البتہ قوچ بیگ اپنے دو ایک بھائیوں سمیت میرے ساتھ ہولیا -

غیبی امداد | میں اسفرہ کے راستے مجن[1] پہنچا - جو اسفرہ کے تحت ایک گاؤں ہے - وہیں اتفاق حسنہ سے رات کو قاسم بیگ اور علی دوست اپنی اپنی فوجوں سمیت اور سید قاسم اور بہت سے بہادر سپاہی آپہنچے اور میرے ساتھ ہوئے -

قنبر کی گرفتاری | ہم وہاں سے دشت خیابان اور پل خوبان[2] سے ہوتے ہوئے اورا تیبہ پہنچے -

قنبر علی تنبل پر اعتماد کر کے اپنے علاقے خجند سے اس کے پاس آخشی گیا تاکہ حملے کے بارے میں بات چیت طے کرے - لیکن وہ جیسے ہی وہاں پہنچا - تنبل نے اسے قید کر کے اس کے علاقے پر حملہ بول دیا -

قنبر قید سے بھاگا | قنبر علی کو جب ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا - وہ راستے میں سے نکل بھاگا اور ہزاروں مصیبتیں سہہ کے پیدل ہمارے پاس اورا تیبہ پہنچا -

شیبانی کی فتح | ہم وہیں تھے جو خبر ملی کہ شیبانی خاں نے باقی ترخان کو زیر کر کے قلعہ بوسی چھین لیا اور اب وہ بخارا گیا ہے -

---

[1] شرح سے مجن [2] چنان یا ظلین

سنگ زار کا قلعہ | ہم اورا تیبہ سے ییلاغ بور کہ ہوتے ہوئے سنگ زار[1] پہنچے۔ وہاں کے داروغہ نے قلعہ ہمارے حوالے کر دیا۔

سنگ زار قنبر کو بخشا | قنبر علی تباہ و برباد ہو کر آیا تھا۔ اس لئے اسے سنگ زار میں چھوڑا۔ اور ہم آگے بڑھے۔

یورت خان میں | جب ہم یورت خان پہنچے۔ تو سمرقند کے امرا جن کا سردار محمد فرید ترخان تھا خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن نے ان سے سمرقند کے چھینٹنے کی ترکیبیں پوچھیں۔

بادشاہ گر خواجہ یحییٰ | سب نے کہا خواجہ یحییٰ آپ کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس خیال پر جار ہے تو سمرقند بڑی آسانی سے ہاتھ آجائے گا۔

خواجہ یحییٰ کے پاس کئی دفعہ آدمی بھیجے۔ لیکن اس نے کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دیا لیکن کوئی ایسی بات بھی نہ کہی جس سے امید ٹوٹ جاتی۔

محمد علی کتاب دار | یورت خاں سے چل کر ہم درغم کے پاس جا اترے۔ وہیں سے محمد علی کتاب دار کو خواجہ یحییٰ کے پاس بھیجا۔ اور وہ جواب لایا کہ تشریف لایئے سمرقند حاضر ہے۔

محمود دول دائی کی منافقت | شام ہوتے ہی ہم درغم سے سوار ہو کر شہر چلے۔

سلطان محمد دول دائی کے باپ سلطان محمود دول دائی یورت خان سے بھاگ کر دشمن کے پاس پہنچا۔ اور اسے سارا بھید بتا دیا۔

راز جب کھل گیا۔ تو ہماری تدبیریں رکھی رہ گئیں۔ مجبوراً الٹے پاؤں واپس آئے اور درغم کے پاس جا اترے۔

ابراہیم سارو کی آمد | ابراہیم سارو منکلیغ (جس پر ہیں نے سب سے زیادہ عنایتیں کی تھیں۔ اور جب ہم یارسیلاق میں تھے تو علی دوست نے اس کو برباد کر کے نکال دیا تھا) اپنے بیٹے محمد یوسف کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ تمام مصاحب اور امرا بھی ایک ایک کر کے میرے پاس آگئے۔ علی دوست جن کا دشمن تھا۔ اور جن میں سے بعض کو اس نے برباد کر کے جلا وطن کر دیا تھا۔

---

[1] ایک نسخے میں یہ بھی ہے کہ "انھوں نے خدمت گذاری کا یقین دلایا"

علی دوست دفعان ہوا | یوں علی دوست کا زور ٹوٹ گیا۔ اس نے چونکہ مجھے اور میرے خیراندیشوں کو تنبل کے بل بوتے پر ستایا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ بھی مارے ڈر اور مارے شرم کے میرے پاس نہ ٹھیر سکا۔ اور رخصت کی اجازت مانگی۔ میں نے بے تامل چلتا کیا اور اطمینان کا سانس لیا۔

باپ بیٹوں کا عبرتناک حشر | علی دوست اور محمد دوست فوراً تنبل کے پاس پہنچے۔ اور اس کے یار غار بن گئے۔ اور دونوں نے میرے ساتھ بہت سی برائیاں اور بہت سی بغاوتیں کیں۔

دو ایک برس بعد علی دوست کے ہاتھ میں سرطان کا پھوڑا ہوگیا اور وہ اسی میں مرگیا۔

محمد دوست ازبکوں کے پاس پہنچا۔ اور وہاں اسے خاصی کامیابی ہوئی۔ وہاں رہتا تو اس کے حق میں برا نہ تھا۔ لیکن وہاں بھی اس نے نمک حرامی کی اور بھاگ نکلا۔ اور اندجان کے پہاڑوں میں فتنے برپا کرتا رہا۔ اور فساد مچاتا رہا۔ آخرکار ازبکوں نے اسے پکڑ کر اندھا کر دیا۔ ؎

کسی نے سچ کہا ہے کہ فلاں آدمی کے نمک نے فلاں آدمی کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

بخارا پر شیبانی کا قبضہ | ان دونوں کو دفعان کرنے کے بعد میں نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ غوری برلاس کو بخارا بھیجا۔ کہ وہاں کی سن گن لے۔ اتنے میں خبر ملی کہ شیبانی خاں نے بخارا مار لیا۔ اور اب وہ سمرقند کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔

کیش کی طرف فرار | میں نے وہاں آس پاس ٹھیرنا مناسب نہ جانا۔ اس لئے کیش[1] چلا گیا سمرقند کے اکثر امرا کے گھر بار بھی کیش ہی میں تھے۔

شیبانی نے سمرقند بھی لے لیا | کیش پہنچنے کے ایک دو ہفتہ بعد خبر ملی کہ سلطان علی مرزا نے سمرقند شیبانی خاں کے حوالے کر دیا۔

زہرہ کی بے وقوفی | سلطان علی مرزا کی ماں زہرہ بیگی آغا نے بے وقوفی کی۔ اس نے چھپے چوری شیبانی خاں کے پاس آدمی بھیجا۔ اور اس کو پیغام دیا۔ کہ شیبانی خاں مجھ سے شادی کرلے

---

[1] سمرقند کے شمال کی طرف پہاڑوں میں کیش ایک قلعہ ہے

تو میرا بیٹا سمرقند اس کو دے دے گا۔

مطلب یہ تھا کہ شیبانی خاں سمرقند لینے کے بعد سلطان علی مرزا کو اس کے باپ کا ملک واپس دے دے گا۔

یوسف ارغون کو اس پیام و سلام کی خبر تھی۔ بلکہ یہ ترکیب اسی بے ایمان نے سجھائی تھی

سنہ ۹۰۶ ہجری کے حالات

شیبانی سمرقند میں | شیبانی خاں اس عورت کے وعدے وعید پر چلا گیا۔ اور باغ میدان میں جا اترا۔

علی مرزا کی بے غیرتی | سلطان علی مرزا نے امیروں، سرداروں، ملازموں اور سپاہیوں میں سے کسی کو خبر تک نہ کی۔ نہ کسی سے صلاح مشورہ کیا اور کیا تو یہ کیا کہ دوپہر کے قریب چند بچی ملازموں کو ساتھ لیا اور چوراہے دروازے سے باہر نکل کر شیبانی خاں کے پاس باغ میدان جا پہنچا۔

شیبانی خاں مرزا سے ملا۔ مگر بے رخی سے ملا۔ اور اسے بیٹھنے کے لئے اپنے سے بہت نیچی جگہ دی۔

خواجہ یحییٰ سٹپٹا گیا | خواجہ یحییٰ نے جو سنا کہ مرزا چلا گیا تو وہ سٹپٹا گیا۔ اور سوائے شیبانی خاں کے پاس چلے جانے کے کچھ بن نہ پڑی۔

شیبانی خاں نے ملاقات کے وقت خواجہ کو بھی تعظیم نہ دی اور اس کی بجائے شکایت کے دفتر کھول دئے۔

مگر جب خواجہ واپس جانے لگا تو شیبانی خاں اٹھا اور خواجہ کو تعظیم کے ساتھ رخصت کیا۔

خان علی شیبانی خاں کی خدمت میں | خواجہ علی کا بیٹا خان علی بائی، رباط خواجہ میں تھا۔ اس نے جو اپنے مرزا کے پہنچنے کی خبر سنی تو اسے بھی شیبانی خاں کے پاس جانا پڑا۔

سنہ مطابق ۲۸ جولائی سنہ ۱۵۰۰ء

آسٹریلیا میں اسلام

ترجمہ

(جناب مجیب الرحمٰن صاحب عثمانی)

"جامعہ نگر"

مسلمانوں کی آمد کا آغاز آسٹریلیا میں اسلام کی اشاعت کی کہانی اتنی ہی دلچسپ اور حسین ہے جتنی خود آسٹریلیا کی۔ اسلامی تاریخ کے واقعات نے آسٹریلیا کی تاریخ کے اوراق پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک آسٹریلیا کے ساحلی علاقوں میں نئی آبادیاں بس رہی تھیں۔ لیکن محض ساحلوں پر ہی بس جانا کافی نہ تھا۔ باہمت انسان اس نئے براعظم میں نامعلوم اندرونی علاقوں کا پتہ لگانا چاہتے تھے۔ پہلے دوررس نگاہوں نے اچھی چراگاہوں اور کانوں کو دریافت کیا۔ پھر دھیرے دھیرے یہاں آکر بسنے والوں نے اُن جنگلات کی بادیہ پیمائی کی جن میں پہلے کوئی نہ گیا تھا۔ سائنس دانوں، جغرافیہ دانوں اور کان کنی کے ماہرین نے اس نئی سرزمین میں چھپی ہوئی دولت کو معلوم کرنے کی کوششیں شروع کیں، اس کام میں سب سے پہلے آمد و رفت کے ذرائع کا مسئلہ سامنے آیا۔ انتخاب بہت محدود تھا اور جو ذرائع استعمال کئے گئے تھے وہ بھی ناقابلِ اطمینان ثابت ہوئے۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں ایک بہت ہی اچھا خیال لوگوں کے ذہنوں میں آیا۔ وہ یہ کہ ہندوستان کے میدانوں اور افغانستان کے کوہستانوں میں بسنے والوں سے بہتر کون ہو سکتا ہے جن کے ذرائع آمد و رفت سالہا سال کے آزمودہ ہیں۔

اس سلسلے میں تجویزیں تیار کی گئیں اور جلد ہی افغانستان کے شتربان اور ہندوستان کے مضبوط اور جفاکش باشندے اپنے مویشیوں سمیت آسٹریلیا میں آکر بسنے لگے۔ ان کو کھوج لگانے والی جماعتوں کے ساتھ لگا دیا گیا۔ یہ سامانِ رسد بھی پہنچاتے تھے اور نئے نئے راستے بھی معلوم کرتے تھے۔ یہی لوگ اپنے ساتھ اسلام لائے۔ اور اس طرح ان کا مذہب آسٹریلیا کے کونے کونے

میں پہنچتا رہا۔

ان میں سے بیشتر کنوؤں اور چشموں کے پاس آباد ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے قصبے ابھرنے لگے۔ آسٹریلیا زراعتی، تجارتی اور صنعتی اعتبار سے ترقی کرتا گیا۔ یہ لوگ اپنے خاندانوں کو بھی لے آئے اور اس طرح اس نئے براعظم میں مسلم فرقہ باقاعدہ آباد ہو گیا۔

آیئے۔ اب آسٹریلیا کی مختلف چھ ریاستوں میں اسلام کے آغاز کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔

(۱) جنوبی آسٹریلیا: ۱۸۲۷ء میں ایڈی لیڈ (Adelaide) کے لوئی گوہن نامی سوداگر نے اس نئی ریاست کے صدر مقام کے نواح میں ایک قطعۂ زمین خریدا۔ ۱۸۸۹ء تک یہ اس کے پاس رہا۔ اس زمانے میں ایک شتربان نے، جو تجارت اور دولت کے اعتبار سے کافی مستحکم تھا، اس ریاست میں اسلام کا ایک مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۸۹ء کو حاجی ملا مبین نے گوہن سے یہ زمین خرید لی۔ ملا مبین کی مسلمانوں میں بہت عزت تھی۔ اس زمانے کے ایڈی لیڈ کو بہ مشکل ایک قصبہ کہا جا سکتا ہے، اس میں چند دکانیں اور چند مکان تھے اور چار سو کے قریب مسلمان رہتے تھے۔ حاجی صاحب نے مسلمانوں کے سامنے مسجد کی تعمیر کی تجویز پیش کی۔ اس کو سب نے پسند کیا اور دل کھول کر چندے دئے۔ مسجد تعمیر ہو گئی اور آج تک آباد ہے۔

اسی زمانے میں مغربی آسٹریلیا میں سونے کی دریافت ہوئی اور مسلم آبادی دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ اور حاجی صاحب، جن کی سخاوت کا نہ صرف مسلمانوں بلکہ دوسرے لوگوں میں بھی شہرہ تھا، اتنے مقروض ہو گئے کہ قرض ادا نہ کر سکے۔ اس لئے انھیں یہ جائداد فروخت کرنا پڑی۔ ۱۸۹۶ء تک یہ جائداد دو غیر مسلموں کے پاس رہی۔ مسلمانوں کی حالت اس زمانے میں بہت بہتر ہو گئی اور قرض اتارنے کے لئے معقول رقم جمع کر لی گئی۔ لیکن دو مسلمانوں نے اسے خریدا۔ ایک حصہ غنی خاں نے اور دوسرا حصہ ایک افغان عبدالواحد نے۔ غنی خاں والے حصے پر، جسے بعد میں کچھ عیسائیوں نے خرید لیا تھا، مکانات بن گئے ہیں جن سے مسجد کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ عبدالواحد والا حصہ ۹۵×۹۵ فیٹ کے ایک قطعۂ زمین کی شکل میں موجود ہے۔ اس میں مسجد ہے۔ اور ایک

مسافر خانہ اور کچھ مکانات بھی ہیں۔ یہ سب چیزیں اسلامک سوسائٹی آف ساؤتھ آسٹریلیا کی نگہداشت میں ہیں۔ سوسائٹی نے سیمنٹ کی نئی رونقیں اور ایک نیا برآمدہ حال میں بنوایا ہے۔ علاوہ ازیں بہت قبل کے لگائے ہوئے انگوروں کے باغوں میں بھی نئی بیلیں لگوائی ہیں۔ اس باغ سے مسجد کو معقول آمدنی ہے۔ مسجد کے صدر دروازے کے سامنے ایک بڑا لان بھی بنوایا گیا ہے اور اندرونی حصّے کی مکمّل مرمت کرائی گئی ہے۔ مسافر خانے کو بھی بہتر حالت میں لانے کی تجویز ہے۔ یہ تمام کام سوسائٹی خود کر رہی ہے۔ اس بستی کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے وعظ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مسلم تہوار بھی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ اس وقت اس ریاست میں دو اور تین سو کے درمیان مسلمان رہتے ہیں۔ مختلف زمانوں میں یہاں مسلمانوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ ذیل میں دئے گئے اعداد و شمار سے اس کا کچھ اندازہ ہوگا۔

سن:-	۱۸۴۴	۱۸۶۱	۱۸۸۱	۱۹۱۱
تعداد:-	۵۷	۴۷۲	۴۷۶۲	۱۴۲۱
	۱۹۳۳	۱۹۴۵	۱۹۵۵	
	۹۴۹	۶۲۰	۳۰۰	

آخری تعداد یوروپی مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے رفتہ رفتہ مائل بہ ترقی ہے۔ پہلی تعداد صرف اس ریاست کے صدر مقام کے مسلمانوں کی ہے اس لئے کہ ملک کے اندرونی علاقے اس وقت تک دریافت نہیں ہوئے تھے۔ سنہ ۱۸۶۱-۱۹۱۱ء کا زمانہ نئی دریافتوں اور ترقی کا زمانہ ہے اس دور میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً بڑھی۔ البتہ دوسری ریاستوں کی دریافت، توسیع اور ترقی کے بعد اس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد پھر کم ہوئی اور سنہ ۱۹۳۳ء سے برابر کم ہو رہی ہے۔ البتہ سنہ ۱۹۵۵ء سے پھر بڑھنے کے آثار نظر آرہے ہیں۔

(۲) مغربی آسٹریلیا | مغربی آسٹریلیا میں اسلام کا ظہور اس صدی کے آغاز میں ہوا۔ ۱۳ر نومبر سنہ ۱۹۰۵ء میں پرتھ ([illegible]) میں مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ ایڈی لیڈ کی مسجد کی طرح یہ بھی آج تک زیر استعمال

ہے۔ اسی سے ملحق ایک مسافر خانہ بھی ہے جو اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ جن مسلمانوں کو سفید فام لوگ جگہ دینے سے انکار کریں گے ان کو یہاں رکھا جائے گا۔ اس میں تقریباً ساٹھ آدمی رہ سکتے ہیں۔ آج کل اس میں سات مسلمان مقیم ہیں۔

ایک انگریز مسلمان شیخ محمد علی جو اب ضعیف ہو چکے ہیں، مغربی آسٹریلیا کے مسلمانوں کے رہنما رہے ہیں۔ انھوں نے جنوبی آسٹریلیا کی طرح یہاں بھی ایک سوسائٹی بنائی تھی۔ لیکن دوسری ریاستوں کی توسیع کی وجہ سے یہاں کی آبادی کم ہو گئی اور سوسائٹی امداد کی کمی کی وجہ سے قائم نہ رہ سکی۔ مسلم آبادی کی ریڑھ کی ہڈی دراصل یورپ سے آئے ہوئے مسلمان ہیں۔ دوسری ریاستوں کی طرح وہ یہاں بھی مسلمانوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں چناں چہ مسجد جو بہت عرصے سے ویران تھی بارونق ہو گئی ہے اور دوسرے مذہبی معاملات میں بھی لوگوں کی دلچسپی ظاہر ہو رہی ہے۔

(۳) وکٹوریا اور تسمانیا ۱۸۵۰ء بلکہ شاید اس سے بھی کچھ قبل سے ہی ان ریاستوں میں مسلمان آباد ہیں لیکن کسی زمانے میں بھی یہاں کسی تنظیم یا مسجد کا ذکر نہیں ملتا۔

ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار سے ریاست وکٹوریا میں مختلف زمانوں میں مسلم آبادی کی تعداد کا اندازہ ہوگا۔

سن :-	۱۸۵۷	۱۸۶۱	۱۸۷۱	۱۸۹۱
تعداد :-	۲۱۶	۱۸۹	۱۲۵	۲۴۱
	۱۹۰۱	۱۹۴۵	1951	
	۴۶۷	۵۷۰	۷۰۲	

وکٹوریا کی تجارتی زندگی میں مسلمانوں کا کافی حصہ ہے۔ بالخصوص جہاز رانی میں تو وہ کافی نمایاں ہیں۔ ملبورن کی بندرگاہ پر پچاس اور سو کے درمیان مسلمان کام کرتے ہیں۔

ملبورن یونیورسٹی میں بہت سے مسلم طلباء اسلامی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں عید الفطر کے موقع پر اڑتیس مسلمان جمع ہوئے تھے۔ یہ جشن ایک طالب علم کی قیام گاہ پر ہوا تھا۔

(۴) نیو ساؤتھ ویلز　اس ریاست میں مسلمانوں کے کئی فرقے آباد ہیں۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز سڈنی ہے۔ ریاست کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے یہاں مختلف ملکوں مثلاً پاکستان، سائپرس، انڈونیشیا، لبنان، ترکی اور البانیہ وغیرہ کے مسلمان جمع ہیں۔ ملبورن کی طرح سڈنی میں بھی کوئی مسجد نہیں ہے۔ اس ریاست میں صرف کانوں کے مرکز بروکن ہل Broken Hill میں مسجد ہے۔ یہ کافی پرانی ہے اور خستہ ہوتی جا رہی ہے۔

سڈنی یونیورسٹی میں بہت سے مسلم طلبا ہیں اور وکٹوریا کی طرح یہاں بھی یہ لوگ اپنی مذہبی روایات پر قائم ہیں۔ بروکن ہل اور لسمور Lismore دونوں جگہ کے مسلمان نسلاً افغانی اور ہندوستانی ہیں۔ بروکن ہل کے مسلم فرقے کے رہنما عبد النزادہ ہیں۔ کافی ضعیف العمر ہیں لیکن اب بھی یہاں کے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔ لس مور میں محمد حسین معلم فرقے کے رہنما ہیں۔

(۵) کوئنز لینڈ　یہ ریاست نیو ساؤتھ ویلز کے شمال میں واقع ہے۔ یہاں کے زیادہ تر مسلمان برسبین (Brisbane) میں رہتے ہیں۔ چند مسلمان تمباکو کی کاشت کے مرکز مریبا (Mareeba) میں رہتے ہیں۔ برسبین میں مسجد بھی ہے جو ۱۹۰۸ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا رقبہ پانچ سو مربع فیٹ ہے۔ بہت پر سکون مقام پر واقع ہے۔ اس ریاست میں مسلمان اس صدی کے شروع میں آئے تھے اور زیادہ تر افغان اور ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے نئی سرزمین کی دریافت اور تجارتی مرکز قائم کرنے میں بہت مدد کی۔ جو مسلمان یہاں آباد ہوئے ان میں سے بیشتر نے گنے اور پھلوں کی کاشت کا کام شروع کیا۔ بہتوں نے خوب دولت کمائی اور اپنے عزیزوں کو بھی لے آئے۔

۱۹۰۲ء میں آسٹریلیا میں ایشیائی لوگوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ لہذا ۱۹۲۴ء تک مسلمانوں کی توسیع عملاً رکی رہی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اجازت ہوئی تو البانیہ کے مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے

کچھ تو مریبا میں تمباکو کی کاشت کے لئے چلے گئے اور کچھ دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ آمد بھی کچھ عرصے کے بعد رک گئی اور چند ہی سالوں میں مسلم فرقہ بھی بے جان سا ہو گیا اس لئے کہ تبلیغ کرنے والوں اور نئے لوگوں کی کمی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مسلمانوں کو جگانے اور ان میں ازسرِ نو اعتقاد پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ بہت وقت اور روپیہ صرف کرنے کے بعد الاظہر سے ایک البانوی امام کو بلایا گیا۔ ان کے آنے کے بعد کوئنز لینڈ کے مسلمانوں میں اسلامی تعلیم اور اسلامی زندگی کا اجیاء ہو رہا ہے اور بہت عرصے کی بے جان زندگی میں جان پڑتی شروع ہوئی ہے۔

برسبین کے مسلمانوں کے رہنما عبدالرحمٰن رانے اور فیض الدین ہیں۔ عبدالرحمٰن صاحب نے اسلامی ادب کی اشاعت کے سلسلے میں قابل ذکر کام کیا ہے۔ خود بہت سی کتابیں لکھیں اور خود ہی شائع بھی کی ہیں۔ فیض الدین صاحب ایک تاجر ہیں۔ مسلمانوں کے لئے بہت کام کرتے ہیں۔ ابھی حال میں جنوبی آسٹریلیا کی مسجد کے اندرونی حصے کے لئے انہوں نے منبر پیش کیا ہے۔

(۶) نیوزی لینڈ | نیوزی لینڈ کے جزائر میں بہت کم مسلمان آباد ہوئے اس کا رقبہ اور سطح آسٹریلیا کی سرزمین سے بہت مختلف ہے۔ یہاں آب و ہوا کا اتنا اختلاف اور بیابان علاقے نہیں ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کا مسئلہ بھی آسٹریلیا کی طرح اتنا اہم نہیں رہا اسی لئے شروع سے یہاں ایشیائی لوگ کم تعداد میں آباد ہوئے۔ آسٹریلیا کی طرح یہاں اسلام کبھی ایک مذہب کی صورت میں نہیں رہا۔ نہ ہی قابل ذکر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ ابتدائی زمانے میں نیوزی لینڈ میں گنے چنے مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے تعداد میں نسبتاً اضافہ ہوا اور ۱۹۵۱ء تک کافی بڑھی۔ ذیل کے اعداد و شمار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

صوبائی مرکز	۱۹۴۵ء	۱۹۵۱ء
آک لینڈ	۴۸ مسلمان	۱۲۳ مسلمان
ہاکس بے	۱ "	۹ "
ٹراناکی	۳ "	۲ "

ولنگٹن	۸ ״	۳۶ ״
نیلسن	۱ ״	- ״
ویسٹ لینڈ	۱ ״	۱ ״
کینٹربری	۲ ״	۲۷ ״
اٹاگو	۱ ״	۶ ״
میزان	۶۷	۲۰۵

آک لینڈ، کینٹربری اور ولنگٹن بڑے شہر اور بندرگاہیں ہیں۔ اور اسلام کے بڑے مرکز بھی بھی ہیں۔ اٹاگو میں نیوزی لینڈ کی یونیورسٹی ہے۔ یہاں چھ مسلمان طالب علم ہیں۔

آسٹریلیا میں اسلام کی موجودہ صورت حال

جنوبی کرۂ ارض میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہی اس فرقے کی توسیع ہوتی رہی لیکن یہ توسیع تعداد کے اعتبار سے اتنی اہم نہیں جتنی اس اعتبار سے کہ مسلمانوں نے آسٹریلیا میں ایک قومی تنوع پیدا کیا۔ شروع کے سالوں میں حکومتِ آسٹریلیا کی پالیسی کی وجہ سے مسلمان فرقے پھل پھول نہ سکے۔ اس لئے کہ نئی تعلیمات، نئے اثرات اور نئے لوگ وہاں نہ آسکے۔ جو پہلے سے آباد تھے ان میں اسلامی شعور اور اثر کم ہوگیا۔ اس صورت حال میں امید افزا رخ صرف ۱۹۲۴ء ہی میں پیدا ہوا جب کہ کچھ البانوی مسلمان آئے اور ان کے علاوہ بھی کچھ اچھے افراد کبھی کبھی آتے رہے اور آسٹریلیا میں مقیم ہوتے رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حکومت کی پالیسی بدلی اور لوگوں کے داخلے پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ یورپ کی تباہ کاریوں سے بہت سے لوگ بے وطن اور بے گھر ہوگئے تھے۔ انھوں نے آسٹریلیا کا رخ کیا ان میں بہت سے مسلمان بھی تھے یورپ کے ہر ملک سے لوگ یہاں پہنچنے لگے۔ آسٹریلیا میں ان کو رہنے کی جگہ بھی مل گئی اور کام بھی! اور اس طرح مسلمانوں کی دوسری لہر آسٹریلیا میں داخل ہوئی اور ابھی تک پھیل رہی ہے۔

آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں ایشیائی طلباء کے لئے تعلیم کی مراعات مہیا کی گئیں اور اب

ہر سال یہاں تعلیم پانے والے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ آسٹریلیا کی تہذیب پر اسلامی تہذیب کے اثرات چھوڑ کر جاتے ہیں اور یہاں مستقل طور سے مقیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں بھی جان پیدا کر جاتے ہیں۔

آئیے اب آخر میں اسلامک سوسائٹی آف ساؤتھ آسٹریلیا کی کمیٹی پر نظر ڈالیں جس سے مختلف تہذیبوں کے ملاپ کا کچھ اندازہ ہوگا جو محض اسلام کی برکت سے پیدا ہوا ہے۔

عہدے	سنہ ۱۹۵۴ کس ملک سے؟	سنہ ۱۹۵۵ کس ملک سے
صدر	پولینڈ	انگلستان
نائب صدر	یوگوسلاویہ	لتھونیا
سکریٹری	انگلستان	البانیہ
خازن	انڈونیشیا	یوگوسلاویہ
امام	یوگوسلاویہ	یوگوسلاویہ
ارکان	ملایا اور جرمنی	جرمنی اور پولینڈ

نقشِ حکمت

جناب احمق پھپھوندوی کے نام سے ہندستان کا تقریباً ہر پڑھا لکھا واقف ہے آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند شعرا میں ہے، آپ کے کلام کا انداز ظرافت، رنگینی اور شوخی کے ساتھ پُر حکمت بھی ہوتا ہے "نقشِ حکمت" احمق صاحب کے کلام کا بہترین مجموعہ ہے۔ مجموعہ کو تین عنوانوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اشارات، عبارات، خطابات، آخر میں منتخب غزلیات کا حصہ ہے۔

صفحات ۲۰۰، قیمت مجلد تین روپے۔

ادبیات

نذرِ عقیدت

مُحسنِ دو عالم حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں

از

جناب روشن صدیقی

ازل، محرابِ ایوانِ محمدؐ ابد، شمعِ شبستانِ محمدؐ
تشکر ہے بہ ہر انداز محدود ہے لا محدود احسانِ محمدؐ
عبودیّت ہو یا ختمِ نبوّت ہر اک عظمت ہے شایانِ محمدؐ
جفا کارانِ مکّہ سرنگوں ہیں ہے عفوِ عام فرمانِ محمدؐ
کوئی بدلہ نہیں ظلم و ستم کا مگر لطفِ فراوانِ محمدؐ
ادھر کانٹے بچھائے جا رہے ہیں ادھر گل ریز دامانِ محمدؐ
پناہیں ڈھونڈتے ہیں دشمنِ جاں پناہِ کُل ہے دامانِ محمدؐ
وہ بدخو، جس سے اپنے بھی ہیں بے زار وہی بدخو ہے مہمانِ محمدؐ
مساکین و یتامیٰ کی یہ قسمت کہ ہیں خاصانِ خاصانِ محمدؐ
جلالِ عظمتِ نوعِ بشر ہیں غلامانِ غلامانِ محمدؐ
بچھائے چشم و دل ارض و سما نے جہاں پہنچا ہے فرمانِ محمدؐ

خراماں زندگی کا کارواں ہے
ردائے صبحِ صادق گل فشاں ہے

*

تری مشکل کشائی کے تصدق ہر اک مشکل کو آساں کر دیا ہے
زہے رحمت کہ فیضانِ نظر نے بہائم کو بھی انساں کر دیا ہے

جو تھے غارت گرِ تہذیب اُن کو
تمدن کا نگہباں کر دیا ہے

حیا و شرم کی پاکیزگی سے
مُزیّن حسنِ ایماں کر دیا ہے

جمالِ زندگی بخشا ہے جس کو
مسیح و خضرِ دوراں کر دیا ہے

فقیروں کو عطا کی بادشاہی
ضعیفوں کو سلیماں کر دیا ہے

جو ذرے پردۂ ظلمت میں گم تھے
انھیں مہرِ درخشاں کر دیا ہے

جنھیں خدام کہتا تھا زمانہ
انھیں مخدومِ دوراں کر دیا ہے

غرورِ خواجگی کا سر جھکا کر
غلاموں کو بھی سلطاں کر دیا ہے

بنا کر بے نیازِ ساز و ساماں
امیرِ ساز و ساماں کر دیا ہے

بنا کر دولت و محنت کو یک دل
بڑی مشکل کو آساں کر دیا ہے

مٹا کر جبرِ اوہامِ کہن کو
اندھیرے میں چراغاں کر دیا ہے

خزاں بنیاد ویرانوں کو تو نے
گلستاں در گلستاں کر دیا ہے

وہ شمعیں آندھیوں میں جل رہی ہیں
جنھیں تو نے فروزاں کر دیا ہے

بڑھا کر احترامِ صنفِ نازک
نگہبانِ دل و جاں کر دیا ہے

سکھا کر شیوۂ تہذیبِ مستور
ادب آموزِ ایماں کر دیا ہے

بشر کو دولتِ اخلاص دے کر
امینِ حسنِ یزداں کر دیا ہے

بہشتِ سرمدی کی راحتوں کو
شریکِ دردِ انساں کر دیا ہے

بنایا ہے اُسے خیرِ مجسّم
جسے تو نے مسلماں کر دیا ہے

متاعِ کُل ہے فیضِ عام تیرا
مرادِ زندگی ہے نام تیرا

تجھے دیکھا تو وجدانِ دلِ یقیں نے
کلامِ خالقِ اکبر کو سمجھا

خلوصِ بندگی کی روشنی میں
جلالِ مسجد و منبر کو سمجھا

ہوئے روشن در و بامِ مدینہ
تو "والصبح اِذا اسفر" کو سمجھا

مسلماں جنّت و کوثر سے بڑھ کر دلِ بیدار و چشمِ تر کو سمجھا

سراپا حسنِ لامحدود ہے تو

حیاتِ عشق کا مقصود ہے تو

٭

وہی چشم و چراغِ زندگی ہے کہ جس کو روشنی تجھ سے ملی ہے

مکمل امتزاجِ دین و دنیا یہ مشکل تجھ سے آساں ہوگئی ہے

حقیقت ماورائے خیر و شر ہے کہ خیر و شر لباسِ آدمی ہے

سراپا درد جس کی زندگی ہو وہ شایانِ حیاتِ سرمدی ہے

محبت، حسنِ خاصانِ خدا کا محبت، جلوۂ پیغمبری ہے

محبت بے غرض سب سے محبت تری تعلیم کا حاصل یہی ہے

جسے پاسِ حقوقِ آدمی ہو وہی راز آشنائے بندگی ہے

جسے قابو رہا دست و زباں پر حضورِ حق مسلماں بھی وہی ہے

نہیں کچھ اسود و احمر پہ موقوف مکرم ہے وہی جو متقی ہے

جسے آرام کی خو ہو وہ محتاج جو ہے دل دادۂ محنت غنی ہے

جسے کہتے ہیں تقدیرِ الٰہی وہی حسنِ عمل کا نام بھی ہے

خدا کا آسرا ایمانِ روشن توکل خلق پر شرکِ جلی ہے

بہت کھوئے گئے راہِ طلب میں فروغِ ترک سے منزل ملی ہے

جسے کوئی تمنا ہو نہ حسرت حریمِ ناز کے قابل وہی ہے

قرارِ جاں ہو ذکر و فکر جس کو وہی درد آشنا مردِ ولی ہے

بہ ہر صورت زمیں کی بادشاہی عبادِ حق کے قدموں پر جھکی ہے

جسے معروف و منکر کا رہا ہوش وہ شایانِ خودی و بیخودی ہے

محبت بے غرض سب سے محبت تری تعلیم کا حاصل یہی ہے

جو تھے غارت گرِ تہذیب اُن کو — تمدن کا نگہباں کر دیا ہے
حیا و شرم کی پاکیزگی سے — مزیّن حسنِ ایماں کر دیا ہے
جمالِ زندگی بخشا ہے جس کو — مسیح و خضرِ دوراں کر دیا ہے
فقیروں کو عطا کی بادشاہی — ضعیفوں کو سلیماں کر دیا ہے
جو ذرے پردۂ ظلمت میں گم تھے — انھیں مہرِ درخشاں کر دیا ہے
جنھیں خدام کہتا تھا زمانہ — انھیں مخدومِ دوراں کر دیا ہے
غرورِ خواجگی کا سر جھکا کر — غلاموں کو بھی سلطاں کر دیا ہے
بنا کر بے نیازِ ساز و ساماں — امیرِ ساز و ساماں کر دیا ہے
بنا کر دولت و محنت کو یک دل — بڑی مشکل کو آساں کر دیا ہے
مٹا کر جبرِ اوہامِ کہن کو — اندھیرے میں چراغاں کر دیا ہے
خزاں بنیاد ویرانوں کو تو نے — گلستاں در گلستاں کر دیا ہے
وہ شمعیں آندھیوں میں جل رہی ہیں — جنھیں تو نے فروزاں کر دیا ہے
بڑھا کر احترامِ صنفِ نازک — نگہبانِ دل و جاں کر دیا ہے
سکھا کر شیوۂ تہذیبِ مستور — ادب آموزِ ایماں کر دیا ہے
بشر کو دولتِ اخلاص دے کر — امینِ حسنِ یزداں کر دیا ہے
بہشتِ سرمدی کی راحتوں کو — شریکِ دردِ انساں کر دیا ہے
بنایا ہے اُسے خیرِ مجسّم — جسے تو نے مسلماں کر دیا ہے

متاعِ کُل ہے فیضِ عام تیرا
مرادِ زندگی ہے نام تیرا

تجھے دیکھا تو وجدانِ دلِ یقیں نے — کلامِ خالقِ اکبر کو سمجھا
خلوصِ بندگی کی روشنی میں — جلالِ مسجد و منبر کو سمجھا
ہوئے روشن در و بامِ مدینہ — تو "والصبح اذا اسفر" کو سمجھا

مسلماں جنّت و کوثر سے بڑھ کر دلِ بیدار و چشمِ تر کو سمجھا

سراپا حسنِ لامحدود ہے تو
حیاتِ عشق کا مقصود ہے تو

*

وہی چشم و چراغِ زندگی ہے کہ جس کو روشنی تجھ سے ملی ہے
مکمل امتزاجِ دین و دنیا یہ مشکل تجھ سے آساں ہوگئی ہے
حقیقت ماورائے خیر و شر ہے کہ خیر و شر لباسِ آدمی ہے
سراپا درد جس کی زندگی ہو وہ شایانِ حیاتِ سرمدی ہے
محبت، حسنِ خاصانِ خدا کا محبت، جلوۂ پیغمبری ہے
محبت بے غرض سب سے محبت تری تعلیم کا حاصل یہی ہے
جسے پاسِ حقوقِ آدمی ہو وہی رازِ آشنائے بندگی ہے
جسے قابو رہا دست و زباں پر حضورِ حق مسلماں بھی وہی ہے
نہیں کچھ اسود و احمر پہ موقوف مکرم ہے وہی جو متقی ہے
جسے آرام کی خو ہو وہ محتاج جو ہے دل دادۂ محنت غنی ہے
جسے کہتے ہیں تقدیرِ الٰہی وہی حسنِ عمل کا نام بھی ہے
خدا کا آسرا ایمانِ روشن توکل خلق پر شرکِ جلی ہے
بہت کھوئے گئے راہِ طلب میں فروغِ ترک سے منزل ملی ہے
جسے کوئی تمنا ہو نہ حسرت حریمِ ناز کے قابل وہی ہے
قرارِ جاں ہو ذکر و فکر جس کو وہی دردآشنا مردِ ولی ہے
بہ ہر صورت زمیں کی بادشاہی عبادِ حق کے قدموں پر جھکی ہے
جسے معروف و منکر کا رہا ہوش وہ شایانِ خودی و بیخودی ہے
محبت بے غرض سب سے محبت تری تعلیم کا حاصل یہی ہے

خراجِ عقیدت

"شہدائے بالاکوٹ کے حضور میں"

از

(جناب فانی مراد آبادی - لائل پور)

"شہدائے بالاکوٹ کا سانحۂ دل فگار مئی ۱۸۳۱ء میں پیش آیا تھا اسی مناسبت سے یہ نظم مئی کی اشاعت میں شامل کی جا رہی ہے۔ (برہان)

کس لیۓ پیہم زباں نے نطق کے بوسے لئے — نام کن کن ہستیوں کے آج یہ میں نے لئے

شاہ اسمٰعیل و سیّد احمدِ آزاد خو — جن کی آوازوں نے گرمایا مسلماں کا لہو

دونوں آزادی کا جوشِ بے کراں لے کر اُٹھے — ہمتوں کے سائے میں عزمِ جواں لے کر اُٹھے

ایک کی تحریک تھی در پردہ عینِ مصلحت — دوسرے کے ہاتھ میں شمشیر بہرِ عافیت

یعنی اسمٰعیل نے چوما لبِ شمشیر کو — غیظ میں آواز دی ہر حلقۂ زنجیر کو

برق کی حدّت سمو کر روح کو گرما دیا — موجۂ ساکت کو طوفاں کا سبق سکھلا دیا

دل میں تبلیغ و تکلم سے بھرا ایماں کا نور — مومنوں پر چھا گیا ذوقِ شہادت کا سرور

اک جماعت کو بنا کر ہم نوایانِ جہاد — ارضِ بالاکوٹ پہنچے یہ فدایانِ جہاد

وہ دہاتے توپ کے اُگلے ہوئے شعلوں کا زور — سنسناتی گونجتی وہ گولیوں کا زور و شور

اک طرف جامِ شہادت کے لئے بیتابیٔ ذوق — فی سبیل اللہ کٹ جانے کا دل میں عزم و شوق

دوسری جانب مگر "وہ" کافروں کے ساتھ ساتھ — ہائے اپنے بھائیوں کی سازشوں کا خونی ہاتھ

جو ہیں تاریخ "ہزارہ" کے لئے مکروہ باب — پڑ گیا تھا جن کی آنکھوں پر وہ غفلت کا نقاب

ایک ہی تسبیح کے دانے بکھر کر رہ گئے — ہائے اپنے کفر کی موجوں میں پھنس کر بہہ گئے

ہو گئے صدہا مجاہد راہِ مولا میں شہید — اہلِ ایماں پا گئے اپنے مقاماتِ سعید

غنچۂ باغِ ولی - وہ حاصلِ بزمِ غنی — شاہ اسمٰعیل "بالاکوٹ" کے مردِ جری

لڑتے لڑتے موت کی آغوش میں وہ سو گئے — دین کی خاطر لڑے - اور دیں کو پیارے ہو گئے

تبصرے

جماعتِ مجاہدین تقطیع کلاں ضخامت ۴۳۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سات روپے۔ پتہ:- کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔ جناب غلام رسول صاحب مہر نے حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی کے حالات و سوانح اور آپ کی تحریک پر جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی یہ تیسری جلد ہے، اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں تحریک کا اصل مقصد اور جماعتِ مجاہدین کی تنظیم و ترتیب کے متعلق مفصل معلومات ہیں جو فاضل مصنف نے ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے بعد خوش اسلوبی سے یکجا کر دی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ حضرت سید احمد شہید کی تحریک کیسی منظم۔ مرتب اور باقاعدہ و باضابطہ تھی۔ حصہ دوم میں حضرت کے ان مجاہدوں اور رفیقوں کے حالات و سوانح ہیں جو آپ کی زندگی ہی میں جان بحق ہو گئے یا جنھوں نے حضرت شہید کے بعد مجاہدانہ سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا، یا جنھیں خود سید صاحب نے دعوت و تبلیغ پر متعین کر دیا تھا، اور وہ انھیں مشاغل میں عمر بھر لگے رہے۔ اس سلسلہ میں پچاس حضرات کے حالات و سوانح مستقل ابواب کے ماتحت مفصل اور باقی اور چند حضرات کے مجملاً بیان کیے گئے ہیں۔ یہ معلومات اردو زبان میں یکجا طور پر پہلی مرتبہ منصۂ ظہور پر آئے ہیں۔ اور ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شہید نے جو جماعت تیار کی تھی وہ کیسے کیسے اہل اللہ، صاحبانِ باطن اور فدا کارانِ اسلام پر مشتمل تھی۔ امید ہے کہ سلسلہ کی پہلی دو کتابوں کی طرح یہ تیسری کتاب بھی عوام و خواص میں مقبول ہوگی۔ سنجیدہ و متین۔ اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان کے لئے خود لائق مصنف کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے۔

کتاب الآثار لامام محمد مترجم اردو از مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب۔ تقطیع کلاں ضخامت ۳۳۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپئے۔ پتہ: محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب۔ قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

امام ابوحنیفہ کے مشہور تلمیذ امام محمد بن حسن الشیبانی کی حدیث میں دو کتابیں مشہور ہیں ایک موطا امام محمد جس کے اردو ترجمہ پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے اور دوسری کتاب الآثار جس میں فقہی احکام و مسائل کے متعلق صحابہ کرام اور فقہ کے ائمہ عظام کے اقوال درج ہیں اس میں امام عالی مقام نے کم و بیش نو سو آثار جمع کئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کا مع متن کے اردو ترجمہ ہے جو صاف وسلیس اور عام فہم زبان میں کیا گیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ کہیں کہیں مختصر نوٹ بھی ہیں جو بہر حال افادیت سے خالی نہیں۔ شروع میں مولانا عبد الرشید نعمانی کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن علما اور طلباء کے لئے بڑے کام کا ہے اس میں امام محمد کے فضائل و مناقب بیان کرنے کے بعد کتاب کی اہمیت اور اس کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے کتاب بجائے خود بہت اہم ہے۔ اردو ترجمہ کی وجہ سے اب اُس سے عربی نہ جاننے والے ارباب ذوق بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تفسیر ماجدی جلد سوم | از مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی تقطیع کلاں ضخامت ڈیڑھ سو صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت درج نہیں پتہ:۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور۔

یہ مولانا کی اس مشہور اردو تفسیر و ترجمہ کی تیسری جلد ہے جو تاج کمپنی کی طرف سے اس کے روایتی اہتمام و انتظام کے ساتھ جزاً جزاً شائع ہو رہی ہے۔ یہ جلد سورۂ یونس سے لے کر سورۂ النحل تک چار پاروں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی مولانا کی تفسیری خصوصیات یعنی قدیم کتب تفسیر و لغت کے حوالے۔ آیت کا حاصل اور اصل مقصد۔ لطیف طریقہ پر فرق باطلہ کے اعتراضات کا جواب اور اُن کے عقائد کی تردید۔ بعض مطالب قرآن کی تشریح و توضیح حسب ضرورت علوم جدیدہ و افکار جدیدہ کی روشنی میں صاف وسلیس اور شگفتہ و دل نشین طرز بیان یہ سب چیزیں اس جلد میں بھی پورے طور پر نمایاں ہیں۔ امید ہے اہل ذوق اس کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

بُرہان

جلد ۳۸ شمارہ ۶

جون ۱۹۵۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پنجاب زندہ دلی کے لئے ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مرتبہ گذشتہ عید کے موقع پر لاہور کے بعض منچلوں کو کیا سوجھی؟ عید کی نماز ہی اردو میں پڑھ ڈالی۔ اِس فعل کے جواز کے لئے ان لوگوں کے دلائل سے قطع نظر سب سے پہلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اسلام کسی خاص ایک قوم ملک اور زبان کا مذہب نہیں اُس کے حلقۂ اطاعت میں تو دنیا کی ہر قوم ہر زبان اور ہر ملک کا آدمی داخل ہے۔ تو پھر کیا اسلام کی پوری تاریخ میں کہیں کسی جگہ چھوٹی بڑی کوئی ایک ایسی مثال موجود ہے کہ کسی مقام کے زیادہ نہیں دو چار مسلمانوں نے بھی نماز اپنی مادری زبان میں ادا کی ہو!

ہاں ایک اتاترک کی ضرور ہے جس نے سب کچھ ترکی زبان میں کر دیا تھا۔ اب ان زندہ دلان پنجاب کو صاف لفظوں میں اقرار کرنا چاہیئے کہ ان کے نزدیک کمال اتاترک سب سے بڑا اسلام کا مجتہد تھا اور اس لئے پونے چودہ سو سال کی مدت میں جمہور مسلمین کا عمل کچھ بھی رہا ہو انھیں اس سے کوئی بحث اور کوئی سروکار نہیں اُن کا قبلۂ اعظم اور امام اکبر تو اتاترک ہے۔ اگر ہمارے یہ بھائی جدت کے ساتھ اس اظہار کی یہ جرأت بھی دکھاتے تو اس سے بہت سی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں۔

ان حضرات کے امام نے اُردو میں نماز کے جواز کے لئے استدلال جو کیا ہے وہ اتاترک سے نہیں بلکہ امام اعظم ابو حنیفہ سے۔ در حقیقت یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس میں یہ حضرات نادانستہ یا دانستہ طور پر مبتلا ہو گئے ہیں فقہ کی بعض کتابوں میں امام اعظم کی طرف یہ جملہ ضرور منسوب ہے "القراءۃ بالفارسیۃ جائزۃ" لیکن اول تو محققین نے امام صاحب کی طرف اس کے انتساب پر ہی کلام کیا ہے اور اگر بالفرض انتساب صحیح بھی ہو تو یہ ثابت ہے کہ امام صاحب نے بعد میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔ پس اگر امام صاحب کی طرف مذکورہ بالا جملہ کی روایت پر بلا کسی قسم کے ردّ و کد کے اعتبار کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں اس قول سے امام صاحب کے رجوع کی روایات پر اعتماد نہ

نہ کیا جائے ۔

رہی یہ بات کہ اچھا رجوع مُسلّم ! لیکن آخر امام اعظم کی زبان سے ایسی بات نکلی کیوں کر ! ایک وہ چیز جو قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہو اس کا امام ابو حنیفہ جیسی عظیم المرتبت شخصیت کی زبان سے اس کا صدور ہی کیوں کر ہو سکتا ہے ؟ تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں کثرت سے عجمی قومیں اسلام قبول کر رہی تھیں اس بنا پر وقت کا ایک اہم سوال یہ تھا کہ آج ایک غیر عرب مسلمان ہوتا ہے اور مسلمان ہوتے ہی اس پر نماز فرض ہو جاتی ہے ۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ یہ شخص عربی زبان اور اس کے الفاظ اور اس کے لب و لہجہ سے بالکل ناآشنا ہے عربی الفاظ کا تلفظ کرتا ہے تو وہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے معانی و مطالب میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے ۔ اب اگر ایسے شخص کو عربی زبان میں ہی قرأت کرنے پر مجبور کیا جائے تو لازماً نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غلط سلط قرأت کرے گا اور اس کی وجہ سے بجائے ثواب کے عذاب اس کے سر پڑے گا اس سے بچنے کے لئے یہ کہہ نہیں سکتے کہ وہ سرے سے نماز ہی نہ پڑھے ۔ کیوں کہ نماز تو اسلام قبول کرتے ہی اس پر فرض ہو گئی ہے اس بنا پر بحکم اذا ابتلی المحل کم ببلیتین فلیختر هو نهما اس پیچیدہ صورتِ حال کا حل امام صاحب کو یہ ہی معلوم ہوا کہ جب تک یہ نو مسلم عربی الفاظ کا صحیح تلفظ کرنے کے قابل ہو اُس کو فارسی میں قرارت کرنے کی اجازت دے دی جائے ۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بالفرض امام صاحب کا اس قول سے رجوع نہ بھی ثابت ہو تب بھی امام صاحب کا یہ قول زندہ دلان پنجاب کے لئے سند نہیں بن سکتا ۔ کیوں کہ آج کوئی مسلمان نہیں جو قرآن کی قرارت کر سکتا ہو اور جو عربی الفاظ کے تلفظ پر بالکل قادر نہ ہو ۔ ہر مسلمان کو بچپن میں ہی دو ایک سورتیں یاد کرا کر ان کی مشق کرا لی جاتی ہے ۔

ہمارے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کے لئے اعجاب کل ذی رائے برایہ سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہے ۔ احادیث میں اس کو علامات قیامت میں شمار کیا گیا ہے ۔ ایمانداری اور

راست بازی کی سیدھی بات یہ ہے کہ اب تک پوری امت کا جو تعامل اور جس پر اس کا اجماع رہا ہے اس کو جوں کا توں باقی رکھا جائے۔ ورنہ فرض کیجیے ایک جماعت میں مختلف پچاس زبانیں رکھنے والے مسلمان شریک ہیں تو اب امام کس زبان میں قرآن کا ترجمہ سنائے؟ اور اگر سب زبانوں میں ترجمہ کرے تو کیوں کر؟

ہنگامہ ۱۸۵۷ء جس کو کانگریس کی تحریک آزادی کے زمانہ میں "پہلی جنگ آزادی" کا لقب دے دیا گیا تھا اس کی یادگار میں ۱۰ رمئی ۱۹۵۷ء کو حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی طرف سے بحرف انگریزی ایک بڑی اچھی اور ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے مصنف ملک کے مشہور مورخ ڈاکٹر سریندرا ناتھ سین ہیں اور اس کا پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے۔ کتاب اور پیش لفظ دونوں معلومات اور بصیرت افروز ہیں۔ اس سو سال کی مدت میں اس موضوع پر ایسی بے لاگ۔ جامع اور محققانہ کتاب کوئی شائع نہیں ہوئی۔

مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کو اگرچہ آج کل کی اصطلاح کے مطابق ایک منظم قومی تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ پالیسی اور غاصبانہ طرز عمل کی وجہ سے ملک میں ایک عام بے چینی پہلے سے موجود تھی۔ پھر آخر زمانہ میں کمپنی نے دو کام ایسے کیے جن کی وجہ سے دلوں میں مدت کی دبی ہوئی چنگاریاں یک بیک بھڑک اٹھیں اور انگریزوں کے خلاف نفرت اور ملک کو ان سے آزاد کرانے کا طوفان امنڈ پڑا اس وقت انگریزوں کے خلاف جو محاذ تھا وہ بالکل قومی تھا یعنی ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے برابر کے شریک تھے۔ کہیں کسی جگہ کسی امر میں ہندو مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور سب کا مقصد بہادر شاہ ظفر کی صورت میں مغلیہ سلطنت کا دوبارہ قائم کرنا تھا جس کی عظمت اس ملک کے ہر شخص کے دل میں بلا اختلاف مذہب و ملت تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ جو لوگ اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے ان کے باہمی اختلافات خود غرضیوں اور کوتاہ اندیشیوں کی وجہ سے یہ تحریک ناکامیاب رہی۔ بہرحال کتاب ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(استاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

(۲)

۳- خالد بن ولید کے نام

حضرت ابوبکرؓ نے ذو القصہ میں جب گیارہ محاذ بنائے تو پہلا اور اہم ترین محاذ طلیحہ اور اُس کے حلیفوں کے خلاف تھا، اس محاذ کا سالار خالد بن ولید کو مقرر کیا گیا۔ اِن کو حکم تھا کہ پہلے طیؔ، پھر حلفائے طلیحہ اور آخر میں بُطاح جا کر طلیحہ کو مسلمان بنائیں، پھر مالک بن نویرہ کو راہِ راست پر لائیں اور جن جن قبائل میں مسلمانوں کو جلایا یا قتل کیا گیا تھا اِن سے قاتلین کو طلب کر کے موت کی سزا دیں۔ اِس وقت طلیحہ اپنے علاقہ کے بُزاخہ نامی تالاب پر خیمہ زن تھا کئی طاقتور قبیلے۔ غطفان، طیؔ، فزارہ، جدیلہ، عبس و ذُبیان اس کے ساتھ تھے، حسبِ حکمِ خلیفہ خالد فوج لے کر طیؔ کی طرف نکلے، جن کے گاؤں مدینہ کے شمال مغرب میں پچاس میل دور دو[۲] پہاڑوں کے وسط میں آباد تھے۔ حاتم طائی کا لڑکا عدی مخلص مسلمان، بیدار ہوش انسان اور اپنے قبیلہ کا بارسوخ سردار تھا، اس نے اس دانائی سے کام کیا کہ قبیلہ طیؔ طلیحہ کے حلف سے نکل آیا، اور ایک دوسرا طاقتور قبیلہ جدیلہ ہزار سواروں کے ساتھ طلیحہ سے الگ ہو گیا۔ طلیحہ اپنے قبیلہ بنو اسد اور اپنے حلفاء عبس، ذبیان اور غطفان کے ساتھ بزاخہ میں رہ گیا، پھر بھی اس کے اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند تھے، مسلم و مرتد

صف آرا ہوئے، سخت رن پڑا، طلیحہ شکست کھا کر شام بھاگ گیا، اس کے حلیف قبیلے چار و ناچار مسلمان ہو گئے، خالد نے اس وقت تک ان کا اسلام قبول نہ کیا جب تک انھوں نے اپنے اپنے قبیلوں کے وہ لوگ اس کے حوالہ نہ کر دیئے جنھوں نے مسلمانوں کو جلایا یا قتل کیا تھا، ان کو بڑے عبرتناک طریقہ سے ہلاک کیا گیا۔ اپنی فتح، مرتد قبائل کے اسلام اور قاتلین کے قصاص کی اطلاع خالد نے خلیفہ کو دی تو یہ خط موصول ہوا:

"یہ کامیابیاں خدا کرے مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوں۔ اپنے سارے کاموں میں خدا سے ڈرتے رہو، خدا ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے، جو اس سے ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں (ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون قرآن) اسلام کی سربلندی اور ارتداد کے قلع قمع میں پوری تن دہی سے کام لو، ذرا بھی تساہل نہ ہونے پائے، جس شخص نے کسی مسلمان کو مارا ہو اور وہ تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اس کو ضرور قتل کر دو، اور اس طرح قتل کرو کہ دوسرے عبرت پکڑیں۔ وہ لوگ جنھوں نے خدا کے حکم سے سرتابی کی ہو اور اسلام کے دشمن ہوں، ان کے قتل سے اگر اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو تو قتل کر سکتے ہو۔" سیف بن عمر۔ طبری ۲/۲۳۳

الکتفار (مخطوط) میں شریک فزاری کی سند پر جو خط بیان ہوا ہے وہ سیف بن عمر کے مذکورہ بالا مراسلہ سے لفظاً و معنیً ہر دو اعتبار سے مختلف ہے، لفظی اختلاف تو زیادہ در خور اعتنا نہیں پر دونوں کا معنوی اختلاف بہت اہم ہے۔ سیف بن عمر کی رائے میں خالد کو خلیفہ نے دو بڑے کام سونپے تھے، ایک طلیحہ اور اس کے حلیفوں کو ترکِ ارتداد کی دعوت دینا اور اگر نہ مانیں تو ان سے لڑنا، اور دوسرا ان مسلمانوں کا بدلہ لینا جن کو طلیحہ کے دوست اور متحالف قبیلوں میں بڑی بے دردی سے قتل کرایا گیا تھا، ان دونوں کاموں کی انجام دہی کے بعد ان کو حکم تھا کہ نئی ہدایات کا انتظار کریں، سیف نے دوسرے شیوخ سے ایک

اور روایت بیان کی ہے جس کی رو سے خالد کے ذمہ تیسرا کام بُطاح جاکر بنو حنظلہ (تمیم کی ایک شاخ) کے سردار مالک بن نویرہ کی خبر لینا تھا، مالک نے زکاۃ نہیں ادا کی تھی اور اسلام سے ان کی وفاداری مشتبہ ہو گئی تھی۔ کتاب الاکتفاء میں فتح بزاخہ سے متعلق خلیفہ اول کا جو خط بیان ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طُلیحہ سے فارغ ہونے کے بعد خالد کو یمامہ جانے اور مُسیلمہ سے لڑنے کا حکم تھا۔ سیف کی رائے میں یمامہ کی مہم خالد کو نہیں بلکہ ایک دوسرے سردار عکرمہ بن ابی جہل کے سپرد کی گئی تھی۔

"واضح ہو کہ تمہارا ایلچی تمہارا خط لے کر آیا، جس میں تم نے بُزاخہ میں خدا کی عنایت کردہ فتح اور اَسد و غطفان کی گوشمالی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اب تم یمامہ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہو جیسا کہ میں نے تم کو ہدایت کی ہے، اللہ وحدہ لا شریک لہ سے ڈرتے رہو، اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ باپ کی طرح لطف و شفقت سے پیش آؤ۔ خالد بن ولید! بنو مغیرہ کی تمکنت سے بچتے رہنا، میں نے تمہیں سالار بنا کر اس شخص کی بات ٹال دی ہے جس کی بات کبھی نہیں ٹالی (یعنی عمر بن خطاب) جب بنو حنیفہ کے پاس پہنچو تو خوب تدبر سے کام لینا، تم اب تک ان جیسے دشمن سے مقابل نہیں ہوئے ہو، کیوں کہ ان کا کل قبیلہ اول سے آخر تک تمہارے خلاف ہے، اور ان کا علاقہ بھی بہت بڑا ہے۔ جب تم وہاں پہنچو تو سارے معاملات کا انتظام خود کرنا، اپنے میمنہ، میسرہ اور رسالوں پر مخلص افسر مقرر کرنا، رسول اللہ کے ممتاز صحابہ سے مشورہ کرنا، اور ان کے احترام و منزلت کا پورا لحاظ رکھنا، جب بنو حنیفہ صفیں درست کرکے لڑنے کے لئے آمادہ ہوں تو جیسے وہ لڑیں اسی طرح تم لڑنا: اگر وہ تیر چلائیں تو تم بھی تیر چلانا، اگر وہ نیزہ بازی کریں تو تم بھی نیزہ بازی کرنا، اور جب وہ تلوار سے لڑیں

جس کے معنی یقینی موت ہے تو تم بھی تلوار سے لڑنا، اگر خدا تمھیں فتح عطا کرے، تو خبردار ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہ کرنا، ان کے زخمیوں کا کام تمام کرنا، ان میں جو بھاگ جائیں ان کا تعاقب کرنا، اور جو تمھارے ہاتھ آجائیں ان کو تلوار کے گھاٹ اتارنا اور آگ میں جلا دینا۔ میری ان ہدایات کی خلاف ورزی نہ ہو، والسلام علیک " اکتفا صفحہ ۲۵۲

۴۔ عکرمہ بن ابی جہل کے نام

طلیحہ کے بعد دوسرا اہم دشمن مسیلمہ تھا، جس کی نبوت کا سارے یمامہ میں ڈنکا بج رہا تھا، بنو حنیفہ کے دس ہزار بہادر جوان (بقول سیف چالیس ہزار) اس کے لئے خون بہانے کو تیار تھے۔ مسیلمہ نے بڑی خوش اسلوبی سے فوج کی تنظیم کی تھی، اور صرف کثیر سے اس کو مسلح کیا تھا، بنو حنیفہ میں اس کو بہت مقبولیت حاصل تھی، وہ کہتے: ہم قریش کا نبی کیوں مانیں، ہم اپنا نبی مانیں گے۔ حضرت ابو بکر نے اس کی سرکوبی کے لئے عکرمہ بن ابی جہل کو مامور کیا، عکرمہ یمامہ پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ خلیفہ نے ان کی تقویت کے لئے ایک دوسری فوج شرحبیل بن حسنہ کی قیادت میں بھیجی ہے جو عن قریب آملے گی۔ عکرمہ کی تمکنت کو یہ بات کھٹکی، وہ چاہتے تھے مسیلمہ کی تباہی کا سہرہ بلا شرکت غیراں کے سر بندھے، اس لئے انھوں نے شرحبیل کے آنے سے پہلے حملہ کر دیا، مسیلمہ کے جانبازوں نے مسلمانوں کی صفیں الٹ دیں، عکرمہ شکست فاش کھا کر بھاگ پڑے۔ ابو بکر کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو ان کو سخت غصہ آیا، اور انھوں نے عکرمہ کو یہ پر عتاب خط لکھا:۔

" مادر عکرمہ کے فرزند! (اس شکست کے بعد) میں ہرگز تمھاری صورت نہیں دیکھوں گا اور نہ تم میری دیکھو گے، یہاں لوٹ کر مت آنا، ورنہ لوگوں کے حوصلے پست ہوں گے، سیدھے حذیفہ اور عرفجہ کے پاس چلے جاؤ

اور ان کے ساتھ شریک ہو کر عمان اور مہرہ کے مرتد عربوں سے لڑو، اگر وہ جنگ میں مشغول ہو چکے ہوں تو تم آگے بڑھ جانا اور جن جن قبیلوں سے گذرو ان کو ارتداد سے توبہ کرا کے دائرہ اسلام میں داخل کرتے جانا حتیٰ کہ تم اور مہاجر بن اُمیہ یمن اور حضرموت میں ایک دوسرے سے مل جاؤ" سیف بن عمر۔ طبری ۳/ ۲۴۳، سیف بن عمر نے یہ خط کچھ مختلف الفاظ میں بعض دوسرے شیوخِ تاریخ کی سند پر ارتداد عمان، مہرہ اور یمن کے ضمن میں بھی بیان کیا ہے، دیکھئے طبری ۳/ ۲۶۲

دوسرا نسخہ:۔

"اُستادی جانتے نہیں شاگردی سے گھبراتے ہو، جس دن مجھے ملوگے دیکھو کیسا مزا چکھاتا ہوں، تم اس وقت تک کیوں نہ ٹھہرے کہ شرحبیل آجاتے اور ان کی مدد اور تعاون سے جنگ کرتے، اب حذیفہ کے پاس جاؤ اور ان کو مدد پہنچاؤ، اگر ان کو تمہاری پُشت پناہی کی ضرورت نہ ہو، تو یمن اور حضرموت چلے جاؤ اور مہاجر بن اُمیہ کی مدد کرو" ناسخ التواریخ محمد تقی، مطبوع بمبئی، ۲/ ۸۷۔

۵۔ خالد بن ولید کے نام

ربیع الاول ۱۲ھ میں یمامہ کی مشہور جنگ ہوئی جو ردہ ہی کی سب سے بڑی جنگ نہ تھی بلکہ اس کو اگر جزیرہ نمائے عرب کی سب سے سخت جنگ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا مسیلمہ کی فوج دس ہزار تھی اور مسلمانوں کی چھ سات ہزار اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فریقین کے پاس چالیس چالیس ہزار یا اس کے لگ بھگ سپاہی تھے مسیلمہ کے جاں باز ایک مثالی لگن اور جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف خالد کی فوج کا ایک بڑا حصہ ان عربوں پر مشتمل تھا جو

وقتی مصلحت یا رزق کی خاطر بھرتی ہو گئے تھے۔ جنگ ہوئی تو مسلمان تین بار پسپا ہوئے، مُسیلمہ کی فوج ان کے کیمپ میں گھس پڑی، قریب تھا کہ مسلمانوں کو مکمل شکست ہو، کہ مدینہ کے انصار اور مہاجر موت کو لبیک کہتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے، ان کو دیکھ کر بہت سے بھاگے ہوئے بدو بھی لوٹ آئے، قتل کا بازار گرم ہوا، مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہو گیا، وہ برابر دشمن کو دباتے رہے حتیٰ کہ وہ ہٹتے ہٹتے اپنے ایک باغ کی چہار دیواری میں پناہ گیر ہوا، یہاں پھر ایک خوں ریز معرکہ ہوا، جس میں مُسیلمہ اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ ایک راوی نے جنگ کی جھلکی ان الفاظ میں پیش کی ہے:- بنو حنیفہ سے مسلمانوں کو جتنی سخت زک پہنچی کسی دوسرے دشمن سے نہ پہنچی تھی، وہ تو ان کے لئے زہریلی موت لے کر آئے اور ایسی تلواریں جن کو تیر اور نیزوں سے پہلے انھوں نے سونت لیا تھا، مسلمانوں نے صبر و تحمل سے مقابلہ کیا، لیکن مقابلہ کا دار و مدار اس دن پرانے اور آزمودہ کار مسلمانوں (انصار و مہاجر) پر تھا۔ اُس دن عبّاد بن بشر خارشی چیتے کی طرح بپھرے پھرتے اور للکار کر کہتے: "ہے کوئی جو مجھ سے ٹکر لے"۔ ان کے سامنے ایک جوشیلا حنفی جوان چنگھاڑتے اونٹ کی طرح آتا اور کہتا: آجا خزرجی، تو سمجھتا ہو گا ہم بھی اُن کی طرح بزدل ہیں جن سے پہلے تیرا سابقہ پڑا ہے"۔ عبّاد اس کی طرف بڑھتے، حنفی سبقت کر کے حملہ کر دیتا، اور تلوار کا وار کرتا جس سے خود اُسی کی تلوار ٹوٹ جاتی، اور عبّاد کو کوئی گزند نہ پہنچتا، پھر عبّاد تلوار کا وار کرتے اور حنفی کے پیر کاٹ کر آگے بڑھ جاتے۔ حنفی سخت مشکل سے گھٹنوں پر کھڑا ہوتا اور آواز دیتا: شریف زادے میرا خاتمہ کرتے جاؤ"۔ عبّاد لوٹتے اور اس کی گردن مار دیتے۔ پھر دوسرا حنفی مرنے والے کی جگہ لے لیتا، وہ اور عبّاد گھوم پھر کر ایک دوسرے پر وار کرتے عباد کا جسم پہلے سے زخموں سے چور ہوتا عباد (اس کے شانہ پر) ایسا سخت وار کرتے کہ اس کا پھیپھڑا نظر آنے لگتا، اور کہتے: "لے میرا یہ وار، میں ہوں ابن قَیش!"، پھر وہ حنفیوں کو زخمی کرتے آگے بڑھتے چلے جاتے"۔ (ضمرہ بن سعید مازنی۔ الکتفا رص۲۵۵ ب)

اب سُنیئے خالد بن ولید کی بجائے ایک دوسرے راوی کی زبانی: میں بیس معرکوں میں شریک ہوا، لیکن بنو حنیفہ نے جیسی کی [illegible]

میں جس صبر سے تلوار کے وار سہے، اور جس مہارت سے تلوار کے جوہر دکھائے، اور جس پامردی سے وہ میدان میں ڈٹے رہے، اس کی مثال کہیں نہیں دیکھی۔" (اکتفاء صـ۲۵۷)

بارہ سو سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے اور کئی ہزار زخمی۔ ایک شخص نے جو جنگ میں شریک تھا بیان کیا کہ زخمیوں کی اتنی کثرت تھی کہ نماز با جماعت میں خالد کے ساتھ معدودے چند مہاجر اور انصار ہوتے تھے۔ (اکتفاء صـ۲۵۲)

یمامہ کے قریب پہنچ کر خالد نے ایک طلیعہ گرد و پیش کے حالات معلوم کرنے فوج سے آگے بھیج دیا تھا، اس وقت یمامہ کا ایک معزز سردار مُجّاعہ بن مُرارہ تیئیس[۲۳] آدمیوں کے ساتھ ایک مہم سے فارغ ہو کر وطن (یمامہ) واپس آرہا تھا۔ طلیعہ نے ان لوگوں کو گرفتار کرلیا اور اور خالد کے پاس لائے، مُجّاعہ نے کہا ہم نہ تو مسلمانوں کے دشمن ہیں، نہ حنفیوں کے جاسوس، ہم اپنے قبیلہ کے ایک مقتول کا قصاص لینے گئے تھے، میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو چکا ہوں اور اسلام پر قائم ہوں۔" خالد نے مُجّاعہ کے ساتھیوں سے مُسیلمہ کے بارے میں رائے لی تو انھوں نے کہا وہ خدا کا رسول ہے۔ خالد نے اُن سب کو قتل کرادیا کسی نے سفارش کی کہ مُجّاعہ کو زندہ رکھیے، وہ بنو حنیفہ کا لیڈر رہے، آپ کی لڑائی اور صلح دونوں میں اس سے قیمتی مدد مل سکتی ہے۔ خالد نے مُجّاعہ کے بیڑیاں ڈلوادیں۔ جلد ہی خالد کو اس کے اخلاص اور دانائی کا معترف ہونا پڑا، مُجّاعہ، خالد کا مُشیر اور مقرب بن گیا۔ مُجّاعہ کے ایک لڑکی تھی جس کے جمال کی سارے یمامہ میں دھوم تھی۔ خالد اُس پر ریجھے ہوئے تھے۔ جنگ سے فارغ ہو کر انھوں نے مُجّاعہ کو شادی کا پیغام دے دیا۔ مُجّاعہ نے پیغام تو قبول کرلیا لیکن کہا: کچھ دن ٹھہر جاؤ، جنگ کے زخم مندمل ہو جائیں اور ماتم کی صفیں اُٹھ جائیں۔ اس کو اندیشہ تھا کہ اگر اس قدر جلد شادی کردی گئی تو خلیفہ اور مسلمان دونوں کو یہ بات کھٹکے گی۔ پر خالد نہ مانے۔ شادی ہو گئی، پہلے تو خالد کی فوج کے مہاجر و انصار نے جو اپنے پیاروں کی موت پر سوگوار بیٹھے تھے، اور جن کے کیمپ میں ہزاروں زخمی درد سے کراہ رہے تھے، شادی کو ناپسند کیا اور پھر اس کی شکایت خلیفہ کو بھی پہنچادی۔

ابوبکر آزردہ ہوئے، اور عمر بن خطاب نے خالد کی نفس کوشی اور بے اعتدالی پر روشنی ڈال کر ان کی طبیعت کو اور زیادہ مکدر کر دیا۔ پھر بھی ان کا عقلی توازن نہ بگڑا، انھوں نے کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی، بلکہ اس سرزنش پر اکتفاء کیا:-

"مادرِ خالد کے فرزند! تم بڑے بے صبرے ہو۔ عورتوں سے شادی رچاتے ہو اور لطف اندوز ہوتے ہو، حالانکہ تمھارے دروازہ پر بارہ سو مسلمانوں کا خون خشک بھی نہیں ہونے پاتا! پھر مجاعہ نے تم کو دھوکا دے کر صحیح طریق کار سے تم کو باز رکھا، اور اپنی قوم (بنو حنیفہ) کی طرف سے صلح کی حالانکہ خدا نے پوری طرح ان کو تمھارے بس میں کر دیا تھا۔۔۔

۔۔ یہاں راوی خط کو ادھورا چھوڑ دیتا ہے یہ کہہ کر کہ اس کا مکمل مضمون وثیمہ نے اپنی کتاب الردّۃ میں بیان کیا ہے۔ (اکتفار صلا۲۲ وابن اسحاق طبری ۳/ ۲۵۴، صرف خط کشیدہ حصہ)

مجاعہ کی صلح اور دھوکہ کا قصہ یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر خالد مجاعہ کو لے کر مسیلمہ کی لاش تلاش کرنے نکلے، جو میدانِ جنگ میں سینکڑوں لاشوں کے درمیان کہیں پڑی ہوئی تھی جب مجاعہ نے خالد کو لاش دکھائی تو انھوں نے کہا: "یہ ہے وہ شخص جس نے تمھیں تباہ کرایا! حنفی بھی کتنے احمق ہیں، اس حقیر آدمی (مسیلمہ چھوٹے قد کا بھدا سا آدمی تھا) کی باتوں میں آکر تباہ ہوگئے۔" مجاعہ نے کہا: یہ سب تو ہوا، لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ ان کے لیڈر کے قتل سے جنگ ختم ہوگئی، بخدا تم سے لڑنے ابھی ان کے اگلے دستے آئے ہیں، ان کے اکثر جوان اور خاندانی لوگ قلعوں میں موجود ہیں۔ (اکتفار صلا۲۵۹ وابن اسحاق۔ طبری ۳/ ۲۵۱)

مجاعہ کی ان باتوں نے اگرچہ خالد کو تشویش میں ڈال دیا پھر بھی انھوں نے اپنے رسالوں کو تیار ہونے کا حکم نہ دیا۔ راوی کہتا ہے کہ مسلمان بنو حنیفہ سے لڑنا نہیں چاہتے تھے، وہ لڑائی سے تنگ آگئے تھے، ان کی بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، اور جو زندہ بچے ان میں سے اکثر زخمی تھے۔ اس وقت مجاعہ نے حکمت سے کام لیا اور خالد سے کہا: میں تمھارا بھلا چاہتا ہوں، تم

اور بنو حنیفہ بُری طرح پِٹ چکے ہو، آؤ میں ان کی طرف سے سمجھوتہ کرتا ہوں "، راوی کہتا ہے: اہل سابقہ یعنی اسلام کے پُرانے شیدائی اور آزمودہ کار صحابہ کے قتل سے خالد کی فوجی طاقت بہت کم ہو گئی تھی، اس کے علاوہ اونٹ اور گھوڑے چارے کی قلت سے بے حد کمزور ہو گئے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے ۔ سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے بنو حنیفہ کو اپنا سارا سونا، چاندی، ہتیار، گھوڑے اور قبیلے کے آدھے آدمی مسلمانوں کو دینا پڑے، اس سمجھوتہ کے بعد جب خالد، مُجّاعہ کے ساتھ حنفیوں کی بستیوں میں گئے اور اُن کے قلعوں کو دیکھا تو وہاں بس عورتیں، بچے اور دور از کار مرد تھے ۔ یہ دیکھ کر خالد کو غصہ آیا اور انھوں نے مُجّاعہ سے کہا: تم نے مجھے دھوکا دیا یعنی کہاں ہیں سورما اور جوانوں کے وہ دل جن کی تم نے دھمکی دی تھی ۔ مُجّاعہ نے کہا " اپنی قوم کے مفاد کے لئے ایسا کرنے پر مجبور تھا "۔ اس صلح کے ساتھ ہی سارے حنفی مسلمان ہو گئے ۔ (الکتفاء صـ ۲٦۰)

خالد کا جواب

مُجّاعہ کی لڑکی سے شادی پر حضرت ابو بکر کا مذکورہ بالا مراسلہ جب خالد کو موصول ہوا تو انھوں نے کہا: یہ سب عمر کی شرارت ہے "۔ (عمر سے ان کی کھٹکی ہوئی تھی) انھوں نے اپنی برارت کے لئے خط ذیل لکھا ۔ اس کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ ابو بکر نے سرزنش نامہ میں (جس کا صرف ادھورا حصہ راوی نے بیان کیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر پڑھا) چار اعتراض تھے:

(۱) خالد نے مُجّاعہ کی لڑکی سے جنگ ختم ہوتے ہی شادی کی ۔

(۲) جنگ کی ناقص قیادت کی یا جنگ کے خطروں سے خود الگ تھلگ رہے

(۳) اپنی فوج کے کئی سو شہیدوں پر نہ ماتم کیا نہ ان کا سوگ منایا ۔

(۴) مجاعہ کے دھوکہ میں آگئے ۔

"میری جان کی قسم، میں نے اس وقت تک عورتوں سے شادی نہیں کی جب تک فتح اور کامرانی کی مسرت پوری طرح مجھے حاصل نہ ہوگئی اور کیمپ سے نکل کر گھر کے ماحول میں منتقل نہ ہوگیا۔ میں نے ایسے شخص سے رشتہ جوڑا ہے جس کے پاس اگر مدینہ سے پیغام دینے مجھے آنا پڑتا تو میں پرواہ نہ کرتا۔ آپ کی یہ شکایت کہ میں نے اپنی فوج کے شہیدوں کا حقِ ماتم ادا نہیں کیا (خط کی عبارت سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے) تو بخدا ان کی موت پر مجھے بے پایاں صدمہ ہوا، اور اگر کسی کا غم زندوں کو بقیدِ حیات رکھ سکتا، اور کسی کا ماتم مُردوں کو بقیدِ حیات لا سکتا تو میرا غم اور ماتم ضرور یہ اثر دکھاتے۔ (آپ یقین کیجئے) شوقِ شہادت مجھے ایسے ایسے خطروں میں لے گیا جہاں بچنے کی امید نہ رہی تھی، اور موت کا یقین ہوگیا تھا۔ آپ کا یہ کہنا کہ مُجّاعہ نے دھوکا دے کر مجھے صحیح طریقِ کار سے باز رکھا تو عرض یہ ہے کہ میں نے کبھی اپنی رائے کو غلط نہیں سمجھا، پھر مجھے غیب کا علم بھی نہ تھا (جو مُجّاعہ کے دھوکہ کو پہلے سے معلوم کرسکتا) سمجھوتہ سے بلا شبہ خدا نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا، ان کو زمین (بنو حنیفہ کی) کا وارث بنا دیا اور ان کو اہلِ تقویٰ کے انعام عطا کئے۔ (بنو حنیفہ کا سونا چاندی اور سامان)

مشہور صحابی ابو برزہ اسلمی یہ خط لے کر مدینہ آئے، اس کو پڑھ کر حضرت ابو بکر کا اشتعال کچھ دھیما پڑا، راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر پر اس کا اثر مطلق اچھا نہ ہوا، وہ پہلے کی طرح خالد کو بُرا بھلا کہتے رہے اور اس میں کچھ دوسرے سربرآوردہ قریشی بھی شامل تھے۔ ابو برزہ سے نہ رہا گیا انھوں نے کھڑے ہو کر خالد کی حمایت میں تقریر کی جس سے ابو بکر کا غبارِ خاطر کافی کم ہوگیا۔

اکتفاء میں خالد کا ایک اور خط جنگ یمامہ کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔ ان کی فوج کے چند صحابہ اُس سمجھوتہ کے خلاف تھے جو اُنھوں نے مُجَّاعہ سے کیا تھا اور جس کی زد سے بنو حنیفہ کے باقی مرد قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ صحابہ کی دلیل تھی کہ سمجھوتہ خلیفہ کی ہدایات کے خلاف ہے، ہدایات کا تقاضہ ہے کہ بنو حنیفہ کے سارے بالغ مردوں کو قتل کردیا جائے خالد کہتے: آپ کی دلیل سر آنکھوں پر، لیکن حالات ایسے ہیں کہ ان ہدایات پر عمل نہیں ہوسکتا۔ سمجھوتہ ہوگیا اور صحابہ کو شکایت باقی رہی۔ خالد کو اندیشہ تھا کہ صحابہ کی مخالفت حضرت عمر تک متعدی ہوکر رہے گی اور وہ ضرور خلیفہ کو بھڑکائیں گے، لہذا انھوں نے مناسب سمجھا کہ خلیفہ کو ان استثنائی حالات سے باخبر کردیں جن کے زیر اثر وہ صلح کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، خلیفہ رسول اللہ ابوبکر کی خدمت میں خالد بن ولید کی طرف سے۔" بخدا میں نے حنفیوں سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک میری فوج کے وہ لوگ قتل نہ ہوگئے جن پر میری قوت کا دارومدار تھا، جب گھوڑے سوکھ کر کانٹا ہوگئے اور اونٹ بھوکوں مر گئے۔ جنگ میں اتنے مسلمان مارے گئے اور اتنے زیادہ زخمی ہوئے کہ اس ڈر سے کہیں وہ ہار نہ جائیں (یا سب کے سب قتل نہ کردئے جائیں) میں بھیس بدل کر تلوار سونت کر انتہائی خطروں میں گھس پڑتا تھا بالآخر خدا نے فتح عنایت کی۔ شکر ہے اُس کا۔"
اکتفاء صد ۲۳۱

اس خط کی عبارت میں اضطراب و تکرار ہے جس کو ترجمہ میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

خالد بن ولید کے نام

یہ مراسلہ اس وقت موصول ہوا جب خالدؓ کا مجاعہ سے سمجھوتہ ہو چکا تھا، راوی کہتا ہے کہ اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ بعض صحابہ شروع سے ہی سمجھوتہ کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ سمجھوتہ خلیفہ کی منشا اور ہدایات دونوں کے خلاف تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ فتح بزاخہ کی خبر پا کر حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو جو مراسلہ بھیجا تھا اس کے آخر میں یہ الفاظ تھے: اگر خدا تم کو بنو حنیفہ پر فتح عطا کر دے تو خبردار جو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، ان کے زخمیوں کا کام تمام کرنا، ان میں سے جو بھاگ جائیں۔ ان کا تعاقب کرنا اور جو تمہارے ہاتھ آئیں ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دینا اور آگ میں جلا دینا۔" مراسلہ ذیل پا کر انھوں نے خالدؓ پر بہت زور ڈالا کہ سمجھوتہ توڑ دیا جائے اور بنو حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر کے بزورِ شمشیر فتح کیا جائے اور ان کے سارے بالغوں کو قتل کر دیا جائے، پر خالدؓ کیسے سمجھوتہ توڑتے، نقضِ عہد کی قرآن اور رسول دونوں نے سخت مذمت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان فوج اس درجہ کمزور اور ان کے گھوڑے ایسے نڈھال ہیں کہ وہ کوئی عسکری مہم انجام نہیں دے سکتے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں ہرگز سمجھوتہ نہ کرتا۔

"میرا خط پا کر تدبر سے کام لینا، اور اگر خدا بنو حنیفہ پر تم کو فتح عطا کر دے تو ان کے کسی بالغ مرد کو زندہ نہ چھوڑنا۔" (الاکتفا ص ۲۶)

"شعرِ عربی کی مختصر تاریخ"

از

جناب پروفیسر ڈاکٹر سید رغیب حسین - ایم - اے

(پی - ایچ ڈی، صدر شعبۂ فارسی - بریلی کالج بریلی)

(دورِ جاہلیہ)

عرب اور شعر گوئی | عرب ایک خانہ بدوش اور صحرانورد قوم تھی - جب کہیں مقیم ہوتی اس وقت تو اس کی فطری صلاحیتیں عشق و محبت کی حسین دلچسپیوں میں یا ضیافت و سخاوت کی شہرت طلبیوں میں یا سیر بینی و شکار افگنی کے مشغلوں میں یا جنگ اور لوٹ مار کے پیشوں میں ظاہر ہوتیں - لیکن جس وقت وہ قوم سفر کرتی اُس وقت بھی اس کی فطری صلاحیتیں اور ذہنی جدتیں اور جَودتیں، بیکار اور زنگ خوردہ نہیں رہتی تھیں - اس وقت وہ صلاحیتیں دوسری شکلوں میں ظاہر ہوتیں -

سفر کے باعث ایک طرف تو ان کے ذہنوں کو دوسرے مشاغل سے یک سوئی ملتی اور دوسری طرف میدانوں کی خوشگوار، اور بعض اوقات خوشبودار ہوا لگ لگ کر ان کے دلوں میں سرور و نشاط اور دماغ میں تازگی پیدا کر دیتی - اور تنہائی کے اِن لمحات میں اکثر ان کے دلوں کے اندر ایک نئی تحریک اور گدگدی پیدا ہوتی - ایسے میں جب انھوں نے اونٹوں کے پاؤں سے دَب دَب کی آواز کو غور سے سُنا جو برابر کے وقفوں اور موزوں کھٹکوں کے ساتھ چلنے میں ان کے پاؤں اور موزوں سے نکلتی تو ان کی فطری ذہانت نے ان کے دل و دماغ میں پہلے وزن کا ایک سادہ تخیل پیدا کیا اور اس موزونیت سے ان کی روح کیف

اندوز ہونے لگی - وزن کے اس سادہ تخیل کے بعد سجع کا ایک مبہم اور دھندلا خاکہ ان کے ذہنوں میں اُبھرنے لگا - اور پھر مختلف رفتاروں (مثلاً دُلکی - سرپٹ - قدم وغیرہ) کے باعث "دَب دَب" کے کھٹکے بھی جو مختلف موزونی دکھانے لگے تو ان کو مختلف "بحروں" کا ابتدائی احساس ہونے لگا -

عربوں کے دلوں میں عشق و محبت، دوستی اور عداوت، سخاوت و شجاعت کے جذبات تو پہلے ہی سے موجزن تھے اب جو رفتہ رفتہ پہلے وزن کا پھر سجع کا پھر مختلف بحور کا ابتدائی اور دھندلا تخیل ان کے دماغوں میں اُبھرا تو ان کے مُنہ سے بھی ان کے دلی خیالات، عام نثر کے مقابلہ میں ایک ترتیب اور موزونیت کے ساتھ نکلنے لگے - یہ تھا عربوں کا پہلا قدم شاعری کی طرف!

پہلے ان کے نثری جملے ہی سفر کی حالت میں ایک خاص وزن کے ساتھ اور سجع و قافیہ سے آراستہ ہو کر ان کے منہ سے نکلے ہوں بس اُسی کا نام "نظم و شعر" ہے جس نے عربوں کے دلوں کے ساتھ ان کے اونٹوں تک کو مست کر دیا - یہی وجہ ہے کہ مورخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ

"عربوں کی شاعری کی سب سے پہلی جو صنف ظاہر ہوئی وہ "حُدی" تھی"

اس کے بعد جیسے جیسے اُن کا شعور پختہ ہوتا گیا اور ان کی فطری صلاحیتوں نے تمدن کی طرف جیسے جیسے قدم بڑھائے ویسے ویسے مجمل اوزان میں تفصیل - مبہم سجع میں علم القوافی کی باریکیاں - بحور میں امتیاز قائم ہوتا گیا - سجع سے رجز خوانی آسان ہوگئی - یہی وجہ ہے کہ بقول نواد افرام بستانی صاحب "روائع" "عربوں نے جو پہلی بحر ایجاد کی وہ بحر رجز ہی ہے کیوں کہ یہ بنسبت دوسری بحور کے رجز زیادہ اسہل ہے اور گانے میں بھی اچھی معلوم ہوتی ہے رجز خوانی ہی کی بدولت سجع اور قافیوں سے آراستہ نثری عبارتوں میں خوب مشق اور مہارت بڑھنے لگی - رجز کے بعد دوسری بحور دریافت ہوئیں -

غرض عربی شاعری کی یہ بحریں در اصل ایجادؔ تو کیں عرب کے بادیہ نشین اور صحرا نورد طبقہ

ؔ یہاں ایک شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے - عام طور پر مشہور ہے کہ "خلیل بن احمد نے حجاج بن یوسف کے عہد میں ظہورِ اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

نے اور عرصہ تک یہی بحریں اپنی بے نام اور سادہ اَن گھڑ صورتوں میں برتی، گائی اور کام میں لائی جاتی رہیں مگر ایک مدت کے بعد جب دوسرے موزوں طبع لوگوں نے ان میں سے ہر ایک کا صحیح اندازہ اور ایک کا دوسرے سے فرق و امتیاز اچھی طرح معلوم اور محسوس کر لیا تو پھر عام اور خاص ہر طبقہ کے لوگ برابر انھیں اوزان و بحور میں شعر کہنے لگے اور تقریباً پانسو سال قبل مسیح سے باقاعدہ عربی شاعری شروع ہو گئی۔

عرب میں شاعر کا درجہ عرب لوگ جو لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں اور بیٹوں کو زیادہ چاہتے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیٹے سے انھیں امید ہوتی تھی کہ شاید وہ بڑا ہو کر شاعر ہو اور قبیلہ اور باپ کے ناموں کو اور اپنے خاندان کے کارناموں کو سارے ملک میں مشہور اور اُجاگر کرے۔ اور اپنے قبیلہ کو پڑوس کے دوسرے حریف قبائل کے مقابلہ میں نام آور اور ممتاز بنا دے۔ چنانچہ جب کوئی شاعر پہلی بار اپنی قوم کے سامنے اپنے شعر پڑھتا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اس وقت وہ ایسی خوشی مناتے جیسی عموماً شادیوں میں مناتے یعنی محفل سجاتے۔ گانے والی عورتوں کو بلاتے۔ رقص و طرب میں مشغول ہوتے۔ اونٹ ذبح کرتے۔ اور برادری و احباب کی دعوت کرتے۔ پھر جب ساری قوم اور برادری مل کر شاعر کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتی اور سر آنکھوں پر بٹھاتی تو ہر قبیلہ کے بچے بچے کے دل میں شاعر۔ ممتاز بننے کا شوق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے ۷۰ سال بعد فن عروض مکہ میں تیار کیا،" تو اس تیار کرنے سے مراد ایجاد نہیں بلکہ تدوین اور ترتیب و تکمیل ہے۔ خلیل نے قدیم بدویوں کے سادہ گمنام۔ اَن گھڑ موزوں کلام کو دیکھ سُن کر باقاعدہ علمی طور پر ان کو مدوّن اور کتاب میں درج کیا۔ ہر ایک بحر کا الگ الگ نام رکھا۔ ہر بحر کے علل و زحافات کے ــــــ جو گو اُس وقت تک عملی طور پر مروج بھی رہے ہوں ــــــ کچھ قواعد و اصول، کچھ جوازات اور کچھ ممنوعات مقرر کر دیئے و بس۔ ورنہ خلیل کی اس علمی خدمت کے لئے خام مواد (غالباً ہر طرح کا) پہلے ہی سے عرب کے بدویوں میں تیار تھا اور اس فن عروض کی داغ بیل بادیہ نشینانِ عرب، مدتوں قبل ہی ڈال چکے تھے! پھر تاریخ بتاتی ہے کہ عرب جیسی بادیہ نشین۔ غیر متمدن اور اُمّی قوم سے اُسی کے ایجاد کئے ہوئے اس فن عروض کی بھیک ایران اور ہندوستان جیسے زرخیز۔ متمدن اور مہذب یافتہ ملکوں تک نے مانگی اور نہ جانے اور کس کس ملک اور قوم نے اُن بادیہ نشینوں سے استفادہ کیا!!

پیدا ہونا لازمی تھا۔ یہی وجہ تھا کہ عرب کا بچہ بچہ شعر کہنے لگا تھا۔

عربوں کا دستور تھا کہ اپنے بچوں کو بچپن ہی سے مجمع کے سامنے صاف اور بے جھپک بولنا۔ شعر سنانا سکھاتے اور دکھاتے اسی کا نتیجہ تھا کہ

(الف) وہ لوگ اپنی گویائی اور زباں آوری پر ناز کرتے اور دنیا بھر میں صرف اپنے کو "عرب" گویا فصیح کہتے اور دوسری ہر قوم کو "عجم" یعنی گونگا نام دھرتے۔

(ب) ان میں تقریر اور شاعری کا رواج بہ کثرت پھیل گیا حتیٰ کہ عورتیں بھی شعر سمجھتی اور شعر کہتی ہیں۔ حماسہ میں بہت سی عورتوں کے اشعار بھی قبائلی فخر۔ مرثیہ۔ ہجو۔ تشبیب (غزل) کے ملتے ہیں۔

(ج) اسی کا یہ اثر تھا کہ اُن میں بدیہہ گوئی اور "برجستہ نظمی" کا بھی ملکہ پیدا ہو گیا تھا

(د) اسی شعر گوئی کی کثرت سے اُن میں "نقد و تبصرہ" کرنے۔ لفظی اور فنی خامیوں کا ادراک بہت پیدا ہو گیا تھا۔

اور چوں کہ عرب ایک اَن پڑھ قوم کے لوگ تھے۔ تحریر کا ان کے یہاں رواج نہ تھا اس لئے شاعری کے اسی کثرتِ رواج کے باعث

(۱) ان کا حافظہ بلا کا قوی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ وہ اس قوت سے برابر کام لیتے اور ہزاروں اشعار۔ بڑے لمبے لمبے قصائد زبانی یاد رکھتے۔

(۲) اپنی شاعری کے ذریعہ عرب شاعروں نے ایسے کارنامے دکھاتے ہیں جو دراصل ماہر انشاء پردازوں اور سحر بیان خطیبوں اور مقرروں کے تھے مثلاً جنگ پر آمادہ کرنا۔ کسی کو اس کی رائے سے پھیر دینا۔

الشعر دیوان العرب | چوں کہ ملک عرب میں مدرسے در تعلیم کا رواج نہ تھا اور تہذیب و تمدن کی کمی کے باعث عربوں کے خیالات و افکار گھوم پھر کر ان کی محدود ملکی اور قومی مشاغل ہی کے دائرہ میں محدود رہتے۔ اُن سے باہر نہ جانے پاتے۔ اور گویائی اور شاعری کے ملکات

بھی قدرت نے بدرجۂ اتم ان کے اندر امانت رکھ دیے تھے اس لئے وہ اپنے گردوپیش جو قدرتی مناظر دیکھتے یا انفرادی حالات پاتے یا اجتماعی معاملات ان کے آپس میں پیش آتے یا جو ملی جذبات اور قلبی واردات وہ محسوس کرتے یا اپنے مفاخر کے بیان اور حریف و ہمسایہ کی تحقیر کی ادنیٰ ضرورت بھی سمجھتے تو پھر وہ ان تمام باتوں کو اپنی فطری سادگی کے ساتھ نظم و شعر میں ادا کرتے رہتے ۔ چنانچہ آج جب ہم ان کی شاعری کے ذخیرے پر نظر ڈالتے تو ان کی قومی خصوصیت اور انفرادی سیرت کا ایک ایک خط و خال اس کے اندر نہایت وضاحت سے دیکھ سکتے ہیں کوئی ہوشیار سے ہوشیار مورخ بھی اگر ان کی قومی سیرت یا ملکی تاریخ تیار کرنا چاہتا تو وہ بھی عربوں کے حالات اور قومی خصوصیات اس تفصیل ۔ وضاحت سے ہرگز نہ لکھ سکتا جتنا خود ان کے اپنے اشعار سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہے ۔

ان کی قومی خصوصیت ، انفرادی سیرت اور ملکی سیاست اور حالت کیا تھی ؟ ۔ بس یہی ان کی بے لوث ضیافت و سخاوت ، پائیدار عداوت و محبت ، پختہ وعدے اور معاہدے ، سچی غلامی و آقائی ، زبردست جنگ و جدال ، بے مثال شجاعت و ہمت ، بے نظیر وفا ، و مروت ، صحیح قسم کی آزادی اور حریت ۔ صحرا نشینی و بادیہ پیمائی خانہ بدوشی اور سیر و سفر ، عشق و محبت ، رشک و رقابت ۔ لوٹ مار ، قتل و غارتگری ، اونٹ بکری کا پالنا ، نیل گائے و ہرن کا شکار کرنا ، گورخر اور شتر مرغ کے تماشے دیکھنا ۔ شیروں اور بھیڑیوں سے مٹھ بھیڑ کرنا ۔ شراب پینا اور جوا کھیلنا ، کھجور اور اونٹ بکری کے دودھ پر گزارا کرنا ۔ اولاد سے محبت اور ان کی ذلت کے اندیشہ سے فکرمندی ، قحط اور ناداری کی تکلیفیں سہنا اور سردی اور گرمی کی مصیبتیں جھیلنا وغیرہ غرض عربوں نے اپنی شاعری میں اپنے کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا اور اپنی ظاہری صورت سے لے کر اپنی باطنی سیرت تک کو پوری طرح اپنے شعری ذخائر میں کھول کر دھر دیا ہے ۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ " الشعر دیوان العرب " یعنی عرب کے اشعار ہی ان کی تاریخ و سیرت کا دفتر ہیں ۔

عربوں کا حافظہ عرب ایک اَن پڑھ اور اَن گھڑ ملک تھا اس لئے وہاں کے لوگ اپنی قومی تاریخ کو دیگر متمدن اقوام و ممالک کی طرز پر مدوّن و منضبط تو کر نہیں سکتے تھے اور اس ملک کے بنجر ہونے کی وجہ سے غیر ممالک کے لوگ بھی نہ وہاں آتے جاتے کہ انھیں کو عربوں کی تاریخ یا سیرت مرتب کرنے کا خیال ہوتا۔ مگر خدا نے اس کمی کو ایک عجیب طرح پورا فرما دیا وہ یوں کہ ایک طرف تو اُن میں گویائی اور شاعری کا مادّہ بدرجۂ اتم رکھ دیا تھا جیسا ہم مفصل اوپر لکھ آئے ہیں اور دوسری طرف ان کو حیرت انگیز قوتِ حافظہ عطا فرمادی اور وہ لوگ بلا کے ذہین اور بے نظیر حافظہ کے مالک تھے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ تحریر اور ضبطِ واقعات کا ان کے ملک میں کوئی انتظام نہ تھا اور عین ممکن تھا کہ یمن کے قحطانی قبائل کی تہذیب اور تاریخ کی طرح عدنانی قبائل کا بھی سارا تاریخی اور ادبی سرمایہ فنا ہو جاتا۔ مگر یہ ان کے غیر معمولی حافظہ ہی کا کمال تھا کہ ان کے علوم، ان کی تاریخ، ان کا ادب، صدیوں تک پُشت در پُشت کمال صحت وحفاظت سے برابر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا اور ایک مقدس امانت کی طرح ان کے حافظوں نے یہ سارا ذخیرہ اہل تحریر اور اہل تاریخ کے سپرد کر دیا۔

وہ قوم جو نہ صرف اپنے آباء و اجداد کے نسب بلکہ دوسرے قبائل کے انساب کو بھی بیس بیس پُشتوں تک پوری صحت کے ساتھ نوکِ زبان رکھتی اور اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں اور اپنے اونٹوں تک کا سلسلۂ نسب بھی محفوظ رکھتی۔ وہ بھلا اپنے ہی ادب کو —— جس میں ان کے قابلِ فخر ایام و وقائع، ان کے قابلِ رشک نسب، ان کی مایۂ ناز شجاعت وسخاوت، ان کے محبوب مشاغل اور رنگین مجالس کے کارنامے مذکور تھے —— کیوں کر محفوظ نہ رکھتے؟ چنانچہ عربوں میں جو لوگ ادب کے حفظ میں ماہر اور صاحب کمال ہوتے ان کی عربوں میں بڑی عزت تھی۔ ان کو "راوی" کہا جاتا تھا۔ آج ہم کو چاہے حسب ذیل واقعات کا یقین نہ آئے لیکن اہل تاریخ نہایت وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:-

(۱) عرب میں ایک شخص حمّاد نامی تھے ان کے حروفِ ہجا میں سے ہر ہر حرف پر

ختم ہونے والے ایک ایک ہزار قصائد یاد تھے۔ اس کے معنے یہ ہوئے ان کو اٹھائیس ہزار قصائد زبانی یاد تھے۔ جن میں سے ہر ایک قصیدہ میں بیس[۲] سے لے کر سو اشعار تک ہوتے تھے!! مشہور ہے کہ عباسی دور میں خلیفہ ولید کو اس کا یقین نہیں آتا تھا تو اس نے حماد کو طلب کیا اور ان کا امتحان لیا۔ امتحان میں ان کو ویسا ہی پایا جیسا سنا تھا تو ان کو ایک لاکھ درہم انعام میں عطا کئے۔

(۲) قبیلہ طے میں ایک شخص ابو تمام حبیب ابن اوسی تھے۔ ان کو صرف زمانۂ جاہلیت کے چودہ ہزار قصائد یاد تھے اور متفرق ابیات و قطعات ان کے علاوہ بھی یاد تھے ان کا بھی امتحان لوگوں نے لیا۔ انھوں نے عربوں کے اشعار کا ایک نہایت نادر انتخاب اور مجموعہ تیار کیا ہے جو "حماسہ" کے نام مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کو جتنے اشعار زبانی یاد تھے ان کی مجموعی تعداد ڈھائی لاکھ تھی!!

(۳) عرب میں اصمعی نام ایک نہایت مشہور شخص ادب اور لغت کا ماہر گزرا ہے اس کو عربوں کے سولہ ہزار قصائد زبانی یاد تھے۔

(۴) ایک شخص ابو ضمضم نامی نے ایک بار ایک عرب رئیس کے دربار میں صرف ایسے سو شاعروں کا کلام سنایا جن میں سے ہر ایک کا نام عمرو تھا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ عربوں کی شاعری کا کل ذخیرہ اتنا ہی تھا جو مذکورہ بالا چار راویوں کے سینوں اور حافظوں میں تھا۔ ابن قتیبہ لکھتا ہے کہ "عہد جاہلیت کا کلام بہت کم مل سکا ہے کیوں کہ ان کا تو بچہ بچہ شاعر تھا ان کا سارا کلام اس ذخیرہ سے کئی گنا زیادہ رہا ہوگا جو آج ہم کو ملتا ہے"

شعرائے عرب کے طبقات: زمانہ کے اعتبار سے عربی شعراء کے چار طبقات ہیں :-

۱۔ جاھلی : ظہور اسلام سے قبل کے شعرا۔

۲۔ مُخضَرمی : وہ شعراء جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں بھی شعر کہے اور اسلام لائے

کے بعد بھی کہے۔

۳۔ اسلامی: وہ شعرا جن کی نشو و نما اسلام میں ہوئی اور ان کی عربیت مٹنے نہیں پائی (بہ الفاظ دیگر عہد اموی کے شعرا)

۴۔ مولدین: وہ شعرا جو عربوں اور عجمیوں کے اختلاط اور عربیت فنا ہونے کے بعد پیدا ہوئے یعنی عہد عباسی کے شعرا

جاہلیت کے مشہور شعرا | عام طور پر مشہور یہ ہے کہ عربی شاعری کا ابو الآبا مُہلہِل ہے مگر خود اس کے اشعار اور اس کے عہد کے دوسرے لوگوں کے اشعار میں الفاظ کی بندش۔ خیالات کی روانی۔ طرز ادا کی صفائی وغیرہ دیکھ کر ہرگز یقین نہیں ہوتا کہ عربی شاعری بالکل ابتدا ہی میں اس قدر نکھر گئی ہوگی اصل یہ ہے کہ عربی شاعری مُہلہِل سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اور گو ہر نئی پشت اپنی شاعری کو پچھلی پشتوں کی شاعری کے مقابلہ میں زیادہ شُستہ اور رُفتہ بناتے اور نکھارتے چلے آتے تھے مگر پھر بھی مُہلہِل کے وقت تک وہ اس قدر مرتب اور اس قدر مؤثر نہیں ہوتے پائی تھی کہ لوگ اس کے یاد رکھنے پر مجبور ہوتے۔

البتہ پہلا قابل ذکر جاہلی شاعر مُہلہِل تھا جس کا کلام مدوّن شدہ جاہلیت کے اشعار میں سے سب سے پہلا ہے کیوں کہ اس کے کلام میں ایک نمایاں جلا اور صفائی۔ ایک ممتاز زور اور تاثیر اور ناقابل فراموشی شیرینی اور دل کشی پائی جاتی ہے کہ لوگ بے اختیار اس کو یاد رکھنے۔ اس پر فخر کرنے اور وقت ضرورت سند و استشہاد میں پیش کرنے لگے۔ پس اگر ہم جاہلی شعرا مشاہیر کی فہرست تیار کریں تو ہمیں سب سے پہلے مہلہل کو اس میں جگہ دینی پڑے گی۔ مشاہیر شعرا م جاہلیت عموماً یہ بتائے جاتے ہیں:-

مہلہل۔ امرؤ القیس۔ طرفہ۔ لبید۔ زُہیر۔ ابن کلثوم۔ حارث۔ عنترہ۔ نابغہ ذُبیانی۔ اعشیٰ۔ عبید۔ علقمہ۔ تابّطہ شرّا۔ شنفریٰ۔ منخّل۔ مرقش اکبر۔ جریر۔ امیہ۔ ابو کبیر۔ حاتم طائی۔ سموئل برّاق وغیرہ۔

ان مرد شعرا کے علاوہ عرب جاہلیت کی بہت سی شاعر عورتیں بھی بہت مشہور ہیں۔ مثلاً ام ثابت۔ ام الصریح وغیرہ۔

ان مذکورہ مرد شعرا میں مہلہل اگرچہ بقیہ سب سے پہلے ہوا ہے اور اس لئے پہلے اُسی کا تذکرہ کیا جانا مناسب تھا لیکن اس کے بعد کے دس نام اُن مشاہیر کے ہیں جن کے دامن سے "معلّقات یا سموط" جیسے غیر فانی ادبی کارنامے وابستہ ہیں اور ان کو "اصحاب المعلقات" کے نام سے پکارا جاتا ہے اس لئے معلّقات اور اصحاب المعلّقات کا تذکرہ پہلے یکجا کر دینا بے جا نہ ہوگا۔

معلّقات مہلہل کے ہم عصر یا اس کے زمانہ سے بالکل ہی متّصل متعدد شعرا ایسے تھے جن کے بعض قصائد متفقہ طور پر بہت پسند کئے گئے ان شعرا کا درجہ نہایت ممتاز مانا گیا لیکن ایسے ممتاز قصائد کی تعداد کتنی ہے اس بارے میں اقوال مختلف ہیں:۔

۱۔ بعضوں کے نزدیک ایسے قصائد کی تعداد سو سے زائد ہے۔

۲۔ کتاب جمہرۃ اشعار للعرب میں ایسے قصائد اُنچاس ۴۹ بتائے گئے ہیں جو اُنچاس ہی شعرا کے کلام کے بہترین قصائد ہیں:۔

۳۔ حمّاد راویہ نے ۱۵۶ھ (عہد عباسی) میں ایسے قصائد کا انتخاب کیا تو سات قصائد جمع کئے اور ان کو "سبع معلّقات" کہا۔

۴۔ تبریزی نے بہترین قصائد دس کی تعداد میں انتخاب کئے اور ان کو "معلّقات عشر" کا نام دیا۔

جس طرح ایسے قصائد کی تعداد میں اختلاف ہے اُسی طرح لفظ معلّقات کے معنوں اور وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے:۔

۱۔ بعض کے نزدیک وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جو قصیدہ سب سے بہتر اور عمدہ تر مانا جاتا تھا اُسے سنہرے حروف میں ریشم پر لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیتے تھے۔

تاکہ یا تو لوگ اس کی غلطی نکالیں نہ پھر اس کے ناظم و مصنف کو "ملک الشعراء و سید الشعراء" تسلیم کریں۔ چوں کہ ان قصائد کو سنہرے حروف سے ریشم پر لکھوایا گیا تھا اس لئے ان کو "مذہبات" کہتے اور چوں کہ ان کو آویزاں کیا گیا تھا اس لئے ان کو "معلقات" کہتے، مگر مذہبات کا لفظ مشہور نہ ہو سکا معلقات مشہور ہو گیا

یہ وجہ تسمیہ زیادہ مشہور ہے اور حماد راویہ۔ ابن عبد ربہ (مصنف عقد الفرید) اور احمد نحاس بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہی احمد نحاس دوسری جگہ اس روایت کو بے بنیاد بھی کہتے ہیں۔

۲۔ بعض کا خیال ہے کہ چوں کہ عربی میں لفظ علق کے معنی نفیس اور قیمتی چیز کے ہیں اس لئے معلقات جو ان قصائد کو کہا تو اس لئے کہا کہ یہ بہترین اور نفیس ترین مانے گئے ہیں۔

۳۔ بعض کہتے ہیں کہ معلقات اُن چیزوں کو کہتے ہیں جن کو کسی ذخیرے میں بہترین چیزیں سمجھ کر چھانٹ کر نکالا جائے چوں کہ یہ قصائد تمام ذخیرۂ ادب جاہلی میں سے چھانٹ اور چُن کر الگ کئے گئے ہیں اس لئے ان کو معلقات کہتے ہیں (اس لئے یہ معنی دوسرے معنی کا مرادف ہو گا)

۴۔ بعض اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ معلقات ہار کو کہتے ہیں جن کو گلے میں لٹکایا جاتا ہے اور یہ قصائد بھی ایسے دل کش اور قابل قدر ہیں کہ یہ گلے میں حفاظت سے لٹکائے جانے کے قابل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قصائد کو "سموط" بھی کہتے ہیں (سمط معنی ہار) بہر صورت ان کی وجہ تسمیہ چاہے کچھ بھی ہو۔ اس قدر تو بہر حال مسلّم ہے کہ یہ سات یا دس قصائد بہترین قصائد عرب ہیں۔ اب آگے ہم ان کے شعرا کا مختصر حال لکھتے ہیں:۔

اصحاب المعلّقات

امرؤ القیس

اس کا نام حندج اور اس کے باپ کا نام حجر تھا قبیلۂ کندہ (صوبہ نجد) کا ایک

نواب زادہ تھا۔ عام طور پر امرؤ القیس کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو الملکُ الضِّلِّیل (شاہ گمراہ یا بگڑا نواب) کا لقب دیا تھا اور ایک خاص واقعہ کے باعث لوگوں نے اسے ذوالقروح (آبلوں والا) کا لقب دیا۔

عرب جیسے اَن پڑھ اور اَن گھڑ ملک و قوم میں رئیسوں اور نوابوں کی عادات واطوار یوں بھی بگڑے ہوئے ہوتے تھے مگر اُن سب میں یہ نواب زادہ تو اور بھی چار ہاتھ بڑھ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی سوتیلی ماؤں سے بھی اظہار عشق کیا تھا۔ اور خاندان کی دوشیزائیں اکثر اس کی ہوس کا شکار بن جاتی تھیں۔ اس کے باپ حجر کو کسی بات پر قبیلۂ بنو اسد نے قتل کر دیا تھا۔ حُندج عرف امرؤ القیس نے انتقام لینے کی قسم کھالی اور قاتلوں سے کئی بار لڑا اور اکثر اپنے دشمنوں پر فتح پائی لیکن کسی وجہ سے حیرہ کے بادشاہوں کو امرؤ القیس سے کچھ ضد اور کد پیدا ہو گئی تھی انھوں نے عرب کے کئی قبیلوں کو امرؤ القیس کے خلاف بھڑکا دیا۔ امرؤ القیس اس صورتِ حال کا زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کرسکا آخر اُس نے گھبرا کر ہمسایہ عیسائی نوابوں سے مدد مانگی اور سموئل بن عادیا نامی ایک یہودی رئیس کے یہاں طلب مدد میں خود گیا اُس نے قیصرِ روم کے نام اس کی سفارش کا خط لکھ دیا۔ امرؤ القیس نے اپنے کچھ ہتھیار اور زرہیں سموئل کی حفاظت میں چھوڑیں اور خود قیصر روم کے یہاں مدد لینے گیا۔ سموئل کا سفارشی خط جب قیصر نے دیکھا تو اپنی کچھ فوج امرؤ القیس کو دینے کا وعدہ کیا۔ جب امرؤ القیس چند دنوں کے قیام کے بعد وہاں سے چلنے لگا تو حسب وعدہ قیصر کی کچھ فوج اس کے ہمراہ چلی۔ جب امرؤ القیس کچھ دُور چلا گیا تب قیصر کو خبر لگی کہ امرؤ القیس نے یہاں اپنے قیام کے زمانہ میں میری بیٹی سے خفیہ آشنائی شروع کر دی تھی اس پر اُسے بڑا غصہ آیا اور اُس نے فوج تو واپس بلالی اور ایک زہر آلود قبا شاہی انعام کے طور پر امرؤ القیس کے پاس بھیجی۔ اس کا پہننا تھا کہ اس کے بدن میں آبلے پڑ گئے۔ اس طرح زہریلے آبلوں سے وہ راستہ ہی میں مرگیا اور اس کے ساتھیوں نے انگورہ میں اُسے دفن کر دیا یہ واقعہ ۵۶۰ء کا ہے۔ بعض مورخین نے کہا ہے کہ امرؤ القیس

قیصر روم کے یہاں سے بغیر کسی فوج کے اپنے عربی ساتھیوں ہی کے ہمراہ واپس آرہا تھا راستہ میں اچانک بیمار پڑا اور اس کے سارے بدن میں از خود آبلے پڑ گئے جن کی وجہ سے وہ مر گیا کہتے ہیں کہ اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے کچھ قبل تھا کیوں کہ آپ کی ولادت شریفہ ۵۷۰ء میں ہوئی تھی۔

تبصرہ ۱۔ اگرچہ اس کے عہد میں عرب کے دو مشہور شاعر اور بھی تھے ایک تو اس کا ماموں مُہلہل بن ربیعہ اور دوسرا ابو دُواد ایادی۔ تاہم بالاتفاق یہ امرؤالقیس تمام جاہلی شعرا میں سب سے بڑھ کر تھا۔

۲۔ قصائد کی تشبیب میں محبوبہ کے کھنڈروں پر رونے اور ماضی کی یاد کرنے کے لئے دوستوں کو بھی روکنے کا جذبہ آفریں طرز سب سے پہلے اسی نے ایجاد کیا۔

۳۔ حسینوں کو ہرنوں اور نیل گایوں سے تشبیہ سب سے پہلے اسی نے دی۔

۴۔ گھوڑے کی بے مثل تعریف اور اپنی شہسواری کا بیان قصائد میں سب سے پہلے اسی نے کیا۔ چنانچہ اپنے معلقہ میں گھوڑے کو عُقاب۔ پتھر کی چٹان اور بارش کے قطرہ سے تشبیہ کا موجد یہی ہے۔ اردو میں میر انیس دہلوی نے مراثی میں جو گھوڑے کی تعریف کی ہے وہ اس کے تتبع میں کی ہے۔

۵۔ اپنے ماموں مُہلہل کی طرح عورتوں سے اختلاط اور چھیڑ چھاڑ کے معاملات اور اس سلسلہ میں شرمناک حد تک عُریاں نگاری اس کے یہاں بھی ہے مگر معاملہ بندی اس کے یہاں مُہلہل سے زیادہ عمدگی سے پائی جاتی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

وَقَدْ اَغْتَدِی وَالطَّیرُ فِی وُکُنَاتِھَا   بِمُنجَرِدٍ قَیدِ الاَوَابِدِ ھَیکَلِ

مِکَرٍّ مِفَرٍّ مُقبِلٍ مُدبِرٍ مَعاً   کَجُلمُودِ صَخرٍ حَطَّہٗ السَّیلُ مِن عَلِ

تُضِیئُ کَمِصبَاحِ الظَّلَامِ کَاَنَّھَا   مَنَارَۃُ مُمسٰی رَاھِبٍ مُتَبَتِّلِ

۲- طَرَفَہ

تذکرہ | اس کا نام طرفہ اور اس کے باپ کا نام عبد تھا۔ طرفہ کی کُنیت ابو عمرو تھی۔ قبیلۂ بکر بن وائل کا ایک فرد تھا۔ یہ امرؤ القیس کے مرنے سے ۳۰ سال بعد ۵۹۰ء میں پیدا ہوا۔ یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ اس کا باپ قضا کر گیا۔ جب پیدا ہوا تو چچا نے اس کی کفالت اور پرورش اپنے ذمہ لی شعور آنے کے بعد ہی عیاشی اور بیہودہ زندگی کی لت پڑ گئی اور زندگی کے دن شراب نوشی۔ قمار بازی۔ ہجو گوئی۔ شاعری وغیرہ میں گزارنے لگا۔ ایک بار اس کا ماموں جریر کسی کام سے عمرو بن ہند شاہ حیرہ کے پاس جا رہا تھا۔ یہ بھی ہمراہ ہو لیا۔ اسے توقع تھی کہ بادشاہ کے یہاں سے شاید یہ بھی شاہی انعام پا سکے گا۔ جس سے یہ اپنی حالت درست کر سکے گا۔ مگر بدمزاجی اور ہجو گوئی کی عادت پڑ چکی تھی اس لئے وہاں بھی کسی بات پر خفا ہوا اور بادشاہ کی ہجو کہدی۔ بادشاہ نے اس ہجو کا حال سُن لیا اُس نے اپنے ظاہری برتاؤ میں فرق نہ آنے دیا۔ لیکن دل میں کینہ رکھے رہا۔ آخر اُس نے طرفہ سے کہا کہ تم بحرین کے گورنر کے پاس میرا یہ خط لے کر جاؤ۔ تمہیں بحرین سے انعام ملے گا۔ یہی وعدہ اُس بادشاہ نے جریر متلمس سے بھی کیا اور دونوں کو ایک ایک سربمہر فرمان گورنر بحرین کے نام دیا۔ یہ دونوں فرمان لے کر بحرین کی طرف روانہ ہوئے۔ جریر متلمس کو راستہ میں یکایک خیال پیدا ہو گیا کہ بادشاہ نے طرفہ کی ہجو کا انتقام نہیں لیا کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس نے گورنر بحرین کو طرفہ کے قتل کا حکم لکھ دیا ہو اور میں چونکہ اس کے ساتھ آیا ہوں کہیں شاہی عتاب میں میں بھی نہ آجاؤں یہ سوچ کر اس نے طرفہ سے کہا کہ بادشاہ نے خود انعام کیوں نہ دیا۔ کہیں اس خط میں اس نے ہم کو سزا دینے کا حکم نہ دیا ہو میرے نزدیک تو مناسب ہے کہ ان فرمانوں کو کھول کر کسی سے پڑھوا لینا چاہئے۔ طرفہ نے کہا کہ فرمان سربمہر ہیں ان کے کھولنے سے مہر توڑنی پڑے گی پھر ہم گورنر کے سامنے پیش بھی نہ کر سکیں گے۔ اس لئے اسے پڑھوانا مناسب نہیں۔ جریر متلمس کے دل میں شک بڑھتا گیا آخر اُس نے کسی بستی میں پہونچ کر فرمان کھول کر پڑھوایا تو اس میں حامل رقعہ کے

قتل کا حکم سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے طرفہ سے کہا کہ جب میرے فرمان میں میرے قتل کا حکم لکھا ہے تو یقین ہے کہ تیرے فرمان میں بھی قتل ہی کا حکم ہوگا تو بھی فرمان کھول کر پڑھوا لے مگر طرفہ نے منظور نہ کیا اس نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ جو تمہارے فرمان میں درج ہے وہی میرے فرمان میں بھی درج ہو۔ جریر متلمس نے بہت بہت سمجھایا مگر طرفہ نہ مانا۔ آخر جریر نے کہا کہ میں تو یہاں سے گھر واپس جاتا ہوں اور تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ تو بحرین نہ جا گھر واپس چل۔ مگر طرفہ باز نہ آیا۔ غرض جریر متلمس نے تو غسانی بادشاہوں کے پاس جا کر پناہ لی اور طرفہ انعام کی لالچ اور بادشاہ پر اعتماد کرتا ہوا بحرین پہنچا اس نے خط دیکھ کر پہلے طرفہ کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے پھر زندہ زمین میں دفن کر دیا۔ اس طرح یہ ہونہار شاعر چھبیس ہی برس کی عمر میں ۶۱۵ء میں مر گیا۔

تبصرہ ۱:- اس جوانا مرگ شاعر نے باوجود کم عمری کے اپنے جوہر خداداد کے باعث اپنی جگہ شعراء عرب کی صفِ اوّل میں بنالی۔ یہاں تک کہ حضرت لبیدؓ جو خود ایک زبردست شاعر اور صاحب معلقہ ہیں کہتے ہیں کہ اشعر العرب امرؤ القیس ہے اور اس کے بعد وہ بنو بکر کا نوخیز شاعر!

۲۔ کسی کے وصف کے بیان میں طرفہ صرف اس کی ذاتی خوبیاں ہی بیان کرتا ہے مبالغہ کرنا اس کا طریقہ نہیں ہے۔ اور اگر کہیں مبالغہ کرتا بھی ہے تو اپنی فطری میانہ روی اور سلامتِ ذوق کے باعث اس میں غلو اور حد سے تجاوز نہیں ہونے دیتا۔ واقعیت اور صداقت بیان اس کی خصوصیت ہے۔

۳۔ منظر نگاری اور اس کی جزئیات کی تفصیل اس کا خاص میدان ہے۔

۴۔ اگرچہ امرؤ القیس کے تتبع میں محبوب کے کھنڈروں پر رکنا اور رونا اور اپنی سواری کی تعریف بیان کرنا اس نے بھی اختیار کیا ہے لیکن اس پر اکثر ادبا کا اتفاق ہے کہ اونٹنی کی تعریف جیسی طرفہ کر گیا ہے ایسی کسی نے نہیں کی ہے۔

۵۔ فخریہ مضامین۔ اپنی بے راہ روی کا ذکر بھی کرتا ہے تو متانت اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور اوچھا پن کلام میں نہیں آنے دیتا حالانکہ ان مضامین میں بے اعتدالی کا بہت

امکان رہتا ہے۔

۶۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کلام میں پیچیدہ تراکیب، مغلق الفاظ اور نامانوس لغات کے استعمال کا بھی بڑا شائق ہے

نمونہ کلام یہ ہے:۔

أری الموت یعتام الکرام ویصطفی — عقیلة مال الفاحش المتشدد

أری العیش کنزاً ناقصاً کل لیلة — وما تنقص الایامُ والدهرُ ینفد

وظلم ذوی القربیٰ اشد مضاضة — علی المرء من وقع الحسام المهند

۳۔ زہیر

تذکرہ اس کا نام زُہیر اور اس کے باپ کا نام ابو سلمیٰ ربیعہ تھا۔ بنو مُزینہ کے قبیلہ کا مشہور شاعر تھا۔ اگرچہ زہیر کا باپ ربیعہ بھی شاعر تھا اور زہیر کو شعر و شاعری سے لگاؤ کے لئے یہ بھی کافی تھا مگر زہیر نے اپنے ننہال قبیلہ بنو غطفان میں پرورش پائی تھی اور وہاں کا بچہ بچہ شاعر تھا۔ مرد تو مرد اس قبیلہ کی عورتیں بھی مشہور شاعرہ تھیں۔ چنانچہ اپنے نانا (یا ماموں) بشامہ کی صحبت میں پرورش پاکر زُہیر نے ننہال کی شاعری کا گویا ورثہ پایا اور بہت وقار متانت اور سنجیدگی سے زندگی بسر کرنے لگا۔

اتفاق سے جب زُہیر کی شادی ہوئی تو خسر بھی شاعر تھے جن کا نام اوس بن حجر تھا۔ زُہیر کے باپ۔ نانا۔ خسر تو شاعر تھے ہی اس کی دو بہنیں خنسا اور سلمیٰ بھی مشہور شاعرہ تھیں پھر زُہیر کے دو بیٹے ایک کعب ابن زہیر اور دوسرے مالک ابن زہیر بھی شاعر تھے غرض ع

این خانہ تمام آفتاب است

زہیر بڑا دولتمند۔ نہایت متحمل اور باوقار و سنجیدہ۔ آخرت کا ماننے والا۔ برائیوں سے احتراز کرنے والا انسان تھا۔ سبعہ معلقہ میں اس کا قصیدہ تیسرا ہے اس میں اس نے دو رئیسوں کی جن میں ایک حارث بن عوف مُری دوسرے ہرم بن سنان مُری تھے بڑی تعریف

کی ہے اور حق یہ ہے کہ ان دونوں رئیسوں نے کام بھی ایسا ہی کیا تھا کہ دنیا ان کی تعریف کرتی۔ قبیلۂ عبس اور ذُبیان کی مشہور لڑائی "حربِ داحس و غبرا" کا سلسلہ چالیس برس سے چھڑا ہوا تھا اور کسی طرح ختم ہونے ہی نہیں آتا تھا۔ طرفین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے کہ ان دونوں رئیسوں نے دونوں قبائل میں صلح کرانی چاہی تو ایک فریق نے اپنے قبیلہ کے پہلے مقتول کے خون بہا کا مطالبہ فریقِ ثانی سے کیا۔ فریقِ ثانی خون بہا دینا اپنی ذلت اور شکست تصور کرتا تھا۔ آخر ان دونوں رئیسوں نے محض انسانی ہمدردی میں اپنے مال سے خوں بہا ادا کر کے دونوں قبائل کے درمیان صلح کرا دی۔ یہ واقعہ چوں کہ عرب میں اپنی نوعیت کا سب سے پہلا واقعہ تھا اس لئے ہر شخص ان رؤسا کا مداح تھا نہ کہ زُہیر جو شاعر کا حساس دل، اور تیز احساس اور گویا زبان رکھتا تھا اس نے اپنے معلقہ میں ان کی بڑی اور سچی تعریفیں کی ہیں۔

ہرم بن سنان بھی ایسا فیاض شخص تھا کہ زُہیر جب اُس کی مدح کرتا تو وہ زُہیر کو ایک گھوڑا یا ایک باندی ضرور انعام میں دیتا تھا۔ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک بار ہرم کے بیٹے سے فرمایا "تیرے باپ ہرم نے زہیر کو جو خلعتیں دیں وہ تو فنا ہو گئیں مگر زہیر نے تیرے باپ کو جو مدح کا لباس پہنایا وہ مدتوں دنیا میں باقی اور یادگار رہے گا"

زُہیر نے ۶۱۱ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ایک سال قبل انتقال کیا۔

نقشِ حکمت

جناب احمق پھپھوندوی کے نام سے ہندوستان کا تقریباً ہر پڑھا لکھا واقف ہے آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند شعرا میں ہے آپ کے کلام کا انداز ظرافت، رنگینی اور شوخی کے ساتھ پُر حکمت بھی ہوتا ہے "نقشِ حکمت" احمق صاحب کے کلام کا بہترین مجموعہ ہے۔ مجموعہ کو تین عنوانوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اشارات، عبارات، خطابات، آخر میں منتخب غزلیات کا حصّہ ہے۔ صفحات ۲۲۰ قیمت مجلد تین روپے

سومناتھ کا مندر اسلامی تاریخوں میں

از

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے
(لکچرر آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ)

[نصر اللہ فلسفی جامعہ تہران میں تاریخ قبل اسلام کے پروفیسر ہیں۔ کئی ادبی رسالوں کے اڈیٹر رہ چکے ہیں، اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں عہد حاضر کے ایرانی ادیبوں میں ان کا مقام کافی اونچا ہے۔ ذیل کا مضمون ان کی ایک فارسی کتاب "فتح سومنات" سے ماخوذ ہے۔]

اکثر اسلامی مورخوں کا خیال تھا کہ سومناتھ کا بت "اوس" اور "خزرج" قبیلوں کا وہی بت "منات" ہے جو بنی ثقیف کے بت "لات" اور بنی قریش اور بنی کنانہ کے بت "عزیٰ" اور دوسرے بتوں کے ساتھ کعبہ کے بت خانہ میں رکھا ہوا تھا۔ رسول اکرم صلعم نے ان بتوں کو توڑ دیا تو بت پرست منات کو کسی نہ کسی طرح اس بت خانے سے اڑا لے گئے، اور اسے سمندر کے راستے جزیرہ نمائے گجرات کے ساحل پر پہنچا دیا جہاں ایک مدت سے بت پرست بستے چلے آ رہے تھے۔ یہاں اس کے لئے ایک بت خانہ بنایا گیا اور اس پتھر کو رنگ برنگ کے ہیروں سے سجایا گیا۔ پھر یہ مشہور کر دیا گیا کہ یہ پتھر آپ سمندر سے نکلا ہے۔ اس کا نام ان لوگوں نے "سومنات" رکھا جس کے اندر اس کا اصلی نام "منات" چھپا ہوا تھا۔

ان سب باتوں کے سوا چونکہ منات کی شکل انسان جیسی تھی، اس لئے اسلامی مورخوں کو خیال ہوا کہ سومناتھ کا بت بھی آدمی کی صورت کا بنایا گیا تھا۔

یہ سب باتیں اصلیت سے خالی ہیں۔ ابوریحان بیرونی[1] نے سلطان محمود کے عہد میں خاص طور پر ہندوؤں کے دینی عقائد پر گہری تحقیق کی ہے اور ہندوستان سے متعلق بڑی گراں بہا اور جامع کتاب "کتاب الہند" کے نام سے لکھی ہے۔ بیرونی نے سومناتھ کے بت کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس بت سے متعلق اور اسلامی مورخوں کے جو تصورات بیان کئے گئے ہیں ان کی بے حقیقتی کو آشکار کر دیتی ہیں۔

ابن اثیر نے بھی اپنی کتاب کامل التواریخ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے بیان کو ہم آگے نقل کر رہے ہیں۔ اس بیان سے بھی ابوریحان بیرونی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر تعجب اس کا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی لشکر کشی کے زمانہ میں اس کے ہمراہی بھی اس بت کے بارے میں وہی عقائد رکھتے تھے۔ سلطان محمود کے دربار کا مشہور شاعر فرخی جو محمود کے ساتھ سومناتھ گیا تھا، اور اس نے اپنی آنکھوں سے سومناتھ کا مندر دیکھا تھا، سومناتھ کے بت کو کعبہ کا منات نامی بت بتاتا ہے۔

ابوریحان بیرونی کا بیان سومناتھ کے بارے میں بیرونی لکھتا ہے کہ یہ لفظ دو کلموں یعنی "سوم" اور "ناتھ" سے مرکب ہے "سوم" کے معنی ہیں "چاند" اور "ناتھ" کے معنی ہیں آقا، مالک۔ اس طرح سومناتھ کے معنی ہوئے "چاند کا آقا"، اس نام کی وجہ تسمیہ کے ذیل میں بیرونی نے ہندو دیومالا کی یہ کہانی نقل کی ہے:

"کہتے ہیں کہ چاند پرجاپت کی بیٹیوں کے گھر رہا کرتا تھا۔ جن سے اس نے شادی کر لی تھی۔ ان میں سے وہ روہنی پر سب سے زیادہ ریجھا ہوا تھا۔ اس پر دوسری بیٹیوں نے باپ کے پاس اس کی شکایت کی۔ پرجاپت نے چاند کو نصیحت کی کہ وہ اس کی سب بیٹیوں سے ایک سا سلوک کرے۔ لیکن چاند نے پرجاپت کی بات نہ مانی۔ اس پر پرجاپت نے اسے بددعا دی۔ اور چاند کا مکھڑا کالا ہوگیا۔ چاند اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا اور توبہ کرنے لگا۔ پرجاپت نے یہ دیکھ کر چاند سے کہا کہ میں اپنی بددعا تو واپس نہیں لے سکتا، لیکن

[1] ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (ولادت ستمبر ۹۷۳ء، وفات ۱۳ دسمبر ۱۰۴۸ء) فلسفی اور ریاضی داں اور مشہور اسلامی مورخ

تیری رسوائی کو ہر مہینے آدھے مہینے تک چھپائے رکھا جا سکتا ہے۔ چاند نے پوچھا کہ جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکا ہے اس کا کفارہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کہا کس طرح کہ مہادیو کا لنگ بناؤ، اور اس کی پرستش کرو۔ چاند نے ایسا ہی کیا اور سومنا تھ کا پتھر وہی مہادیو کا لنگ ہے"۔

لنگ یا لنگا کے معنی سنسکرت زبان میں مرد کے عضوِ تناسل کے ہیں۔ بیرونی نے اپنی سنی سنائی باتوں کے تحت مہادیو کے لنگ کے بارے میں جو چاند کا معبود قرار پایا تھا، لکھا ہے کہ "ایک روز ایک رشی نے مہادیو کو اپنی بیوی کے ساتھ تنہا دیکھا اور مہادیو سے بدگمان ہو گیا رشی نے مہادیو کو بد دعا دی۔ اس پر مہادیو کا عضوِ تناسل اس سے الگ ہو گیا۔ بعد میں جب رشی کو مہادیو کی بے گناہی کا یقین ہو گیا تو اس نے مہادیو سے کہا کہ میری بد دعا کی وجہ سے تیرا عضوِ تناسل تجھ سے الگ ہو گیا، اس کا بدل اب یوں کروں گا کہ اسی تیرے عضوِ تناسل کو مخلوق کا معبود قرار دوں گا، تاکہ لوگ اس کے ذریعہ توسل اور تقرب حاصل کریں۔

لنگ کی بناوٹ کے بارے میں بیرونی نے وراہ مہار[1] کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ

"ایک بے عیب پتھر لیں۔ اس کا بڑا چھوٹا ہونا اپنی مرضی پر ہے۔ اس پتھر کو تین حصوں میں تقسیم کریں۔ اس کے ایک تہائی نچلے حصے کو مکعب مستطیل کی شکل کا بنائیں۔ درمیانی ایک تہائی کو ہشت پہل بنائیں، اور اوپر کے ایک تہائی کو گول اور صاف گھڑیں، اس طرح کہ لنگ کا سر بن جاتے۔ بت کو نصب کرتے وقت ایک تہائی مکعب مستطیل کو زمین کے اندر گاڑ دیں۔ ایک تہائی درمیانی حصہ کے لئے پوشاک بنائیں جسے ہندو "پنڈ" کہتے ہیں۔ اس پوشاک کے بیرونی حصے کے چار پہلو ہونے چاہئیں تاکہ نیچے کے ایک تہائی مکعب مستطیل حصہ پر جو زیرِ زمین ہے منطبق ہو جائے۔ ایک تہائی مدور حصہ کو اس پوشاک سے باہر نکال لیں۔"

ابن اثیر نے بھی اپنی تاریخ میں اس بت کا حال کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔ اس نے بت کی لمبائی

---

[1] وراہ مہار قدیم ہندوستان کا بہت بڑا عالم ہوا ہے اور اس نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور احکام نجوم پر کتاب لکھی ہے۔

پانچ ذرع (ایک ذرع تقریباً ایک گز کے برابر ہوتا تھا) لکھی ہے اور یہ بات خاص طور پر لکھی ہے کہ سومناتھ کے بت کا مدور حصہ جو زمین سے اوپر تھا تین ذرع تھا اور باقی دو ذرع حصہ جس کی کوئی خاص شکل نہ تھی، زمین کے اندر تھا۔

اس کے بعد بیرونی نے اس بُت کے بارے میں ہندوؤں کے عقائد لکھے ہیں اور کتاب وراہ مہارا کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اگر کہیں بت کے ایک تہائی مدور حصے کو چھوٹا یا باریک بنائیں تو موجب فساد ہوگا اور اس علاقے کے لوگوں پر جہاں کہ بت بنایا گیا ہے مصیبت نازل ہوگی اور اگر کہیں بت کو جتنا زمین کے اندر رکھنا ہے اتنا نہ رکھا گیا یا وہ سطح زمین سے اوپر ہوگیا تو اس سرزمین کے لوگ مختلف امراض میں مبتلا ہوں گے۔ اگر بت کے بناتے وقت اس پر میخ ماری جائے تو اس سے اس قوم کا حاکم اور بڑے لوگ مر جائیں گے۔ اگر کہیں اس کو اٹھاتے بٹھاتے وقت بُت کے مار لگ جائے اور اس مار سے بُت کو نقصان پہنچے تو اس کا بنانے والا ہلاک ہو جائے گا اور طرح طرح کی وبائیں اس سرزمین میں پھیل جائیں گی۔"

اس کے بعد بیرونی لکھتا ہے کہ "اس طرح کے بُت سندھ کے جنوب مغربی شہروں میں ہندوؤں کے گھروں میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں[1] لیکن ان میں سب سے بڑا اور مشہور ترین سومناتھ کا بت ہے۔ اس کا مندر سندھ کے مغربی ساحل پر تین میل لمبا دریائے سرسوتی کے دہانے پر بنایا گیا ہے۔ چاند کے طلوع اور غروب کے وقت مد کی وجہ سے سمندر کا پانی مندر کے اندر آجاتا ہے اور بت پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ جب چاند نصف النہار یا نصف اللیل پر پہنچ جاتا تو پانی اتر جاتا اور بت پھر نمایاں ہو جاتا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ چاند اس طرح بُت کو غسل دے کر اس کی پرستش میں مشغول ہوتا ہے۔ سومناتھ کی شہرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بحری سفر کرنے والے مسافر اور جہاز جو افریقہ اور چین کے درمیان

---

[1] حال ہی میں سندھ کے ماقبل تاریخ شہر موہنجو داڑو کی کھدائیوں میں لنگ کی صورت کے پتھر نکلے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے لنگ کی پرستش بہت قدیم زمانے سے مغربی ہند میں عام تھی۔

آتے جاتے تھے، یہاں لنگر انداز ہوتے تھے۔

سومناتھ کا مندر: تمام مورخین ہند کا کہنا ہے کہ جس زمانے میں سلطان محمود نے سومناتھ کا قصد کیا ہے، سومناتھ کے مندر کو بنے چار ہزار سال ہو چکے تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ سومناتھ کے بت کے کان میں تیس حلقے تھے۔ سلطان محمود نے جب ان حلقوں کے بارے میں پوچھا تو کہا گیا کہ ہر حلقہ ایک ہزار سال کی عبادت کی علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود کے حملہ کے وقت سومناتھ کے مندر کو بنے تیس ہزار سال ہو چکے تھے، اور یہ بات مبالغہ سے خالی نہیں۔ خود ہندوؤں کا خیال تھا کہ ان کے ہادی سری کرشن جی یہیں پیدا اور یہیں روپوش ہوئے ہیں۔

سومناتھ کا مندر بہت بڑا اور نہایت عالی شان تھا۔ اسے سمندر کے کنارے اس طرح بنایا گیا تھا کہ مد کے وقت سمندر کا پانی اس کے ایک حصہ کی دیواروں کے اندر آجاتا تھا مندر کی بنیاد پتھر کی بڑی بڑی سلوں پر رکھی گئی تھی۔ اور اس کی چھت (۵۶) ستونوں پر اٹھائی گئی تھی۔ یہ ستون شیشم کے تھے اور یہ لکڑی آفریقہ سے درآمد کی گئی تھی۔ ان ستونوں پر اوپر سے نیچے تک تانبا گڑھ دیا گیا تھا۔ تاریخ الفی میں لکھا ہے کہ "اس مندر کا ہر ستون طرح طرح کے نفیس جواہرات سے مرصع تھا، اور ہندوستان کے جن جن راجاؤں نے انھیں بنایا تھا ان کے نام سے منسوب تھا۔" شبانکارہ کی تاریخ مجمع الانساب میں لکھا ہے کہ "پورا مندر تانبے کا بنایا گیا تھا اور اس کے تمام ستون اور دیواریں سونے کی تھیں۔۔۔" مندر کی چھت بہت اونچی تھی اور اس کی تیرہ منزلیں تھیں۔ چھت کے اوپر سونے کے چار گنبد تھے جو سورج کی روشنی میں جگمگاتے اور دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ مندر کے صحن کو بھی شیشم کے تختوں سے پاٹ دیا گیا تھا اور تختوں کے شگافوں میں سیسہ ڈالا گیا تھا۔ مندر کا اندرونی حصہ تاریک تھا لیکن ہر طرف سونے چاندی اور جواہرات کے شمع دانوں میں بے شمار شمعیں جلتی تھیں۔ مندر کے اطراف جو دروازے تھے ان پر بیش قیمت زربفت کے

پردے پڑے ہوئے تھے جو مندر کے مختلف عہدے داروں سے منسوب تھے۔

مندر کے درمیان سومناتھ کا لنگ نصب تھا۔ یہ لنگ پانچ ذرع اونچا تھا۔ دو ذرع زمین کے اندر اور تین ذرع زمین کے باہر۔ اس کی پوشاک بہت نفیس تھی۔ اس پر مختلف جانوروں کی شکلیں ہیرے موتی اور سونے چاندی سے بنائی گئی تھیں۔ اس پوشاک کے ذریعے لنگ کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ شبانکارہ کی تاریخ مجمع الانساب میں لکھا ہے کہ ''۔۔۔ یہاں ایک بت تھا جو پتھر کے اندر کھودا گیا تھا۔ اس کو سات پردوں کے اندر چھپا کر رکھا گیا تھا۔ بت بھی مرصع تھا اور پردے بھی مرصع تھے۔ شمعیں اور مشعلیں جلتی تھیں، اور عود و عنبر اور مشک و زعفران کی بو ہر طرف مہکتی رہتی تھی۔۔۔'' نہایت قیمتی جواہرات سے آراستہ ایک تاج لنگ کے سر پر چھت سے لٹکا یا گیا تھا۔ مندر کے اطراف بہت سے دالان اور راستے تھے جو سب کے سب لنگ کے مقام پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر مندر کے خادموں اور محافظوں کے رہنے کے لئے مکان بنائے گئے تھے۔ یہ لوگ مندر کی زیارت کو آنے والوں کی رہبری کرتے تھے۔ سومناتھ کے مندر کے لئے کوئی دس ہزار (ایک قول کے مطابق دو ہزار) مشہور اور آباد گاؤں وقف تھے۔ مندر کے خزانوں میں بے شمار مال و دولت اور جواہرات جمع ہو گئے تھے۔ تقریباً ایک ہزار برہمن لنگ کے خاص خدمت گار تھے۔ کوئی تین ہزار (ایک قول کے مطابق دو ہزار) حجام زائرین کے سر کے بال اور داڑھی مونڈھنے پر مقرر تھے۔

سومناتھ کے مندر میں تین ہزار سازندے اور پانچ سو ناچنے گانے والیاں ناچنے گانے اور بجانے کی خدمت پر مامور تھیں۔ ان سب کا روزگار مندر کے اوقاف اور اس کی آمدنی سے چلتا تھا۔ مندر کے سامنے ایک بڑا گھنٹہ لٹکتا تھا۔ اس کی سونے کی زنجیر کا وزن ہی دو سو من تھا۔ اس گھنٹے کو عبادت کے وقت بجایا جاتا تھا۔ مندر کے

ایک کونے میں اس کا خزانہ رکھا گیا تھا جس میں طرح طرح کے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی مورتیاں رکھی تھیں۔ گردیزی نے اپنی تاریخ زین الاخبار میں لکھا ہے کہ وہ... بتوں کے نیچے خزانہ تھا"، سومناتھ کے مندر کے اندر جو دولت جمع تھی، مورخوں نے اس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ دینار لکھا ہے۔ مندر کے ایک کونے میں ایک چشمہ بھی تھا ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ چشمہ بہشت سے نکلا ہے اور مفلوجوں اور پرانی بیماریوں کے مریضوں کو اس میں نہانے سے شفا ہوتی ہے

سومناتھ کے بت کے بارے میں ہندوؤں کے عقائد

سومناتھ کا مندر ہندوستان کے بہت بڑے اور بہت مشہور مندروں میں تھا۔ ہندوستان کے باشندے اس لنگ پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس لنگ کو خدائی صفات حاصل ہیں۔ چاہے نوجوان بخشے، چاہے تو ہلاک کرے۔ لوگوں کو زندگی کی لذتوں سے حصہ دینا اسی کا کام ہے۔ ہر طرح کے امراض سے شفا دے سکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ روحیں جب بدن سے جدا ہو جاتی ہیں تو اس بت کے اطراف جمع ہو جاتی ہیں اور سومناتھ ان میں سے ہر ایک کو ایک نئے جسم میں جنم دیتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سمندر کا مدوجزر اس بات کی علامت ہے کہ چاند اور سمندر دونوں اس بت کی پرستش کرتے ہیں۔

ہر سال خاص طور پر چاند گہن کے موقعے پر دور و نزدیک کے شہروں سے بے شمار لوگ سومناتھ کے مندر کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ چاند گہن کے موقعوں پر زائروں کی تعداد دو لاکھ سے بھی اوپر ہوتی تھی۔ شراون کے مہینے میں ایک دن لوگ سومناتھ کے نام پر برت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بہت سے راجے مہاراجے اس دیوتا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہر سال خود اس کی زیارت کے لئے آتے تھے اور بڑے بھاری چڑھاوے چڑھا کر جاتے تھے اور کبھی کبھی اپنی بیٹیوں کو سومناتھ کی خدمت کے لئے مندر کی داسی بھی بنا دیتے تھے۔ ہر روز ایک بڑے برتن میں دریائے گنگا کا مقدس پانی کوئی دو سو میل دور سے لایا جاتا تھا۔ گنگا جل لانے کے لئے خاص طور پر آدمی مقرر تھے۔

اس گنگا جل سے ہر روز سومناتھ کے لنگ کو غسل دیا جاتا تھا اور پھولوں کی ایک ٹوکری ہر روز لنگ پر چڑھانے کے لئے کشمیر سے آتی تھی۔

جیساکہ ہم اوپر کہہ آتے ہیں، سومناتھ کی شہرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ آفریقہ اور چین کے بحری راستے پر واقع تھا۔ چین اور آفریقہ آنے جانے والے بہت سے تجارتی جہاز اس بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ غالباً تاجر اور سیاح اس مندر کے بت کو دنیا کا محافظ اور نگہبان سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اس ملک کے تمام بتوں میں اس بت کو سب سے بڑا اور سب بتوں کا فرماں روا مانتے تھے۔ جب سلطان محمود نے ہندوستان کے بعض شمال مغربی قلعوں کو فتح کرلیا اور وہاں کے بہت سے مندروں کو ویران کردیا تو لوگوں نے یہ بات مشہور کردی کہ چوں کہ سومناتھ ان بتوں سے خوش نہ تھا، اس لئے مسلمانوں کو ان پر مسلط کردیا۔

فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
"برہان" دہلی

مقام اشاعت	ندوۃ المصنفین دہلی	قومیت	.. ..
نوعیت اشاعت	ماہانہ	پتہ	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی
نام پرنٹر	مولوی محمد ظفر احمد خاں	نام اڈیٹر	مولانا سعید احمد ایم-اے
قومیت	ہندوستانی	قومیت	ہندوستانی
پتہ	ندوۃ المصنفین جامع مسجد اُردو بازار دہلی	پتہ	ندوۃ المصنفین جامع مسجد اُردو بازار دہلی
نام پبلشر	″ ″ ″	نام و پتہ مالک رسالہ	ندوۃ المصنفین دہلی

میں محمد ظفر احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

تزکِ بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۱۴)

زہرہ کی مٹی پلید ہوئی | اس کم بخت اور کم عقل عورت نے شوہر کرنے کی ہوس میں اپنے بیٹے کی عزت برباد کردی اور گھر بار خاک میں ملادیا۔

شیبانی خاں نے ذرہ برابر اس کی پرواہ نہ کی۔ اور اس کو لونڈی اور سریت کے برابر بھی نہ جانا۔

علی مرزا کا قتل | سلطان علی مرزا اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا اور سخت پریشان تھا اس کے بعض ہمدردوں نے جو یہ بات محسوس کی تو چاہا کہ اسے لے بھاگیں۔ مگر وہ نہ مانا۔ اور موت چوں کہ سر پر منڈلا رہی تھی اس لئے بچ نہ سکا۔ وہ تیمور سلطان کے پاس چلا گیا۔ اور چار پانچ دن بعد قلبہ کے سبزہ زار میں اُسے قتل کردیا گیا۔ وہ ایک عورت کے کہنے میں آگیا تھا۔ اس لئے چند روزہ اور ناپائیدار زندگی کے لئے بدنام ہو کر مرا اور نیک ناموں کے زمرے سے نکل گیا۔ ایسے آدمی کے حالات اس سے زیادہ کیا لکھے جائیں اور ایسی بُری حرکتیں اس سے زیادہ سُن بھی کون سکتا ہے۔

سلطان علی مرزا کو قتل کرنے کے بعد خان نے جان علی کو بھی مرزا کے پاس بھیج دیا۔

خواجہ یحییٰ کی شہادت | شیبانی خاں، خواجہ یحییٰ سے خوفزدہ تھا۔ اس لئے اس نے خواجہ اوران کے دونوں بیٹوں خواجہ محمد زکریا اور خواجہ باقی کو خراسان جانے کی اجازت دے دی۔ مگر ان کے پیچھے پیچھے چند ازبک بھی گئے اور انھوں نے حضرت خواجہ اوران کے دونوں بیٹوں کو خواجہ

کارزون[1] کے قریب شہید کر دیا۔

شیبانی خاں کا عذر لنگ شیبانی خاں کہتا تھا کہ میں نے یہ قتل نہیں کرائے۔ بلکہ قنبر علی اور کپک بے[2] نے خود ایسا کیا ہے لیکن یہ تو عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات ہوئی۔ کسی بادشاہ یا سلطان کے امرا اس کی مرضی کے بغیر ایسا کام کر گذریں تو پھر اس بادشاہ کی بادشاہی یا سلطان کی سلطانی کیا ہوئی

کیش سے حصار جانا پڑا ازبکوں نے جیسے ہی سمرقند پر قبضہ کیا ہم فوراً کیش سے حصار چلے گئے۔ محمد مزید ترخان اور سمرقند کے دیگر امرا اور ان کے بال بچے اور ان کے ماتحت لوگ ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔

چغانیان کے سبزہ زار میں پہنچنے کے بعد محمد مزید ترخان اور سمرقند کے اُمرا ہم سے الگ ہو کر خسرو شاہ کے پاس چلے گئے اور انھوں نے اس کے ہاں نوکری کر لی۔

جلا وطنی اور آوارہ گردی ہم اس حالت کو پہنچ گئے کہ ملک چھٹ گیا اور وطن سے دُور جا پڑے۔ نہ کہیں رہنے کا ٹھکانا نہ کہیں جانے کا موقع۔ خسرو شاہ نے ہمارے خاندان کے ساتھ بے حد برائیاں کی تھیں۔ مگر مجبوراً اسی کے ملک میں سے ہو کر گذرنا پڑا۔

ارادہ یہ تھا کہ قرا تگین[3] اور الائی[4] کے راستے اپنے چھوٹے ماموں الچہ خاں کے پاس جاؤں لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

خسرو شاہ کی نذر کھمرود کے بہت اونچے راستوں پر چلتے ہوتے اور سرہ تاق[5] اور ایانی کے اوپر سے ہوتے ہوئے جب ہم نوتدک پہنچے تو خسرو شاہ کا ایک نوکر آیا۔ اور اس نے اپنے آقا کی طرف سے نو گھوڑے اور نو جوڑے نذر کئے۔

---

[1] کارزون [2] قنبر بے۔ بے ایک خطاب تھا جو بے حد با اقتدار آدمی کو دیا جاتا تھا۔ [3] قرا تگین - لیڈن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بابر اس موقع پر کاشغر کے پہاڑوں میں سے ہوتا الاتاغ پہاڑوں کے مشرق میں گیا ہوگا۔ یہ پہاڑ کاشغر اور مغلستان کو اوش اور کاشان، وغیرہ سے جدا کرتے ہیں [4] لیڈن نے نوٹ میں تو الائی لکھا ہے۔
[5] لیڈن نے صرف سرہ تاق لکھا ہے۔ ایانی نہیں لکھا۔

شیر علی کی بے وفائی | جب ہم کھمرود کی گھاٹی میں پہنچے تو شیر علی، چہرہ، ولی کے پاس چلا گیا۔ جو خسرو شاہ کا بھائی تھا۔

توبچ بیگ نے بھی آنکھیں پھیرلیں | دوسرے دن توبچ بیگ بھی الگ ہو گیا۔ اور حصار چلا گیا۔

خوفناک گھاٹیاں | کھمرود[1] کے درے میں پہنچ کر ہم اوپر کی طرف چلے[2]۔ ان تنگ راستوں بے ڈھب کھڈوں اور نہایت خوفناک گھاٹیوں میں ہمارے بہت سے اونٹ اور گھوڑے اتنے تھک گئے کہ چلنے کے قابل نہ رہے۔

تین چار منزلیں طے کرنے کے بعد ہم سرہ تاق کی گھاٹی میں پہنچے۔ وہ گھاٹی کس بلا کی گھاٹی ہے۔ میں نے کبھی ایسی ڈھلوان اور تنگ گھاٹی نہیں دیکھی۔ اور کبھی ایسے تنگ راستوں اور بے ڈھب کھڈوں میں چلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

بڑی مصیبت سے ان خطرناک گھاٹیوں اور کھڈوں سے نکلے اور اونچی اونچی تنگ اور خطرناک چوٹیاں طے کرنے میں بڑی تکلیف اٹھائی اور بڑی مشکل سے فان پہنچے۔

خوبصورت جھیل | فان کے پہاڑوں میں ایک بہت بڑی جھیل ہے اور بہت خوبصورت ہے وہ اندازاً میل بھر میں پھیلی ہوتی ہے۔

قلعہ شیراز | وہیں خبر ملی کہ ابراہیم ترخان قلعہ شیراز میں ہے اور اس نے قلعے کو بہت مضبوط کر لیا ہے

قنبر اور ابو القاسم | یار ییلاق میں جو قلعے تھے۔ قنبر علی اور ابو القاسم کوہ برنے انھیں ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا اور وہاں جمے بیٹھے تھے۔

اس سے پہلے وہ خواجہ دیدار میں تھے۔ جب ازبکوں نے سمرقند فتح کر لیا تو وہ خواجہ دیدار میں نہ ٹھہر سکے اور یار ییلاق چلے گئے۔

فان کا والی | میں نے فان کو سیدھے ہاتھ کی طرف چھوڑا۔ اور کسود[3] کا رخ کیا فان کا جو ملک

---

[1] کھمرود کا پہاڑ ملک حصار کے نیچے کی طرف سے ہو کر قرتاق تک پہنچا ہے۔ جہاں قراتاق کے پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ بابر غالباً ان پہاڑوں میں سے ہو کر چشمہ کوہک کے قریب دریا یار ییلاق کے کنارے پہنچا۔ [2] کھمرود کے درے میں ہم دریا کے اوپر چلے [3] لیڈن نے کستر اور مٹکاف نے کشتر لکھا ہے فارسی نسخے میں کسود اور کبود لکھا ہے۔

تھا وہ بہت مہمان نواز۔ سخی۔ خدمت گذار اور انسان دوست مشہور تھا۔

جب سلطان حسین مرزا نے حصار چھینا۔ اس وقت سلطان مسعود مرزا اسی راستے سے اپنے چھوٹے بھائی بالسنغر مرزا کے پاس سمرقند گیا تھا۔ ملک قان نے ستر اسی گھوڑے اس کی نذر کئے اور بڑی خاطر و مدارات کی۔ میرے لئے اس نے ایک مریل سا گھوڑا بھیج دیا۔ خود نہ آیا۔

خدا کی قدرت ہے۔ جب ہم پر وقت پڑا تو جو لوگ سخی مشہور تھے وہ خسیس ہو گئے اور جو با مروت تھے وہ مروت بھول گئے۔

خسرو شاہ کی بے رخی | خسرو شاہ بہت سخی اور رحم دل مشہور تھا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اس نے بدیع الزماں مرزا پر بہت عنایتیں کیں اور باقی ترخان وغیرہ کے ساتھ بھی بڑی ہمدردی سے پیش آیا اور سب کو بہت کچھ دیا۔ لیکن دو دفعہ ہم اس کے ملک سے گذرے۔ رتبہ کا لحاظ تو ایک طرف، جو برتاؤ ہمارے ادنیٰ ملازمین کے ساتھ کرنا چاہیئے تھا وہ بھی ہمارے ساتھ نہ کیا۔ اور ہمیں ہمارے نوکروں کے برابر بھی نہ سمجھا۔

کسود پر حملہ | کسود کے قلعے کے بارے میں گمان تھا کہ شاید وہاں ازبک ہوں گے۔ اس لئے قان سے نکلنے کے بعد کہیں دم نہ لیا۔ اور قلعہ کسود کو جا گھیرا۔ لیکن قلعہ پہلے ہی سے ویران تھا اور وہاں مدت سے کوئی نہ تھا۔

دریائے کوہک | وہاں سے ہم دریائے کوہک گئے اور اس کے کنارے جا اترے اور پاری کے موڑ پر پل کے ذریعے کوہک کو پار کیا۔

رباط خواجہ پر حملہ | قاسم بیگ کے تحت بعض امراء کو قلعہ رباط خواجہ کی طرف بھیجا تاکہ دھوکے سے اسے فتح کر لیں۔

ہم پاری اور کوہ شنقار خانہ[1] کو پار کر کے یار ییلاق پہنچے۔

---

[1] یا قدار خانہ

رباط خواجہ کی طرف جو سردار بھیجے گئے تھے وہ جب فصیل کے نیچے پہنچے تو سیڑھیاں لگاتے وقت یا تو وہ لوگ خود ہی سمجھ گئے یا انھیں سمجھایا گیا کہ قلعہ فتح ہونا مشکل ہے۔ اس لئے وہ اُلٹے پھر آئے۔

بیگانے امرار کا خلوص | قنبر علی سنگ تراش[1] تھا۔ وہ آ کر ہم سے ملا۔ ابوالقاسم کوہ بر اور ابراہیم ترخان نے بھی چند معتبر ملازم ہماری خدمت میں بھیجے اور خلوص کا اظہار کیا۔

قلعہ اسفندک | یار ییلاق کے گاؤں سے ہم اسفندک کے قلعے پہنچے۔ شیبانی خاں اس وقت خواجہ دیدار کے قریب پڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین چار ہزار ازبک تھے اور اتنی ہی فوج وہ جمع ہو گئی تھی جو مختلف مقامات کی تھی۔

خان وفا مرزا | اس نے خان[2] وفا مرزا کو سمرقند کا داروغہ بنا دیا تھا۔ اور وہ پانچ چھ سو آدمیوں کے ساتھ سمرقند پر قبضہ کئے پڑا تھا۔

حمزہ سلطان اور مہدی سلطان اپنی اپنی فوجیں لئے ہوئے سمرقند کے قریب قوردغ بدنہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔

سمرقند پر دھاوا | میرے پاس اچھے بُرے کل دو سو چالیس آدمی تھے۔ تمام سرداروں اور امیروں سے مشورہ کیا۔ اور یہ بات طے پائی کہ شیبانی نے سمرقند ابھی لیا ہے۔ اس لئے ہم کوشش کریں تو کامیابی کی امید ہے۔

ہم شہر پناہ پر چپکے چپکے سیڑھیاں لگا کر اور پر جا چڑھیں اور قبضہ کر لیں تو سمرقندی چوں کہ ہم ہی میں سے ہیں اس لئے سوائے ہماری مدد کے اور کیا کریں گے۔ اس کے برعکس وہ ازبکوں کے لئے ہم سے لڑیں یہ ممکن نہیں۔

سمرقند ہاتھ آ جائے۔ تو وہ ہو گا جو خدا کو منظور ہو۔

اس مشورے کے تحت ظہر کی نماز کے بعد ہم بار ییلاق سے چل پڑے۔ رات کا پہلا

[1] لیڈن نے سنگ تراش اور سنگ راند دو نام لکھے ہیں۔ [2] جان وفا مرزا

حصہ سو میں طے ہوا۔ اور آدھی رات تھی جو یورت خاں جا پہنچے۔

ناکامی اور واپسی | یہ سنا کہ شہر کے لوگ ہوشیار ہیں اس لئے رات کو شہر کے پاس نہ پھٹکے الٹے پیروں یورت خاں واپس آ گئے۔

صبح ہو چکی تھی کہ خواجہ رباط سے تیجے کی طرف کوہک دریا سے پار ہوئے۔ اور پھر یار ییلاق پہنچے۔

چتنے منہ اتنی بولیاں | ایک دن اسفندک کے قلعے میں میرے پاس مصاحب جمع تھے۔ ان میں دوست ناصر۔ تو بان کوکلتاش۔ قاسم کوکلتاش۔ خان قلی کریم داد۔ شیخ درویش۔ خسرو کوکلتاش اور میرم ناصر وغیرہ سب ہی موجود تھے ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا بتاؤ ہم خدا کے فضل سے سمرقند کب تک لے لیں گے؟

بعض نے کہا موسم بہار میں (اس وقت ساون کا مہینہ تھا) کسی نے کہا مہینہ بھر میں۔ کسی نے کہا چالیس دن میں لیکن تو بان کوکلتاش نے کہا چودہ دن میں خدا نے اسی کا کہا پورا کیا اور ہم نے چودہ ہی دن میں سمرقند فتح کر لیا۔

خواجہ عبید اللہ کی بشارت | ان ہی دنوں میں عجیب خواب دیکھا۔ کہ حضرت خواجہ عبید اللہ تشریف لائے ہیں۔ میں ان کے استقبال کے لئے اٹھا۔ خواجہ صاحب آ کے بیٹھے۔ ان کے سامنے دستر خوان بچھایا گیا۔ لیکن وہ پر تکلف نہ تھا۔ اس لئے شاید حضرت کے دل میں کچھ خیال آیا۔ ملا بابا نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ میں نے بھی اشارے ہی میں جواب دیا۔ کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ قصور ہے تو دستر خوان بچھانے والے کا ہے۔ خواجہ صاحب سمجھ گئے۔ اور عذر قبول فرمالیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں پہنچانے کے واسطے ساتھ ہو لیا۔ حضرت نے اسی مکان کے دالان میں میرے سیدھے یا الٹے بازو کو پکڑ کر اس طرح اٹھایا کہ میرا ایک پاؤں زمین سے اونچا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت نے ترکی میں فرمایا۔ "تمہارا شیخ تمہیں مشورہ دیتا ہے" اس کے چند ہی روز بعد میں نے

سمرقند فتح کر لیا۔

قلعہ وسمند | دو ایک دن بعد اسفنداک کے قلعے سے وسمند کے قلعے میں چلے گئے۔

اس سے پہلے ایک دفعہ سمرقند تک پہنچ کر اور دشمن کو ہوشیار کر کے ناکام لوٹ چکے تھے۔ پھر بھی خدا پر بھروسہ کر کے چلے۔ اور ظہر کی نماز کے بعد وسمند سے سمرقند کی طرف روانگی ہوئی۔ خواجہ ابوالمکارم بھی میرے ساتھ تھا۔

فیروزہ دروازہ | آدھی رات کے بعد ہم خیاوان[1] پہنچے۔ اور پل مغاک گئے۔

میں نے ستر اسی آدمیوں کو سیڑھیاں دے کر آگے بھیجا کہ غار عاشقاں کے سامنے سیڑھیاں لگا کر چڑھ جائیں اور فیروزہ دروازے میں جو دشمن موجود ہوں ان سے دروازہ چھین کر ہمیں خبر بھیجیں۔

خاموش حملہ | وہ لوگ غار عاشقاں کے سامنے سیڑھیاں لگا کر اس طرح چڑھ گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہاں سے وہ فیروزہ دروازے میں جا دھمکے۔

فاضل ترخان | وہاں فاضل ترخان تعینات تھا۔

فاضل ترخان، ترخانی سرداروں میں سے نہیں تھا۔ بلکہ وہ ترکستان کے ترخانی سوداگروں میں سے تھا۔ اس نے ترکستان میں شیبانی خاں کی خدمت کی اور ذی رتبہ بن گیا۔

ہمارے آدمی فاضل ترخان پر ٹوٹ پڑے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے نوکر بھی مارے گئے۔

سمرقند میں داخلہ | انہوں نے دروازے میں جو قفل پڑا ہوا تھا۔ اسے کلہاڑی سے توڑ ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔

ان کے وہاں پہنچتے ہی میں بھی فیروزہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

مددگاروں نے ساتھ دیا | ابوالقاسم کوہ برخود نہیں آیا تھا۔ لیکن اپنے چھوٹے بھائی احمد قاسم کو تیس چالیس آدمیوں کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

---

[1] لیڈن نے متن میں خیاراں اور نوٹ میں خیابان لکھا ہے یہ گاؤں پل مغاک کے پاس ہے۔

ابراہیم ترخان کا کوئی آدمی نہ تھا۔ لیکن شہر میں پہنچ جانے اور خانقاہ میں ٹھہر جانے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی احمد ترخان چند آدمیوں کے ساتھ آ پہنچا۔

سمرقند کے دوکان داروں کی مبارکباد | شہر والے سوئے پڑے تھے۔ لیکن دکان داروں نے اپنی اپنی دکانوں میں سے ہمیں دیکھا اور پہچاننے کے بعد دعائیں دینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد تمام اہل شہر کو خبر ہو گئی۔ ہمارے ساتھیوں اور شہریوں کو بے انتہا خوشی ہوئی[1]

ازبکوں کا قتل عام | لوگوں نے گلی کوچوں میں ازبکوں کو اس طرح پتھروں اور لکڑیوں سے مار ڈالا۔ جس طرح دیوانے کتوں کو مار ڈالتے ہیں۔ تقریباً چار پانچ سو ازبک اسی طرح مارے گئے

جان وفائی کا فرار | جان وفائی ایرکین شہر کا حاکم تھا اور خواجہ یحییٰ کے مکان میں ٹھیرا ہوا تھا وہ بھاگا اور شیبانی خاں کے پاس جا کے دم لیا۔

شہریوں کی سوغات | میں دروازے میں گھستے ہی مدرسے اور خانقاہ میں گیا اور خانقاہ کی محراب میں ٹھیرا۔

صبح ہوتے ہی چاروں طرف غُل مچ گیا۔ شہر کے جن معززین اور دکانداروں کو خبر ہوئی وہ خوشی خوشی مبارکباد دینے آئے۔ اور کھانے پینے کی جو چیزیں موجود تھیں وہ ساتھ لائے اور دعائیں دینے لگے۔

دشمن جم کر لڑنے لگے | صبح خبر ملی۔ کہ ازبکوں نے آہنی دروازے پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ وہاں جم کر لڑ رہے ہیں۔ میں اسی وقت سوار ہو کر وہاں گیا۔

میرے ساتھ کوئی پندرہ بیس آدمی ہوں گے۔ لیکن شہر کے ان لفنگوں نے جو ازبکوں کو کونے کونے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی انھیں آہنی دروازے سے باہر نکال دیا۔

---

[1] جان لیڈن کے ہاں یہ عبارت بھی ہے کہ شہری بہت خوش ہوئے اور انھوں نے میرے آدمیوں کو بڑی گرم جوشی سے مبارکباد دی۔

چین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد)

چین میں مسلمانوں کی تعداد کے متعلق مختلف ذرائع سے جو اعداد و شمار سامنے آتے رہتے ہیں ان میں بہت زیادہ اختلاف موجود ہے۔ بعض چینیوں نے خود اپنی تحریرات میں چین کے مسلمانوں کی تعداد کو ۵ کروڑ تک بیان کیا ہے اور یورپی محققین بھی عموماً اس بیان کو صحیح تسلیم کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ ڈاکٹر ذکی علی نے انہیں کے حوالہ سے اپنی کتاب "اسلام ان دی ورلڈ" میں چین کے مسلمانوں کی تعداد کو ۵ کروڑ بتایا ہے لیکن چین کی عوامی حکومت کی جانب سے وہاں کے مسلمانوں کے حالات سے متعلق جو کتابچہ شائع ہوا ہے اس میں مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ قرار دی گئی ہے۔

یہاں چونکہ چین کی مسلم آبادی کے اعداد و شمار کی تحقیقات مقصود نہیں بلکہ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مشرق کے اس عظیم اور تاریخی ملک میں مسلمان کب اور کس طرح پہونچے تھے اور اب تک وہ وہاں کس طرح زندگی بسر کرتے رہے ہیں اس لئے آبادی کے اعداد و شمار کے متعلق صرف اسی قدر کہدینا کافی ہوگا کہ جس زمانہ میں چین کے مسلمانوں کی آبادی کا مذکورہ بالا اندازہ لگایا گیا تھا اس وقت سے اب تک ایک طرف تو کئی مرتبہ چینی مسلمانوں کو قتل عام کا سامنا کرنا پڑا ہے اور چین کی پرانی سرحدوں میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں پھر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں نہ تو مردم شماری کو آج جیسی اہمیت ہی حاصل تھی اور نہ ایسے ذرائع اور وسائل ہی موجود تھے جن کی بدولت حاصل شدہ اعداد و شمار کو قطعی طور پر قابل اعتماد کہا جا سکے اس لئے آبادی کے اعداد و شمار کے موجودہ فرق کی صحت یا عدم صحت کی بحث میں پڑنے کی بجائے ہمیں صرف اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ چین میں مسلمان کب اور کس طرح پہونچے تھے ان کے حالات کیا رہے ہیں اور آج وہ کن حالات میں زندگی گذار رہے ہیں۔

رسول اللہؐ کا یہ ارشاد کہ "علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ملے" ایک مقولہ بن گیا ہے اور اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرب کے باشندے آج سے چودہ سو سال قبل بھی مشرق بعید کے اس عظیم ملک سے اچھی طرح واقف تھے اور اس حقیقت کے پیش نظر جب عرب اور چین کے تعلقات کی تحقیقات کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان زمانہ قدیم ہی سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور جب عرب میں اسلام کا ظہور ہوا تو انہیں تجارتی تعلقات کی بدولت مسلمان چین میں پہونچے۔

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی محققانہ تالیف "پریچنگ آف اسلام" میں جرمن محقق بریخ نائڈر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ — چینی سلاطین کے خاندان آنگ کے دورِ حکومت (۶۱۸ء-۹۰۷ء) کے ابتدائی حصہ میں پہلی بار مسلمان چین کے شہر کینٹن میں پہونچے تھے۔ یہ اجنبی خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے اور ان کی عبادت گاہوں میں مورتیاں نہیں ہوتی تھیں وہ شراب اور سور کا گوشت استعمال نہیں کرتے تھے اور جس جانور کو خود ذبح نہیں کرتے تھے اُسے ناپاک سمجھتے تھے اور انہیں آجکل ہوئی ہوئی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے" اس کے بعد یہی مورخ لکھتا ہے کہ ۔ "اگرچہ کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چین میں اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ سے پہونچا تھا"

بریخ نائڈر کے مذکورہ بالا بیان کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی لیکن چین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی جو قابل اعتماد یادداشتیں موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چین اور مسلمانوں کے مابین اس سے بھی پہلے سفارتی تعلقات قائم تھے اور ایران کے آخری ساسانی فرمانروا یزدگرد کی شکست کے بعد اس کے فرزند فیروز نے سلطان چین سے فوجی امداد دینے کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں اس نے چین اور ایران کے درمیان طویل فاصلہ کا عذر کرکے فوجی امداد دینے سے تو معذوری کا اظہار کیا تھا لیکن دربارِ خلافت میں ایرانی شہزادہ کی سفارش کے لئے ایک سفیر ضرور بھیجا تھا جو خلیفہ سوم حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دورِ خلافت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا تھا اور جب وہ واپس ہوا تھا تو حضرت عثمانؓ نے اس کے ساتھ ایک مسلم جنرل کو چین بھیجا تھا اور چین کے دربار میں اس کا استقبال کیا گیا تھا۔

ولید کے زمانہ حکومت میں (۷۰۵ء-۷۱۵ء) میں جب مشہور مسلمان سپہ سالار قتیبہ بن مسلم وسطی ایشیا

کو فتح کرتے ہوئے چین کی سرحد تک پہنچ گئے تھے تو انھوں نے شہنشاہ چین کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تھا اور شہنشاہ چین نے اُسے بہت سے تحفے دے کر واپس کیا تھا اور چینی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۷۲۶ء میں خلیفہ ہشام نے سلیمان کو اپنا سفیر بنا کر شہنشاہ چین سوان سونگ کے دربار میں بھیجا تھا اور ۷۵۶ء میں جب سوان سونگ کے خلاف بغاوت برپا ہوئی تھی اور اُسے اپنے لڑکے سوسونگ کے حق میں دست بردار ہو جانا پڑا تھا تو اس کی درخواست پر عباسی خلیفہ منصور نے اس کی امداد کے لئے عربوں کی ایک فوج بھیجی تھی اور اسی کی بدولت سوانگ سونگ نے باغیوں کو شکست دی تھی مگر یہ عرب سپاہی اپنے وطن واپس جانے کی بجائے چین ہی میں آباد ہو گئے تھے اور وہیں شادیاں بھی کر لی تھیں۔

چین میں مسلمانوں کے پہونچنے کے دو دور رہے ہیں اور چینی نیز عرب واقعات نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق پہلا دور آٹھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مسلمانوں کے پہونچنے کا دوسرا دور تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مغلوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ شروع ہوا تھا۔ چنگیز خاں نے اسلامی ریاستوں کو جس طرح تباہ و برباد کیا تھا وہ تاریخ کا ایک المناک ترین حادثہ ہے اور اس کا اندازہ ایک ہی واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ چنگیز خاں کے حملہ سے پہلے ہرات کے خوبصورت شہر کی آبادی ایک لاکھ تھی لیکن مغل فوج جب اس شہر کو برباد کر کے واپس گئی تو اس کی بربادی کو دیکھنے کے لئے صرف چالیس آدمی باقی رہے تھے۔

چنگیز خاں کی موت کے بعد جب اس کی وسیع سلطنت اس کے چار بیٹوں کے درمیان تقسیم ہوئی تو سلطنت کا مشرقی علاقہ اس کے تیسرے لڑکے اگوتے کے حصہ میں آیا اور اُس نے اپنے لئے خاقان کا لقب اختیار کیا اور اُس کے بعد قبلی خاں نے چین کو فتح کر کے اسی علاقہ میں شامل کر لیا۔ رشید الدین نے اپنی کتاب جامع التواریخ میں لکھا ہے کہ "تیمور خاں کے دورِ حکومت (۱۳۲۳-۲۸ء) میں اسی قبلی خاں کے پوتے آنند نے جو اس زمانہ میں کانسو کا گورنر تھا اسلام قبول کر لیا تھا اور اُس کی کوششوں سے تنگت کے بہت سے باشندے نیز اُس کے ماتحت رہنے والے بہت سے فوجی سپاہی بھی مسلمان ہو گئے تھے" اور منتخب التواریخ کے مرتب کا بیان ہے کہ "آنند نے خان بالغ (موجودہ پیکین) میں چار ایسی مسجدیں تعمیر کرائی تھیں جن میں

جمعہ کو دس لاکھ افراد نماز پڑھ سکتے تھے" لیکن بعض اسباب کی بنا پر منتخب التواریخ کے مذکورہ بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں میں سب سے پہلے برقا خاں نے اسلام قبول کیا تھا اور مورخ جرجانی نے طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ "اُس نے پہلے اپنے بھائی کو دعوتِ اسلام دی تھی اور بعد میں اپنے مسلمان ہوجانے کا اعلان کر دیا تھا حتیٰ کہ اس کی تمام فوج نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔"

بہرحال جب تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے چین پر لشکر کشی کی تو اُن کے ساتھ بہت سے عرب ایرانی اور ترک مسلمان بھی چین آئے اور اُن میں سے بیشتر نے چین ہی کو اپنا وطن بنا لیا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ وہ چینیوں ہی میں مدغم ہو گئے۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں مسلمان ریاست کے بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز تھے۔ چنانچہ سر ایچ ایچ۔ ہورتھ نے "ہسٹری آف مغلز" میں لکھا ہے کہ "۱۲۴۴ء میں عبدالرحمٰن کو شاہی شعبۂ مالیات کا صدر مقرر کیا گیا تھا اور چین کے باشندوں پر ٹیکس مقرر کرنے کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔" اور آر ڈی ایم۔ ایم کے بیان کے مطابق جو چینی یادداشتوں پر مبنی ہے "قبلی خاں نے ۱۲۵۹ء میں تخت نشین ہونے کے بعد بخارا کے ایک باشندہ عمر شمس الدین کو جو چین میں سید اجل کے نام سے موسوم تھا پہلے تو شاہی مالیات کے محکمہ کا منتظم مقرر کیا تھا اور جب ین نان فتح ہو گیا تو اسے اس صوبہ کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ مارشل بردم ہال نے اپنی کتاب "اسلام ان چائنا" میں لکھا ہے کہ "سید اجل کا انتقال ۱۲۷۹ء میں ہوا تھا۔ اُسے ایک روشن خیال اور انصاف پسند منتظم سمجھا جاتا تھا اور اُس نے شہر ین نان میں مسجدوں کے ساتھ کنفیوشش کے ماننے والوں کے لئے عبادت گاہیں بھی تعمیر کرائی تھیں۔"

فرانسیسی محقق مسٹر ڈی اولون نے لکھا ہے کہ "سید اجل کی اولاد نے چین میں اسلام کے قیام کے سلسلہ میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ اُس کے ایک پوتے نے ۱۳۳۵ء میں شہنشاہ سے اس بات کی تصدیق حاصل کی تھی کہ "اسلام سچا اور پاک مذہب ہے" اور اسی خاندان کے ایک دوسرے فرد نے ۱۴۲۲ء میں شہنشاہ سے

دونوں دارالحکومتوں، سن گن فو اور نان کن میں مسجدیں تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کی تھی۔

قبلی خاں مارکو پولو پر بہت زیادہ مہربان تھا اور وہ ۱۲۷۵ء سے ۱۲۹۲ء تک چین ہی میں رہا تھا اُس نے اپنے سفرنامہ میں چین کے صوبہ ین نان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے جامع التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ین نان کے دارالحکومت تانی فو کے تمام باشندے مسلمان تھے اور اسی صدی کے وسط میں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ نے چین کے ساحلی شہروں کی سیاحت کی تھی تو ہر جگہ مسلمانوں کی طرف سے اس کا استقبال کیا گیا تھا۔ چنانچہ جامع التواریخ کے مرتب رشیدالدین نے ابن بطوطہ کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ "ہر شہر میں مسلمانوں کی رہائش کے لئے علیحدہ جگہ مخصوص ہے۔ ان محلوں میں مساجد موجود ہیں اور چینی، مسلمانوں کی عزت اور احترام کرتے ہیں۔"

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب چین میں مغل سلطنت کا زوال ہوا اور انہیں اس ملک سے واپس آنا پڑا تو ایک جانب تو چین میں مسلمانوں کے پہونچنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دوسری طرف چونکہ چین کی حکومت بیرونی دنیا سے بالکل علیحدہ رہنے کی حکمت عملی پر کاربند رہی اس لئے دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ چین کے مسلمانوں کا کوئی تعلق بھی باقی نہ رہ سکا لیکن مغلوں کے زوال کے بعد چین میں جب منگ خاندان حکمراں ہوا تو اُس نے داخلی طور پر مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف اچھا سلوک ہی کیا بلکہ اس خاندان کے حکمرانوں نے اپنی مغربی سرحد کے پار تیموری خاندان کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی قائم رکھے۔ چنانچہ اس خاندان کے بانی ہونگ وو کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو بہت سی مراعات حاصل تھیں اور اسی زمانہ میں بہت سی مسجدیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔

انہیں سفارتی تعلقات کی بدولت ایک مرتبہ جب ایک چینی سفارت ۱۴۱۲ء میں سمرقند میں شاہ رُخ بہادر کے دربار میں حاضر ہوئی تو اُس کے ذریعہ سے شاہ رُخ بہادر نے شہنشاہ چین کو دو تبلیغی مکتوب بھجوا کر اسے اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی تھی۔ ان میں سے ایک خط عربی اور دوسرا فارسی زبان میں تھا عبدالرزاق سمرقندی نے "مطلع السعدین" میں ان دونوں خطوط کو نقل کیا ہے اور جرمن محقق زنیکر نے لکھا ہے کہ "یہ بات ناقابلِ قیاس نہیں کہ انہیں خطوط کی بدولت جیسا کہ مشہور ہے چین کے ایک شہنشاہ نے اسلام قبول

کر لیا تھا"۔ ایک دوسرے جرمن محقق شیفر اور خود زینکر نے ایک مسلمان تاجر سید علی اکبر کے حوالے سے جو پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر اور سولہویں صدی کے آغاز میں پکین میں مقیم تھا۔ لکھا ہے کہ "چین میں بہت سے مسلمان آباد ہو گئے تھے لیکن یان فو میں مسلمانوں کے تیس ہزار خاندان آباد تھے۔ وہ کسی قسم کا ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے انہیں شہنشاہ کی حمایت حاصل تھی اور وہ ان مسلمانوں کو زمین مفت دیتا تھا، انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی چینی، مسلمانوں کے مذہب کا احترام کرتے تھے۔ تبدیلی مذہب پر کوئی پابندی نہیں تھی، دارالسلطنت میں چار عظیم الشان مساجد موجود تھیں اور سلطنت کے دوسرے صوبوں میں مساجد کی مجموعی تعداد ۹۰ تھی۔ یہ سب مساجد شاہی خزانہ سے تعمیر کرائی گئی تھیں"۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں مانچو خاندان کے برسر اقتدار آنے تک حکومت اور چینی مسلمانوں کے تعلقات بے حد خوشگوار رہے تھے، کانسو کے مسلمانوں نے پہلی بار ۱۶۴۸ء میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے اور اس قسم کے واقعات کا سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں چین کے دوسرے باشندے مسلمانوں کے خلاف تعصب اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے اور اس قیاس کی تائید شہنشاہ اونگ چین کے اس فرمان سے ہوتی ہے جو اس نے ۱۷۳۱ء میں جاری کیا تھا۔

اس فرمان سے ایک جانب تو سرکاری طور پر چینی مسلمانوں کے طرز عمل کی تصدیق ہوتی ہے اور دوسری طرف اس سے اس وقت کی چینی حکومت یا کم از کم حکمراں کی وسعت نظر اور معاملہ فہمی پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لئے یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

شہنشاہ اونگ چین کا فرمان یہ ہے کہ "کئی صدیوں سے سلطنت کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کی ایک معقول تعداد آباد ہے۔ مسلمان بھی میری کل رعایا کا ایک حصہ ہیں اور میں انہیں بھی دوسروں کی طرح اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ مجھے بعض افسروں کی طرف سے خفیہ طور پر مسلمانوں کے خلاف یہ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ ان کا مذہب چینیوں کے مذہب سے مختلف ہے وہ چینی زبان نہیں بولتے، وہ دوسروں سے مختلف لباس پہنتے ہیں، انہیں نافرمان، بددماغ اور باغیانہ

رجحانات کا حامل قرار دیا گیا تھا اور اُن کے خلاف سخت اقدامات کی درخواست کی گئی تھی۔ ان شکایات اور الزامات کی تحقیقات کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چینی مسلمان جس مذہب کو مانتے ہیں وہ اُن کا آبائی مذہب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی زبان دوسرے چینیوں کی زبان سے مختلف ہے۔ لیکن چین میں تو بہت زبانیں بولی جاتی ہیں۔ رہا اُن کی عبادت گاہوں، لباس اور رسم خط کا معاملہ، بیشک یہ سب بھی چینیوں سے مختلف ہیں لیکن یہ معاملہ بالکل غیر اہم ہے اور یہ باتیں رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہیں۔ میری دوسری رعایا کی طرح مسلمان بھی خوش کردار واقع ہوئے ہیں اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ وہ بغاوت برپا کرنی چاہتے ہیں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ انہیں انکے مذہب پر عمل کرنیکے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اُن کے مذہب کی تعلیم کا مقصد لوگوں کو خلاقی اختیار سے اچھی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا اور انہیں سماجی اور شہری زندگی کے فرائض کی ادائیگی پر توجہ دلانا ہے۔ ان کا مذہب حکومت کی بنیاد کا احترام کرتا ہے اور ہم اُن سے اس سے زیادہ کیا چاہتے ہیں اگر مسلمان اسی طرح خوش اطوار اور وفادار رہیں گے تو وہ بھی میرے دوسرے بچوں کی طرح میری عنایات کے مورد قرار پائیں گے۔ بہت سے مسلمان بڑے بڑے فوجی اور انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں اور یہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ اُنھوں نے ہماری عادات اور رسم و رواج کو اپنا لیا ہے اور وہ ہماری مقدس کتابوں کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی ادب میں امتحانات پاس کرتے ہیں اور قانون کے مطابق قربانیاں دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ عظیم چینی خاندان کے ایک سچے رکن ہیں اور ہمیشہ اپنے مذہبی، شہری اور سیاسی فرائض کو انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ججوں کے روبرو کوئی مقدمہ پیش ہو تو انہیں فریقین مقدمہ کے مذہب کو مدنظر نہیں رکھنا چاہیئے۔ میری رعایا کے لئے صرف ایک ہی قانون ہے۔ جو لوگ اچھے کام کرینگے انہیں اُن کا اجر نیک ملے گا اور بدوں کو سزا دی جائے گی۔"

بروم ہال کے بیان کے مطابق تقریباً تیس سال کے بعد اونگ چین کے جانشین شہنشاہ این لنگ نے دو ایسے مسلمان ترک سرداروں کے لئے جنھوں نے سلطنت کے شمالی مغربی علاقوں اور کاشغر میں سلطنت کے باغیوں کی سرکوبی کی تھی، پیکن میں دو عظیم الشان محل بنوا کر ان کی عزت افزائی کی تھی اور یہی

حکمراں نے ان ترک سرداروں کے لئے جو وقتاً فوقتاً دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے نیز ان مسلمان اسیران جنگ کے لئے جو کاشغر سے لائے گئے تھے پیکن میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر ۶۴-۱۷۶۳ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس پر جو کتبہ لگایا گیا تھا وہ چار زبانوں میں تھا اور چینی زبان کا کتبہ خود شہنشاہ نے لکھا تھا۔

پروفیسر آرنلڈ نے ڈی ویرسان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "۱۷۶۰ء میں زنگاریا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد اسی شہنشاہ نے چین کے دوسرے حصوں سے وہاں آباد کرنے کے لئے دس ہزار فوجی نوآباد بھیجے تھے جن کے ساتھ اُن کے اہل وعیال اور دوسرے لوگ بھی زنگاریا چلے گئے تھے اور ان سب نے گرد و نواح کے باشندوں کا مذہب (اسلام) قبول کر لیا تھا"

اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ چین کے دوسرے صوبوں میں بھی تبدیل مذہب کے ایسے ہی واقعات رونما ہوئے تھے لیکن چین کے ہر حصہ میں مسلمانوں کی موجودگی کے پیش نظر قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ کثیر تعداد صرف غیر ملکی مسلمانوں کے چین میں رہائش اختیار کر لینے ہی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ چین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی میں اُن کی خاموش تبلیغی کوششوں کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ اور کلارک ایبل نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بیشتر چینی یہودیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا"

چینی مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں پر اس عرضداشت سے بھی روشنی پڑتی ہے جو صوبہ کوانگسی کے گورنر نے ۱۷۸۲ء میں شہنشاہ این لنگ کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ ڈی۔ ویرسان نے اس عرضداشت کو نقل کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "صوبہ کوانگسی کے ایک باشندہ ہان۔ فو۔ ین کو آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ تحقیقات کے دوران میں جب اس کے پیشے کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُس نے بتایا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی غرض سے گذشتہ دس سال سے سلطنت کے مختلف حصوں میں گشت کرتا رہا ہے۔ اس کے صندوق میں سے تیس کتابیں برآمد ہوئی ہیں جن میں سے کچھ اس نے خود لکھی ہیں اور کچھ ایک ایسی زبان میں ہیں جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ ان کتابوں میں مغرب کے

ایک بادشاہ محمد (صلعم) کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہے جب ہان۔ فورین پر زیادہ سختی کی گئی تو اُس نے اس بات کا اقرار کیا کہ اس کا مقصد اس مذہب کی تبلیغ ہے جس کا ذکر ان کتابوں میں کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ صوبہ شینسی میں بہت مُدت تک مقیم رہا ہے"

چینی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ وہ قحط زدہ چینیوں کے بچوں کو خرید کر انہیں پرورش کر لیا کرتے تھے۔ پروفیسر ڈوہالڈے نے لکھا ہے کہ "ایک ایسے قحط کے زمانہ میں جس نے صوبہ چین ٹانگ کو تباہ کر دیا تھا مسلمانوں نے دس ہزار بچے خریدے تھے۔ مسلمان ایسے بچوں کی شادیاں کرتے ہیں اور ان کے لئے یا تو مکانات تعمیر کرا دیتے ہیں یا خرید کر انہیں آباد کر دیتے ہیں" جان اینڈرسن نے اپنے ایک مقالہ "چینی مسلمان" میں لکھا ہے کہ "۱۷۹۰ء میں جب صوبہ کوانگ ٹنگ میں تباہ کن قحط پڑا تھا تو مسلمانوں نے دس ہزار بچے خریدے تھے اور ان سب کی پرورش مسلمانوں کی طرح کی گئی تھی" اور ایک چینی مسلمان سید سلیمان کے بیان کے مطابق جو انھوں نے ۱۸۹۴ء میں قاہرہ میں ایک عربی رسالہ کے نمائندہ کے بعض سوالات کے جواب میں دیا تھا" ان چینی مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو مذکورہ بالا طریقہ سے اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے ہیں"

چین کے مختلف صوبوں کے بعض شہروں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن دوسرے شہروں میں ان کے جداگانہ محلّے موجود ہیں اور بروم ہال کا بیان ہے کہ "جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے انہیں ان محلوں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی" اس کے باوجود وہ دوسرے چینیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ ان کا لباس اور تمدن بھی عام چینیوں ہی کی طرح ہے حتیٰ کہ چینی مسلمانوں کی مسجدوں کا طرز تعمیر بھی دوسرے فرقوں کی عبادت گاہوں کے طرز تعمیر سے مختلف نہیں۔ بروم ہال کا بیان ہے کہ "ہر مسجد میں شہنشاہ کے لئے دعائیہ جملوں پر مشتمل ایک کتبہ بھی لگا رہتا ہے اور چینی مسلمان جب مسجد میں جاتے ہیں تو قانوناً انہیں سر جھکا کر اس کتبہ کی تعظیم کرنی پڑتی ہے" لیکن اب جبکہ چین میں نہ صرف شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ ایک ایسی حکومت بھی قائم ہو چکی ہے جو لوگوں کے مذاہب اور رسم و رواج میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی وہاں کی مساجد میں

شاید تاریخی دستاویزات کے طور پر مذکورہ بالا کتبے تو موجود ہونگے لیکن اب مسلمان اُن کی تعظیم میں سر نہیں جھکاتے

چینی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر چین کے حکمران بھی مسلمانوں کے ساتھ حُسن سلوک روا رکھتے رہے ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کو دوسرے باشندوں کی طرح پورے شہری حقوق حاصل رہے ہیں۔ انہیں ریاست کے بڑے سے بڑے منصب پر مامور کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے صوبائی گورنروں، فوجی جرنلوں، منصفوں اور وزراء ریاست کی فہرستوں میں مسلمانوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پروٹسٹنٹ عیسائی مشنریوں کی طرح چین کے مسلمانوں کو کھلے طور پر اسلام کی تبلیغ کا حق حاصل نہیں رہا لیکن وہ کسی دور میں بھی اسلام کی تبلیغ سے غافل نہیں رہے۔ چنانچہ رسالہ "مشنری ریویو آف دی ورلڈ" کے بیان کے مطابق "صوبہ کانسو کے شہر ہوچاؤ کی اسلامی درسگاہ میں طلبا کو تبلیغ مذہب کے لئے تعلیم اور تربیت دی جاتی تھی" اور مسٹر ڈی اولون نے لکھا ہے کہ "مسلمان فوجی افسر بھی فوجی سپاہیوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کرتے رہتے ہیں۔"

۱۸۹۶ء میں ایک روسی صاحب قلم وزلیبف نے "چین میں اسلام" کے موضوع پر ایک قابل قدر کتاب لکھی تھی جس میں اُس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "اسلام چینی سلطنت کا قومی مذہب بن جائے گا اور اُس کی بدولت مشرق کی سیاسی صورتِ حال قطعاً بدل جائے گی" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ چین کے مسلمانوں نے کسی دور میں بھی منظم طریقہ پر تبلیغ اسلام کی کوشش نہیں کی اس کے باوجود عیسائی مبلغین ان کی روز افزوں تعداد کو اپنے لئے ہمیشہ خطرہ قرار دیتے رہے اور چونکہ چین میں عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے اور اسی تناسب سے انہیں ریاست اور حکومت میں بھی زیادہ دخل حاصل رہا ہے اور چونکہ وہ مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلاتے رہے ہیں اس لئے انیسویں صدی کے تقریباً وسط سے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان اتنی زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہونے لگی تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کو حکومت کے خلاف صف آرا ہونا پڑا تھا جس کے نتیجہ میں ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۶ء تک مختلف صوبوں میں انہیں قتل عام کا نشانہ بننا پڑا اور اس طرح مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ کم ہو گئی حتیٰ کہ اس صدی کی پہلی دھائی تک عام طور پر چینی مسلمان اپنے مذہب کو چھپانے پر مجبور رہے۔ لیکن جب ۱۹۱۱ء میں

ڈاکٹر سن یت سین کی قیادت میں چین کا پہلا جمہوری انقلاب برپا ہوا اور مانچو خاندان کے زوال کی بدولت چین میں پہلی مرتبہ جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں کو بھی مذہبی اور معاشرتی آزادی حاصل ہوئی لیکن چونکہ اوّل تو یہ جمہوری حکومت پورے ملک پر حاوی نہیں تھی اور دوسرے جمہوری حکومت کے قیام کے بعد ملک باہمی اختلافات اور تضادات کا میدان بن گیا تھا اس لئے مسلمان اپنی اس آزادی سے بہت ہی کم فائدہ اٹھا سکے تھے اور ڈاکٹر سن یت سین کی موت کے بعد چین میں جو حکومت قائم ہوئی تھی وہ عملاً مسلمانوں کی اس آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکی تھی اور ایک مرتبہ پھر مسلمان اسی تاریک دور میں واپس جانے پر مجبور ہو گئے جس میں انہیں اپنے مذہب کو چھپانا پڑا تھا

چین کے پہلے جمہوری انقلاب سے پورے اڑتیس سال کے بعد اس ملک میں جب دوسرا اور مکمل انقلاب برپا ہوا اور وہاں اکتوبر ۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ قائم کی گئی تو مسلمانوں کو ایک بار پھر امن اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ چنانچہ چین کے موجودہ آئین کی دفعہ ۵ میں چین کے شہریوں کی جن آزادیوں کو تسلیم کیا گیا ہے اُن میں مذہب کی آزادی بھی شامل ہے۔ دفعہ ۹ میں چین میں آباد تمام قومیتوں کو اُن کے حقوق اور فرائض کی مساوات کا یقین دلایا گیا ہے۔ دفعہ ۵۰ میں چینی قومیتوں کی مساوات کے اعلان کا اعادہ کرتے ہوئے امتیازی سلوک کو ممنوع قرار دینے کی یقین دہانی کی گئی ہے۔ دفعہ ۵۲ میں چین کی تمام قومیتوں کے لئے قومی فوج میں شمولیت کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور دفعہ ۵۳ میں انہیں اُن کی زبان، رسم الخط، رسم و رواج اور مذہب کو برقرار رکھنے، ترقی دینے اور ان میں اصلاح و ترمیم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ حکومت انہیں اُن کے سیاسی، اقتصادی، تہذیبی، تعلیمی اور تعمیری کاموں میں ہر ممکن مدد دے گی۔

چین میں عوامی جمہوریہ کے قیام کے بعد سے اب تک سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے وہاں کے مسلمانوں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچ رہی ہیں اُن کے پیش نظر پوری احتیاط کے ساتھ رائے قائم کرنے کے بعد بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ چین کے مسلمان اپنے وطن کی آزادی سے پورا اور صحیح فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

چین میں مسلمانوں کے دس قبیلے آباد ہیں اور مسلمانوں کی بیشتر آبادی شمالی مغربی چین کے صوبجات سنکیانگ، کانسو، چنگھائی اور ننگسیا میں ہے لیکن وہ چین کے دوسرے علاقوں اور شہروں میں بھی بستے ہیں اور چونکہ آئین میں ایسے علاقوں کو جہاں کسی قومی اقلیت کی اکثریت ہو داخلی خود مختاری دینے کی ضمانت موجود ہے اس لئے مسلمانوں کے اکثریت والے علاقوں کو بھی داخلی خود مختاری دی گئی ہے اور جو مسلمان دوسرے علاقوں میں آباد ہیں وہاں انہیں اکثریت کے برابر حقوق دیئے گئے ہیں۔

صوبہ سنکیانگ کی جمہوری حکومت کا صدر اور ایک نائب صدر مسلمان ہے، اس صوبہ کی مجلس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہر درجہ کی سرکاری ملازمتوں پر مامور مسلمانوں کی تعداد ۱۴ ہزار ہے اسی قدر نہیں بلکہ اس صوبہ کی ۸۰ اضلاعی مجالس جن میں سے ۷۱ مجالس کے سربراہ مسلمان ہیں۔

کانسو، چنگھائی اور بعض دوسرے ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تو نہیں لیکن کثیر تعداد میں ضرور آباد ہیں، صوبائی حکومتوں کا ایک ایک نائب صدر مسلمان ہوتا ہے۔ انہیں ملازمتوں میں لیا جاتا ہے اور ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو مقامی مجالس میں مناسب حد تک نمائندگی دی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اُن کا خیال رکھا جاتا ہے۔

چین کی مرکزی حکومت ۵۰ ارکین پر مشتمل ہے جنہیں سے دو مسلمان ہیں اور مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں اور محکموں میں بھی بہت سے مسلمان چھوٹے بڑے عہدوں اور کاموں پر مامور ہیں، حکومت مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی اور تہذیبی ترقی پر خصوصیت کیساتھ توجہ کرتی ہے اور اس سلسلہ میں انہیں ہر ممکن مدد دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ مشرق کے اس عظیم ملک میں مسلمان ظہور اسلام کے بعد ہی پہونچ گئے تھے اور اس وقت سے ابتک کسی دور میں بھی چین کی سرزمین مسلمانوں کے وجود سے خالی نہیں رہی، تقریباً چودہ سو سال کی اس طویل مدت میں انہیں زندگی کے بہت سے نشیب و فراز طے کرنے پڑے اور آج پوری چینی قوم کیساتھ وہ بھی ترقی اور تعمیر کے ایک نئے مرحلہ تک پہونچے ہیں اور توقع ہے کہ ماضی کی طرح چینی مسلمانوں کا وجود مستقبل میں بھی اُن کے وطن کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

کہنے کو یوں تو عقدۂ مشکل کہیں جسے
دونوں جہاں کا دل ہے مگر دل کہیں جسے

جلوہ فروشِ حُسن کی منزل کہیں جسے
وہ ہے زبانِ عشق میں ہم دل کہیں جسے

دیکھی نہ آج تک نگہِ شوق نے کہیں
ایسی نمودِ جلوہ کہ باطل کہیں جسے

اُس جنبشِ نفس پہ ہے اب انحصارِ شوق
آہِ شکستہ بھی تو یہ مشکل کہیں جسے

اک موجِ درد بن گئی ہر سوز و ساز میں
گرمیِ دل کہ گرمیِ محفل کہیں جسے

ہستی کا ہر نظام ہے مجبورِ اضطراب
وہ ذرہ کون سا ہے نہ ہم دل کہیں جسے

منزل پہ آکے آپ ہی یہ راز کُھل گیا
منزل کا اک فریب ہے منزل کہیں جسے

وہ بھی ہے ایک جلوۂ در پردہ کی نمود
اہلِ نگاہ پردۂ حائل کہیں جسے

اے ناخدا فریبِ تخیل سے ہوشیار
طوفاں کی ایک موج ہے ساحل کہیں جسے

اب کے تو فیضِ عشق سے آئی ہے وہ بہار
اعجازِ خوں فشانیٔ بسمل کہیں جسے

شامِ فراق کیجئے ایسی کوئی فغاں
گرمیِ سوزِ عشق کا حاصل کہیں جسے

پھر دیکھیے کہ اٹھتی ہیں کتنی قیامتیں
اس کو مٹائیے تو سہی دل کہیں جسے

غربت کی شام تو ہی بتا دے کب آئے گی
ایسی سحر کہ عشرتِ منزل کہیں جسے

دیکھا جو غور سے تو یہ ثابت ہوا مجھے
ناقص وہی ہے سب سے کہ کامل کہیں جسے

زندانِ دو جہاں میں ہے گونجی ہوئی آلم
اک وہ صدا کہ شورِ سلاسل کہیں جسے

تبصرے

تفسیر حقانی سورۂ فاتحہ | تقطیع کلاں۔ ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر
قیمت دو روپیہ پتہ :۔ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند ضلع سہارنپور۔

مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی بلند پایہ عالم اور قرآن مجید کے نامور مفسر تھے اسلامی علوم وفنون کے علاوہ کتب قدیمہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور اُن کا دوسرے مذاہب وادیان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اس بناء پر اُن کی تفسیرِ حقانی اور اُس کا مقدمہ البیان فی علوم القرآن " دونوں کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ ایک زمانہ میں ان کی بڑی شہرت تھی اور گھر گھر چرچا تھا لیکن یہ تفسیر اِدھر عرصہ سے نایاب تھی۔ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند کی یہ کوشش لائق تحسین ہے کہ اس نے تفسیر کو پھر از سرِ نو چھاپنے کا ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۃ فاتحہ کے بعد اب اُردو میں اس سورۃ کی کسی اور تفسیر کا چراغ جلنا مشکل ہے تاہم اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے یہ بھی قابل قدر اور مطالعہ کے لایق ہے۔ پوری تفسیر کی طباعت کا اگر انتظام ہوگیا تو اپنے وقت کی ایک عمدہ تفسیر ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔

تفہیم القرآن | از جناب یعقوب علی صاحب عرفانی الاسدی تقطیع کلاں کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۷۶ صفحات قیمت ؎ پتہ :۔ دفترِ الحکم عیدگاہ روڈ کراچی۔

لائق مؤلف نے قرآن مجید کے حقائق ومعارف پر ایک سلسلۂ تصنیفات شروع کیا ہے باقی حصص ہماری نظر سے نہیں گذرے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی سولھویں کڑی ہے اس میں پہلے قرآن مجید کی جو صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کے آداب یعنی قرات۔ طہارت۔ تلاوت۔ تسمیہ و استعاذہ وغیرہ

پر کلام کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں متشابہات، مقطعات، عرش کی حقیقت، صفات باری کی حقیقت بیان کی گئی ہے اس کے بعد قرآن مجید کے قصص۔ اور اس کے دوسرے مضامین کا تذکرہ ہے چھٹے باب میں تفسیر کے اصول اور اس سلسلہ کے دوسرے مباحث پر کلام ہے۔ آخری باب میں قرآن مجید سے متعلق متفرق مباحث ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن میں تکرار کیوں ہے قرآن کا اسلوب بیان کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء میں کیا فرق ہے اقسام القرآن کا فلسفہ کیا ہے۔ حکمت کسے کہتے ہیں۔ دعا کا فلسفہ کیا ہے۔ اُس کی قبولیت کے لئے کیا شرائط ہیں غرض کہ یہ کتاب قرآن مجید سے متعلق اچھی خاصی معلومات کا مجموعہ ہے۔ مصنف ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں مولانا جلال الدین رومی کی عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کو مجدد عصر اور ان کی کتاب الفوز الکبیر کو "اپنے وقت کی بہترین کتاب تسلیم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مرزا غلام احمد صاحب کو مسیح موعود" بھی کہتے ہیں اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خود انھوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کھلے دماغ کے ساتھ نہیں کیا بہر حال یہ غنیمت ہے کہ اس کتاب میں انھوں نے اپنے مسلک کا نمایاں اظہار نہیں کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس میں اگرچہ کہیں کہیں تفسیر بالرائے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تاہم مجموعی اعتبار سے اس میں بہت سی مفید باتیں بھی ہیں۔

جمالِ کربلا از جناب جمال قریشی احمد آبادی تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۔۔۔ پتہ:۔ حسینی انجمن سوداگری پول جمالپور چکلہ۔ احمد آباد (گجرات)

جمال قریشی صاحب اردو کے نوجوان شاعر ہیں یہ کتاب موصوف کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس میں نعتیہ۔ غزلیہ نظمیں اور سلام یکجا کر دیے گئے ہیں جمال صاحب اگرچہ اب تک آج کل کی مصنوعی شہرت کی زد سے محفوظ ہیں لیکن ان کے کلام کا اٹھان اور اس کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ ان میں ایک بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے کلام میں روانی بھی ہے اور بلا کی خستگی بھی درد اور سوز و گداز بھی ہے اور موسیقی و خوش نغمگی بھی۔ ادبی و شعری

حسن ذوق کے علاوہ موصوف کی یہ نظمیں ان کے ملی اور اسلامی جذبہ و ولولہ کی بھی آئینہ دار ہیں اور شعر و شاعری کی ترکیب و ساخت اور اس کے نشو و نما میں گجرات کا بہت نمایاں حصہ رہا ہے اس لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ گجرات کا علاقہ اب بھی اپنی دیرینہ روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور جمال قریشی ایسے ہونہار نوجوان شاعر اس کی سرزمین سے پیدا ہو رہے ہیں کتاب کے شروع میں جناب اعجاز صاحب صدیقی ایڈیٹر شاعر بمبئی اور حبیب الرحمٰن صاحب غزنوی ایڈیٹر آب حیات احمد آباد کے قلم سے پیش لفظ اور تعارف ہے۔

تنقیدات عبدالحق تقطیع خورد ضخامت ۱۵۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ دو روپیہ چار آنہ پتہ :۔ مکتبہ چنگاری۔ گلی قاسم جان دہلی

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو پاکستان ہماری زبان کے نامور محقق ادیب اور انشاپرداز ہیں رسالہ اردو میں موصوف کے قلم سے وقتاً فوقتاً اُردو کتابوں پر جو تبصرے نکلتے رہے ہیں وہ بھی تنقید اور تبصرہ نگاری کے اعتبار سے اپنی ایک مستقل افادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں موصوف کے اسی قسم کے ستائیس تبصرے یک جا کر کے شائع کردئے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے بعض کار آمد ادبی معلومات بھی حاصل ہوں گی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ تبصرہ نگاری کے لئے انداز بیان اور اسلوب ادا کس قدر سنجیدہ اور رچا تلا ہونا چاہئے اور نیز یہ کہ تبصرہ نگار کی نگاہ کتاب کے کن کن پہلوؤں پر ہونی چاہئے۔ تاہم یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ تنقیدات عبدالحق کا انتخاب اس سے بہتر بھی ہو سکتا تھا۔ بعض تبصرے مثلاً "روح تنقید" "روح ادب" "الناظر کا انعامی مضمون" "ماوراء" محض بھرتی کے مضامین ہیں ان میں کوئی خاص افادیت نہیں ہے۔

اُردو عربی لغت یہ شہرہ آفاق اُردو عربی لغت مصباح اللغات کے مؤلف کی دوسری کاوش ہے جس میں اردو لفظوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے طلبۃ العلم کی عام ضرورتیں بڑی حد تک پوری ہوجائیں گی اور مدرسوں کے استادوں کو بھی اس سے قیمتی مدد ملے گی صفحات ۴۸۰ قیمت ے ۲